کرشن چندر



باون پتّے

باون پتّے
ایک ناول

باون پتے

کرشن چندر

ایک ناول

مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور

ناشر .... نواز

مطبع .... معظم پرنٹرز لاہور

قیمت .... ۲۷/- روپے

رفعیہ وادر مین روڈ پر دلجیت سٹوڈیو کے قریب ایکسٹرا یونین کے آفس کے باہر بجلی کے کھمبے سے لگی اپنی سہیلی رضیہ سے باتیں کر رہی تھی۔ کہ اتنے میں نوبھارت پروڈکشن کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھٹاچاریہ دوڑا دوڑا اُس کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا "سیٹھ تمہیں بلاتے ہیں" رفعیہ نے ہاتھ ہلا کے گویا پورے معاملے کو اپنے ذہن سے دور دفعان کرتے ہوئے کہا "جاؤ۔ جاؤ تمہارے سیٹھ دس بار بلا کر بھی کام نہیں دیتے۔ میں نہیں آؤں گی ــــــــــــ"

موٹے بھٹاچاریہ کا دوڑتے دوڑتے دم پھول گیا تھا۔ حالانکہ نوبھارت پروڈکشن کا دفتر یہاں سے پچاس ساٹھ گز سے زیادہ دور نہ تھا۔ پھر بھی وہ ہانپ رہا تھا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "نہیں رفعیہ ابھی تھوڑی دیر میں ناچنے والی لڑکیوں کی ٹرائی ہوگی۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔ رات کو شوٹنگ ہے۔ پانچ لڑکیاں موجود ہیں۔ ایک اور چاہیئے۔ تم چلی چلو۔ ورنہ ــــــــــــ"

بھٹا نے رضیہ کی طرف دیکھا۔ رضیہ نے اپنی گولڈ واچ کی طرف دیکھا اور پھر رفعیہ سے سفارش کرتے ہوئے کہا "تو چلی جا۔ میری تو آج اپنے دلدار کے ساتھ جوہو پر اپوائنٹ مینٹ ہے"

"ہاں ہاں" رفعیہ چہک کر بولی "تو جا جوہو پر عیش کرے"

رضیہ نے کہا " تو کبھی عیش کر سکتی ہے۔ کسی کو دلدار بنا لے "
" وہ میرے چھ دلدار گھر پر جو بیٹھے ہیں محمد علی روڈ پر۔ اُن کا کیا کروں گی پھر ؟ دن بھر بیٹ پر ہاتھ رکھے کُتیا کے پلّوں کی طرح چاؤں چاؤں کرتے رہتے ہیں۔ ایک میرا دلدار وہ سیٹھ حاجی یاسین بھائی لوٹر بھائی ہے۔ مالک مکان ! جس کا چار مہینے کا کرایہ مجھے دینا ہے۔ ایک میرا دلدار دھیرو بھائی سیگھانی ہے۔ جس کی دوکان سے میں راشن لاتی ہوں۔ ایک میرا دلدار ریلوے کمپنی کا وہ کلرک ہے جس کے ہاں ہر ماہ مجھے لوکل ٹرین کے پاس کے روپے جمع کرانے پڑتے ہیں۔ ایک میرا دلدار ——— "
بھٹّا چاریہ نے اپنی چپٹی ناک پر اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک ٹھیک کی اور گڑگڑاتے ہوئے بولا " رضیہ بوئی ! " (رضیہ بائی)
" ہاں بھائی ؟ "
" سیٹھ بُلاتا ہے " بھٹّا چاریہ نے بڑی عاجزی سے نوبھارت پروڈکشن کی بلڈنگ کی طرف اشارہ کرکے کہا
" اچھا جی " رضیہ نے بھٹّا چاریہ کی گویا درخواست منظور کرتے ہوئے کہا۔ پھر رضیہ کی طرف مُڑ کے بولی
" کل ملے گی نا بہنا ؟ "
" ہاں " رضیہ نے اپنے سونے کے لاکٹ کو اپنے صاف ستھرے سنہرے رنگ کے سینے پر گھماتے ہوئے کہا۔
" کہاں ؟ "
" یہیں .... چھ بجے شام کو۔ اسی بجلی کے کھمبے کے نیچے "
" بائی۔ بائی "
رضیہ جلدی جلدی نوبھارت پروڈکشن کے دفتر کی طرف چلنے لگی۔ گو بھٹّا چاریہ کا دم پھولا جارہا تھا۔ پھر بھی وہ جلدی جلدی کسی نہ کسی طرح قدم ملائے رضیہ کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور چلتے ہوئے

تقریباً ہاتھ جوڑتے ہوئے گھگھیاتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ رفعیہ بولی۔ تم کہاں فلم میں آگئیں بیٹی ۔ بت ۔۔ سے تم بہت شریف معلوم ہوتی ہو۔ یہ لائن تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ اب اگر آگئی ہو تو ان سندھیوں پنجابیوں، گجراتیوں کے ساتھ کام کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ صرف بنگالی ڈائریکٹروں کے ساتھ کام کرو۔ بنگالی لوگ بڑے کلچرڈ ہوتے ہیں۔ ہمیرا بنگال، ہمیرا ٹیگور، ہمیرا دیوکی بابو، ہمیرا نیو تھیٹرس، یہاں میں نے ستین گھوش سے تمہارا بات کیا ہے۔"

بھٹا چاریہ نے رفعیہ کی طرف اس طرح چمکیلی نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے بچہ اپنے سال گرہ کے کیک کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ اتنے میں نو بھارت پروڈکشن کا دفتر آگیا۔ اور رفعیہ جلدی سے اندر جا کے بڑے ہال میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے پانچ اور لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ غالباً اُس کی طرح ڈانس کی ٹرائی دینے آئی تھیں۔ وہ اُن میں سے تین کو نہیں جانتی تھی۔ دو سے بس علیک سلیک تھی۔ رفعیہ نے ہاتھ اوپر اُٹھا کے اُنہیں آداب کیا۔ اُن دونوں نے سر کی جنبش سے بڑی نخوت سے آداب کا جواب دیا۔ کیونکہ وہ دونوں بے حد خوب صورت تھیں۔ گوری چٹی۔ اچھے لباس۔ اور حسین زیوروں میں سجی سجائی۔ گویا بالکل دُلہن بن کر ڈولی میں بیٹھنے کے لئے تیار۔ اور رفعیہ کی شکل صورت ذرا یوں ہی سی تھی۔ رنگ سانولا۔ آنکھیں بڑی بڑی مگر نیچے حلقے پڑے ہوئے۔ ناک تیکھی۔ مگر ہونٹ موٹے۔ اوپر کے دانت ذرا ٹیڑھے میڑھے۔ قد نہ چھوٹا نہ لمبا۔ مگر چہرے سے نیچے جسم بے حد متناسب تھا۔ سینہ، کمر، کولہے، رانیں، پنڈلیاں۔ اک منجھی ہوئی۔ مشاق ناچنے والی کی متوازن کیفیت لئے ہوئے۔ رفعیہ جب سٹوڈیو کے فرش پر ناچتی تھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا جھیل کی سطح پر کوئی کنول رقص کر رہا ہے۔ مگر بمبئی میں نو وارد تھی اس لئے کام ذرا مشکل سے ملتا تھا۔

رفعیہ نے ہال کی دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔ اُسے یہاں آئے ہوئے پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ اور ابھی تک ڈائریکٹر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اُس نے نظر گھما کر ہال کے اندر دروازے

کی طرف دیکھا۔ جو پلائی وڈ اور دودھیا رنگ کے کانچ کے امتزاج سے بنا ہوا تھا۔ دودھیا رنگ کے کانچ پر ایک ننگی عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے کانچ ہی کی سطح پر اُبھرے ہوئے الفاظ میں لکھا تھا "نوبھارت پروڈکشن" اتنے میں پلائی وڈ کا دروازہ کھُلا۔ اور بھٹا چاریہ ایک لمبے قد کے گنجے اور گندمی رنگ کے آدمی کو جس نے ایک سفید پتلون اور بوسکی کی قمیص پہن رکھی تھی اپنے ساتھ لے کر ہال میں آیا۔ اندر آ کے اس نے رفعیہ کی طرف اِشارہ کیا رفعیہ نے اُٹھ کے آداب کیا۔ لمبے گنجے آدمی نے اپنی نیلے کی سی چھوٹی مگر نہایت تیز آنکھوں سے رفعیہ کو دُور سے بھانپا۔ پھر وہ اس کے قریب چلا گیا۔ اور اس کے گرد ایسے گھوم گیا۔ جیسے کسی بُت کے گرد گھوم رہا ہو۔ اس نے چہرہ، سینہ، کمر، کولہے سب کا اندازہ کر لیا۔ پھر اُس نے بھٹا چاریہ کی طرف دیکھ کر کہا "ہوں" اس کے بعد پلائی وڈ کا دروازہ دیر تک رفعیہ کے دِل کی طرح لرزتا رہا۔ کیونکہ یہ شخص فلم ڈائریکٹر جوشی تھا۔ جس کی تصویر میں رفعیہ کو کام ملنے والا تھا۔

رفعیہ نے بھٹا چاریہ سے پوچھا "اس ہوں کا کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ تم پاس ہو" بھٹا چاریہ نے جواب دیا۔

"مگر ڈانس کی بڑائی تو لی نہیں۔ ساڑھے چھ تو اب ہو گئے" رفعیہ نے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے گھر جانا ہو گا اور گھر جا کے کھانا تیار کرنا ہو گا۔ کیونکہ اماں بیمار ہیں۔ اگر میں پاس ہوں تو ان سے پوچھ کے ـــــــ" رفعیہ نے پلائی وڈ کے دروازے کے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے بتا دو۔ میں وقت پر شوٹنگ میں آ جاؤں گی۔ جوشی جی سے پوچھ لو"

بھٹا چاریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور اندر پوچھنے کے لئے چلا گیا۔ اُلٹے پیروں لوٹ آیا بولا "ڈانس کی ٹرائی ہو گی پھر فیصلہ ہو گا"

"کب ٹرائی ہو گی" ایک پنجابی لڑکی نے اپنے رخسار پر بڑے ٹھسے سے انگلی رکھ کر کہا "ہم تو یہاں بج دبجے سے بیٹھی ہیں۔ آں تو تم کب ٹرائی لو گے۔ ہم کو کوئی کام وام نہیں ہے اور ؟"

"آں؟ بھلا؟"
پنجابی لڑکی کو بڑا غصہ آ رہا تھا۔
بھٹاچاریہ نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "ابھی ہو گی۔ سیٹھ کا انتظار ہے" "سیٹھ تو اندر بیٹھے ہیں۔ ایک اور لڑکی نے چمک کر کہا۔ "میں جب آئی تھی تو اُن کو اندر جاتے دیکھا تھا۔ مجھ کو کیا بناتے ہو۔ دس سال سے فلم انڈسٹری میں کام کر رہی ہوں سیٹھ بتیال بھائی کو میں نہیں جانتی کیا؟"

بھٹاچاریہ نے اور بھی دھیرے سے دھیمے سروں میں اُن سب سے کہا۔ "وہ تو کمپنی کے مالک ہیں نا سیٹھ بتیال بھائی بانکڑیا۔ مگر یہاں اس وقت ایک دوسرے سیٹھ کا انتظار ہے۔ سیٹھ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کا ..."

"یہاں کون کس کا سیٹھ ہے کچھ پتہ نہیں چلتا"۔ دس سال سے فلم میں کام کرنے والی لڑکی بڑی آزردگی سے بولی۔ اور بھٹاچاریہ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔

بھٹاچاریہ نے بالکل بے بس ہو کر کہا "بس ابھی آتے ہوں گے۔ اُن کا ٹیلی فون آیا تھا۔ ابھی آدھ گھنٹے میں آجائیں گے۔ ٹرائی ہو جائے گی"

"ٹریائی وا بچہ" وہ پنجابی لڑکی بھٹاچاریہ کے اندر جانے کے بعد بولی "ساہڈا امرتسر ہوتا۔ تو اس کی ٹانگیں چیر دیتی۔ پنج وجے دا بُلا کے بٹھایا ہویا۔ اِس سور دے پُتر نے!"

رفعیہ کو اس کی باتیں سُن کر مزا آ گیا۔ اچھا تو یہ بے چاریاں پانچ بجے سے ڈانس کی ٹرائی کے لئے بیٹھی ہیں! رفعیہ نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا کہ وہ ابھی آئی ہے۔ ورنہ اُسے بھی اتنا طویل اِنتظار کرنا پڑتا۔ اتنے میں یلائی وڈ کے دروازے کے اندر سے ایک زور کا قہقہہ سُنائی دیا۔ اور سب لڑکیوں کی نظریں ایک لمحے کے لئے دروازے پر جا کر جم گئیں

پلائی وڈ اور کانچ کا دروازہ ایک پلائی وڈ کیبن کے اندر کھلتا تھا۔ یہ دروازہ اس کیبن میں کچھ اس طرح سے فِٹ تھا کہ ہال میں بیٹھنے والے کو اس کیبن میں بیٹھنے والے کا صرف دھڑ نظر آسکتا تھا۔ اور اس دروازے سے اوپر جھانکنے والے کو صرف دھڑ سے اوپر کا حِصّہ نظر آسکتا تھا یعنی یہ دروازہ اس کیبن کے وسط میں اوپر سے اور نیچے سے دونوں طرف سے کھُلا تھا تاکہ پلائی وڈ کم خرچ ہو۔ گویا یہ دروازہ نہ تھا۔ لکڑی کا ایک نیکر تھا۔ جوہو کے ساحل پر نہانے والی حسینہ کے لئے تیراکی کا لباس تھا جس میں نظر زیادہ آتا ہے۔ اور چھپایا کم جاتا ہے۔

رفعیہ جو ہال میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ پلائی وڈ کیبن میں ایک میز کے نیچے بہت سی اُگھتی ٹانگوں کا اجتماع دیکھ رہی تھی۔ بھٹاچاریہ جو کیبن کے اندر دروازے سے لگا کھڑا تھا وہ ان ٹانگوں سے اوپر کے انسانی جِسم دیکھ رہا تھا جو اُس وقت بظاہر رمی ایسے دل چسپ کھیل میں مصروف نظر آتے تھے۔ مگر بھٹاچاریہ جانتا تھا کہ اُن میں سے ہر شخص کے کان ایک کونے میں پڑے ہوئے ٹیلی فون پر لگے ہوئے ہیں۔ جہاں ابھی ابھی سیٹھ بھگت لال کا کال آیا تھا۔ بھٹاچاریہ نے رمی کھیلنے والوں پر نظر دوڑائی۔ اُن میں سب سے نمایاں فلم کے پروڈیوسر سیٹھ بتیاں بھائی بانکڑیا تھے۔ اونچا قد۔ فربہ اندام سر کے بال بالکل سفید۔ گوری چِٹّی رنگت پر بشاشت کھیلتی ہوئی۔ ہاتھوں میں ہیرے کی تین انگوٹھیاں

پہنے ہوئے سب سے کم متفکر دکھائی دیتے تھے۔ سیٹھ بیتال بھائی نے جنگ کے زمانے میں فلموں کے لائسنس کی بلیک مارکیٹ کی تھی، ان دنوں فلم کے ایک لائسنس کے عوض بلیک مارکیٹ سے لاکھ سوا لاکھ روپیہ مل جاتا تھا، بس گورنمنٹ آف انڈیا سے فلم بنانے کا ایک لائسنس لے آئیے اور اُسے بلیک مارکیٹ میں بیچ دیجئے گھر بیٹھے سوا لاکھ روپیہ مل جائے گا۔

سیٹھ بیتال بھائی بانکریا اب تک کوئی پچیس فلمیں بنا چکے تھے۔ جنگ سے پہلے ہر ماہ تقریباً ایک فلم تیار کر لیتے تھے۔ بارہ لائسنس یوں ہی آگئے۔ پھر اُن کے پاس تین سٹوڈیو تھے۔ چار چار پکچروں کے لائسنس اُن سٹوڈیو کے حصے میں بھی آئے۔ بارہ لائسنس یہ ہو گئے۔ چوبیس لائسنس اگر وہ بازار میں بیچتے تو ہر سال مزے میں بیٹھے بٹھائے تیس لاکھ کی آمدنی ہو جاتی۔ مگر سیٹھ اتنے لالچی نہ تھے۔ انہیں قوم کا بھی خیال تھا۔ تین سٹوڈیو میں جو لوگ کام کر رہے تھے ان کی بیوی بچوں کا بھی خیال تھا۔ اس لئے وہ سال میں صرف بارہ لائسنس کالے بازار میں بیچتے تھے اور بارہ کی تصویریں بناتے تھے۔ اُن سے جو منافع ہوتا تھا۔ وہ اس کی ایک پائی فلم میں نہیں لگاتے تھے۔ بلکہ اس سے زمین خریدتے تھے۔ مکان، بڑی بڑی بلڈنگیں۔ ٹاٹا فولاد کے حصے۔ روئی کے مل کی ایجنسی۔ شکر کی مل کی پارٹنر شپ غرضکہ جہاں سرمایہ زیادہ محفوظ سمجھتے۔ وہاں اپنا منافع لگاتے تھے۔ اور یہ بات انہیں اُن کی میڈم سمجھاتی تھیں۔ میڈم اُن کی بیوی نہ تھی۔ اُن کی بیوی تو کالبا دیوی روڈ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنے پانچ بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میڈم اُن کی داشتہ تھی۔ ان کی جان۔ اُن کی ڈارلنگ۔ اور جب سے میڈم نے اُن کے کاروبار میں دلچسپی لینا شروع کی تھی، میڈم اُن کی عقل بھی تھی۔ سیٹھ بیتال بھائی بانکریا اب اپنی عقل کا استعمال صرف خاص موقعوں پر کرتے تھے۔ کیونکہ سرمائے کے حصوں میں عقل ایک اس حد تک کام کرتی ہے۔ ایک خاص حد کے بعد جب سرمایہ بڑھ جاتا ہے۔ تو پھر خود بخود بڑھتا ہی رہے۔ پھر عقل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پھر سرمایہ اور منافع کی اپنی عقل ہوتی ہے۔ جو خود بخود ایک

کلدار مشین کی طرح کام کرتی رہتی ہے۔

سیٹھ بتیال بھائی بانکڑیہ کا سرمایہ جب پچاس لاکھ سے تجاوز کر گیا۔ تو انہوں نے بھی سرمایہ کی اس خود روعقل سے کام لینا شروع کیا۔ اتنا بڑا سرمایہ برف کے گولے کی طرح ہوتا ہے۔ جوں جوں اُسے گھماتے جایئے۔ یہ خود بخود برف کے گولے کی طرح بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اور اپنے گرد اور روپیہ سمیٹتا جاتا ہے۔

سیٹھ بتیال بھائی بانکڑیا نے روپے کو منافع کی اس بڑی منزل پر پہنچا کر خود ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اور کاروبار زیادہ تر میڈم کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ خود اس وقت نہایت شگفتگی اور زندہ دلی سے بیٹھے ہوئے رمی میں ہار رہے تھے۔ اور میڈم کا انتظار کر رہے تھے۔ جولالہ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کو لانے کے لئے گئی ہوئی تھی بیچارے کی نگاہ میڈم کی کرسی پر گئی جہاں اس وقت بانکڑیا سیٹھ کا نیا فلم ڈائرکٹر اکرم میز پر اکڑوں بیٹھا ایک مشعل سے اُداس انداز میں رمی کھیل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے مترشح ہوتا تھا۔ جیسے اُسے اس کھیل میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صرف وقت کاٹنے کے لئے یہاں بیٹھا ہے اور یہ صحیح بھی تھا اکرم کا دل اس وقت تاش کے پتّوں میں نہ تھا۔ وہ بھی لالہ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کی آمد کا منتظر تھا۔ کیونکہ سیٹھ بتیال بھائی بانکڑیا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ لالہ بھگت لال کے آتے ہی وہ اُسے اس کی نئی پکچر کے لئے جو اکرم سیٹھ صاحب کے لئے شروع کر رہا تھا ایک ہزار روپیہ دے دیگا۔ اکرم کو سیٹھ بتیال بھائی نے ایک قومی فلم بنانے کے لئے نوکر رکھا تھا۔ کیونکہ اکرم فلمی حلقوں میں سوشلسٹ سمجھا جاتا تھا۔ وہ دراصل فلم انڈسٹری میں ہیرو بننے کے لئے آیا تھا۔ میانہ قد، خوب صورت کتابی چہرہ، فراخ ماتھا گھنگھریالے بال۔ اُسے کسی بھی فلم کا ہیرو بنا دینے کے لئے کافی تھے۔ فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے وہ اُردو تاریخ میں بھی ایک مستند حیثیت کا مالک تھا۔ اس لئے جب وہ فلم انڈسٹری میں آیا۔ تو شروع شروع میں اس کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ وہ دو فلموں کا یکے بعد دیگرے ہیرو بھی بنا۔ مگر اداکاری اُسے راس نہ آئی۔ رنگ

جس قسم کی فلاخوذی اداکاری کی ضرورت تھی۔ وہ اس سے ہو نہیں سکی۔ اور جس قسم کی فطری اداکاری وہ پسند کرتا تھا اُسے یہاں کے فلم ڈائریکٹر گھاس سمجھتے تھے۔ پھر اداکاری چھوڑ کر اس نے گیت لکھے مکالمے لکھے۔ کہانیاں لکھیں۔ تین چار فلمیں بھی ڈائریکٹ کر ڈالیں۔ مگر ان فلموں میں دِقّت مصیبت تھی۔ یہ فلمیں عام راستوں سے اس قدر ہٹی ہوتی تھیں ان میں گانے نہ تھے۔ ناچ تو بالکل نہیں تھے۔ وہ ہاؤ ہو والی کامیڈی بھی نہ تھیں۔ ان فلموں میں کوئی مسخرا اپنی توند ہلا کے ہنساتا نہ تھا۔ نہ کوئی ظریف ہٹلر کی سی مونچھیں لگائے آدھی اُردو آدھی انگریزی بولتا تھا۔ ان فلموں کا ماحول ایسا ڈیل اور گھینچو جیسے ہندوستان میں رہنے والے کروڑوں کسانوں اور غریب مزدوروں کا ہوتا ہے۔ کردار ایسے غیر شاعرانہ، موضوع اس قدر روزمرّہ کی تکلیفوں اور صعوبتوں کے ساتھ بندھا ہوا کہ فلم دیکھنے والے تو دو ہی دن میں چکرا گئے اور تصویریں فیل ہو گئیں۔ اور وہ جو خوب صورت تھا، حسین تھا۔ جو اپنے وطن سے اپالو کا سا جسم۔ یوسف کا سا حُسن اور غالب کی سی نظر لایا تھا۔ جنگ کے آخری چار سالوں میں پچک کے رہ گیا۔

اس وقت اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی پتلون پر میل کے چکتے تھے۔ اور دُور سے نظر نہ آنے والے ٹانکے تھے جنہیں اس کی دردمند بہن نے بڑی محنت سے سیا تھا سیٹھ بیتال بھائی بانکیرا یا کچھ ایسا سوچ رہے تھے گویا جنگ کے بعد قومی موضوعات کا زمانہ آئے گا۔ اس لئے انہوں نے پہلے ہی سے سوچ سمجھ کے اکرم کو اپنے ہاں دو سال کے کنٹریکٹ پر رکھ لیا۔ مگر اب وہ اکرم کی پکچر شروع کرنے میں بہت ہچکچا رہے تھے۔ جانے چلے نہ چلے۔ اس ملک میں جہاں دو آنے کے منافع کے لئے افراد اپنے ملک سے غداری کر جاتے ہیں! جانے اس ملک میں قومی موضوع کو لیتے ہوئے کوئی پکچر چلے گی بھی کہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کہ اُن کا حشر بھی اُن تصویروں کی طرح ہو گا جو اکرم نے اس سے پہلے بنائی تھیں سیٹھ چھ ماہ سے کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ اکرم کی پکچر شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور اکرم پریشان تھا گو اس کے پاس دو سال کا کنٹریکٹ تھا۔ لیکن جس ڈائریکٹر کے پاس پکچر نہ ہو اس کے کنٹریکٹ کی

کیا حیثیت ہوتی ہے۔ یہ اکرم اب ان چار سالوں میں خوب سمجھ چکا تھا۔ دیکھئے آج قسمت کیا رنگ لاتی ہے۔ آج سیٹھ نے اس کی پکچر شروع کرنے کے لئے اس سے ایک ہزار کے چیک کا وعدہ تو کیا ہے۔

بھٹا چاریہ خوب جانتا تھا کہ اکرم کے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے۔ مگر اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے اپنے فلم ڈائرکٹر شری جوشی جی بھی اسی چیک کے انتظار میں بیٹھے ہوئے رمی کھیل رہے تھے۔ جوشی جی بڑے منجھے ہوئے فلم ڈائرکٹر تھے۔ اُن کی فلم ڈھولکی، ڈالی، ڈم ڈم، اور ڈڈاں ڈڈاں ڈاں عوام میں بے حد مقبول ہوئی تھیں۔ جوشی جی کی ہر فلم ڈاں سے شروع ہوئی تھی، اور وہ اپنی فلموں میں عورت کے جسم کی نمائش کے بے حد قائل تھے۔ عورت کے بال، عورت کی آنکھیں، عورت کا سینہ، عورت کے بازو، اس کے کولھے، رانیں، پنڈلیاں ہر چیز کی نمائش کرنے کے قائل تھے۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا، ورنہ وہ عورت کو بالکل ننگا کر کے فلم میں لے آتے "کیا کروں سیٹھ؟" جوشی جی نے رُمّی اٹھا کر رنگ لگاتے ہوئے کہا "سنسر کی قینچی سے ڈر لگتا ہے۔ ورنہ ایسی پکچر بناؤں کہ قیامت تک نہ اُترے!"

سیٹھ جتیال بھائی نے اس کی ایک چُٹکی لیتے ہوئے کہا "مگر جوشی جی تم نے اپنی نئی پکچر کا نام کیا سوچا ہے"

"نام، نام؟" جوشی جی نے میز پر زور سے مُکّہ مار کے کہا "ارے نام، ارے سیٹھ وہ ڈمفو نام لوں گا، وہ ڈمفو نام لوں گا" پھر یکایک رُک کر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کے بولے "ارے سیٹھ یہ ڈمفو نام خود کیسا ہے؟ ڈھولکی، ڈالی، ڈم ڈم، ڈڈاں ڈڈاں ڈاں اور ڈمفو!"

"ڈمفو کا مطلب کیا ہے؟" اکرم نے ذرا اک تیز قسم کی آزردگی سے پوچھا جس میں تھوڑی سی حقارت بھی شامل تھی "یہ ڈمفو کس زبان کا لفظ ہے؟"

"کسی زبان کا بھی ہو اپنے کو اس سے کیا ہے ـــــــ" جوشی جی گرج کے بولے "مگر اچھا لگتا ہے

کہ نہیں۔ بولتے وقت منہ بھرتا ہے کہ نہیں۔ ڈمفو! ذرا بول کے دیکھو۔ ایسا سالا معلوم ہوتا ہے کسی نے منہ میں غبارہ رکھ دیا۔ ڈمفو!!!"

"واہ واہ میرے یار!"

جوشی جی نے خود اپنی پیٹھ کو تھپکی دی۔

بھٹاچاریہ زور سے بولا "واہ! واہ! جوشی جی کیا نام سوجھا ہے۔ ڈم فُو ایک دم نیا۔ ایک دم اوریجنل ایک دم بنگالی!"

میز پر ڈانس ڈائریکٹر بابولال بھی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا اور کنپٹیوں پر لانبی لانبی قلمیں بڑھا رکھی تھیں۔ اس کا چہرہ ایک ایسے خارش زدہ کتے کی طرح لمبوترا اور پچکا ہوا تھا جسے غالباً چھ مہینے سے کبھی پیٹ بھر کے کھانا نہ ملا ہو۔ مگر یہ بات نہیں تھی۔ بابولال فلمی صنعت کے رقاصوں میں سب سے عمدہ اور بڑھیا رقاص مانا جاتا تھا۔ وہ ایک عمدہ فلیٹ میں رہتا تھا۔ ایک عمدہ کار میں گھومتا تھا۔ ایک عمدہ چھوکری کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کاریں اور عورتیں بدلنے میں اُسے ید طولےٰ حاصل تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا۔ کہ وہ دنیا کی ہر قوم کی عورت چکھ چکا ہے۔ اور خفیہ امراض میں سے کوئی ایسا مرض نہیں جو اسے لاحق نہ ہوا ہو۔ اس کا چہرہ انہیں امراض کا جیتا جاگتا تمغہ تھا "ڈمفو!" پھر وہ بھی اچھل پڑا۔ اور جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا۔

ڈم فو۔ ڈم فو

بم فو۔ بم فو

گھم گھما گھم۔ گھم گھما گھم

ڈم فو!!!

تالی سے ترتیبہ کا بھاؤ بتا کے اس نے کہا "ایسی اسپینی ٹینگو کی دھن اس پر دوں گا۔ کہ سالا بابی ڈنڈ کا

نے ریٹر گوگڑ کے رہ جائے۔ سیٹھ ڈم فو بہت عمدہ نام ہے۔"

اب میز پر صرف ایک آدمی خاموش تھا بجن دتّ موسیقار یعنی میوزک ڈائریکٹر۔ بجن دتّ کی ذہین آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ اور اکرم جانتا تھا کہ اسے یہ نام پسند نہیں ہے۔ بجن دتّ ہندوستانی فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے اپنی قومی موسیقی کے بہترین ماہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے گاؤں گاؤں گھوم کے کوئی دو ہزار سے زیادہ لوک گیت اور سینکڑوں دھنیں جمع کی تھیں وہ جب فلم انڈسٹری میں آیا تھا تو اکرم کی طرح ایک آدرش۔ ایک خواب۔ ایک قومی فلسفہ۔ ایک سماجی مقصد۔ ایک نیا زاویۂ نگاہ لے کے آیا تھا۔ بیس تصویروں کی موسیقی مرتب کرنے کے بعد مس اس کے دل کی چنگاری روشن تھی۔ مگر چاندی کے ڈھیروں تلے دبی تھی۔ کیونکہ اس نے کامیابی کے لئے لوک دھنوں میں فحش اور بازاری گیت باندھے تھے۔ وہ دھنیں جن میں اس کے ملک کے کسانوں نے گندم کی فصل بوئی تھی۔ دھان کے خوشے لہرائے تھے وہ دھنیں جو کنواریوں کے ترنجن۔ دلہن کی ڈولی اور ماں کی لوری کے لئے وقف تھے۔ آج قصابوں کی طرح کوٹھوں کا گوشت۔ کمر کا خم اور پنڈلیوں کی گاؤ دی بیچ رہے تھے۔

بجن دتّ کو معلوم ہو تا تھا کہ فلم انڈسٹری میں نہیں کسی بوچڑ خانے میں آگھسا ہے۔ گر یہاں اُسے قومی موسیقی کو ذبح کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے مل رہے تھے اور فلم کے باہر کوئی اُسے پانسو دینے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے بہت عرصہ ہوا بجن دتّ نے سوچ سمجھ کے آنکھ بند کرلی۔ اپنے دماغ کو تالا لگا دیا اپنے سماجی مقصد کو منوں گہری چاندی کی بھبوت میں چھپا دیا۔ اور خود ہاتھ میں ہارمونیم کا خنجر لے کر اُن لوک دھنوں کو ذبح کرنے بیٹھ گیا۔ جنہیں اس نے اپنی جوانی کے بہترین ایام میں اس کاوش سے اکٹھا کیا تھا۔"

بجن دتّ نے وسکی کا ایک بہت بڑا پیگ ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل لیا۔ اور آنکھیں نیچی کر کے بولا کیونکہ اکرم اُس کی طرف دیکھ رہا تھا "سیٹھ سارا پیسے (بہت عمدہ ہے) چلے گا!"

سیٹھ بیتال بھائی بانکڑیا نے خوش ہو کر جوشی جی کی طرف دیکھا۔ پھر پشپا چاریہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "پشپا کل پبلسٹی منیجر سے کہہ دے کہ وہ جوشی کی نئی فلم ڈم فو کا اشتہار دے دے فلم نیوز میں پورا صفحہ بک کر دے"

اکرم نے شرم سے سر جھکا لیا۔ کیا وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ کہیں بھاگ کے نہیں جا سکتا کیا وہ اینٹیں نہیں ڈھو سکتا۔ کیا وہ قلی گیری نہیں کر سکتا۔ کیا وہ روئی کی مل میں مزدوری نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ڈک پر جہازیوں کا کام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ——— یکایک اکرم نے محسوس کیا کہ وہ ان میں سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ وہ یکایک ایڑیاں رگڑ کے خاموش ہو گیا۔ اور ایک پتہ اٹھانے لگا۔ جو کر اجو کر تھا۔ جو اسی پر ہنس رہا تھا۔ تاش کا پتہ۔ زندگی کے ایک طنزیہ لمحے کی طرح اس پر ہنس رہا تھا۔ یکایک کرم نے تاش میز پر پھینک دی۔ اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سیٹھ بیتال بھائی گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اکرم نے کہا "کچھ نہیں سیٹھ۔ سر میں درد ہو رہا ہے" اکرم یہ کہہ کر کیبن کے اس طرف کی کھڑکی میں چلا گیا۔ جو باہر بازار کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی میں سے وہ بازار کا ناکہ دیکھ سکتا تھا۔ ایرانی کی دوکان فلم ایکسٹراؤں سے بھری پڑی تھی۔ پان والے کی دوکان پر تین نخرے کھڑے پان کھا رہے تھے۔ اور چند بے فکرے ان کے گرد کھڑے ہنس رہے تھے۔ سڑک کے پار پرانی موٹروں کے پرزے بیچنے والا بچن سنگھ اپنی کھاٹ پر بیٹھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ٹیلی فون کے کھمبے کی تاروں پر کوے بیٹھے تھے اُن سے اوپر آسمان بے حد گدلا اور کثیف تھا۔ اور اُس آسمان کی دھندلی اور بدبودار سی فضا میں ایک پیلا بدنما دھبوں والا چاند ایک جلی ہوئی روٹی کی طرح نظر آ رہا تھا۔

اکرم نے زور سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ وہ جائے تو کہاں جائے۔ کھڑکی سے واپس چلا آیا بیتال بھائی نے اس کے گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تمہارا گلاس اسی طرح بھرا پڑا ہے"

اکرم پھر کرسی پر بیٹھ کر وسکی پینے لگا۔ وسکی ہر تلخ! زندگی کی طرح۔ ناکامی کی طرح۔ اس کے گھٹے ہوئے کرب کی طرح۔ ایچی فلم کے خالی ہال کی طرح۔ محبوب کے آخری انکار کی طرح۔ موت کے جابر لمحے کی طرح۔ کیا

اتنی ساری تلخیوں سے وسکی کا ایک گھونٹ ہوتا ہے؟ مگر لوگ تو کہتے ہیں اس میں نشہ ہوتا ہے۔ آج نشہ کہاں ہے؟

جھنجھلا کے اکرم اُٹھ کھڑا ہوا۔ عین اُسی وقت پلائی وڈ کے دروازے کی ننگی عورت اپنی جگہ سے ہلی۔ قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ دروازہ کھلا اور سیٹھ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کچھ اس تزک و احتشام سے داخل ہوا کہ لوگ اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔

سیٹھ بھگت لال کا چہرہ اس قدر گول تھا۔ گویا معلوم ہوتا تھا کسی نے پرکار رکھ کر دائرہ کھینچ دیا ہے۔ اُس کے چہرے کے نیچے کا حصہ یعنی سینہ، کمر اور پیٹ بھی موٹاپے کی وجہ سے اس قدر گول تھے کہ اس کے چہرے اور پیٹ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا کسی نے بڑے دائرے کے اوپر ایک چھوٹا دائرہ رکھ دیا ہے۔ اگر سیٹھ بھگت لال جیومیٹری کی اشکال کا ہی مجموعہ ہوتے تو خیریت تھی۔ مگر وہ تو اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھے۔ وہ شمالی ہند کے سب سے بڑے ڈسٹری بیوٹر تھے۔ تن و توش ہی میں نہیں دولت کی فراوانی کے اعتبار سے بھی وہ سب سے بڑے تھے۔ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ سال میں چار بار بمبئی آتے تھے اور جب آتے تھے تو پروڈیوسر لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح اُن سے چمٹ جاتے تھے۔ اس وقت بھی جب وہ اندر آئے تو دو چار مصاحبوں کو ساتھ لے آئے۔ ایک تو اُن میں سے جو ناٹا سا۔ دُبلے قد اور بلّی کی سی آنکھوں والا آدمی تھا۔ وہ تو فتح چند تھا۔ امرت سر کا ایک اگزیبیٹر تھا۔ امرتسر کا سب سے عمدہ سینما گھر اس کا تھا۔ دوسرا وہ جو کالے رنگ کا، اونچے دانتوں والا۔ نہایت ہی سیاہ بالوں والا۔ جن پر اس نے بہت زیادہ تیل چپڑ رکھا تھا۔ وہ مورگھڑے تھا۔ چور گھڑے کے دو سینما تو احمد آباد میں تھے۔ ایک ناسک میں۔ اور ایک راج کوٹ میں تھا۔ چور گھڑے گجرات کا مشہور اگزیبیٹر۔ چور گھڑے کے ساتھ ایک دُبلا پتلا دھوتی پہنے ہوئے مارواڑی تھا۔ بھٹا نے اُسے پہچان لیا۔ یہ سیٹھ امر چند تھے۔ جے پور میں اُن کے تین سینما تھے۔ اس کے علاوہ وہ کالی مرچوں کا بیوپار بھی کرتے تھے۔ یہ بھٹا کو اس لئے

معلوم تھا کہ سیٹھ امر چند نے ایک دفعہ اس کے ساتھ وسکی پیتے ہوئے خود بتایا تھا۔ کہ جب انہیں کالی مرچوں کے بیوپار میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے تو وہ اچھی پکچریں حاصل کر کے اپنے سینما گھروں میں چلاتے ہیں۔ اور جب نقصان ہوتا ہے یا کم فائدہ ہوتا ہے تو سٹنٹ یا دیوی دیوتاؤں کے قصوں والی تصویریں حاصل کرتے ہیں۔ اگر آج وہ جوشی جی کی پکچر لینے آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے، بیتال نے سوچا کہ اُن کا کالی مرچوں والا بیوپار اچھا چل رہا ہے۔ اور اگر وہ اکرم کی تصویر لے کے جاتے ہیں تو سمجھو کہ کالی مرچوں کے بیوپار میں مندا ہے!

اس چھوٹے سے کیبن میں اتنی کرسیاں نہ تھیں کہ سب لوگ وہاں بیٹھ سکتے۔ گو سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے پھر بھی سیٹھ بھگت لال نے یہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بیتال بھائی بانگڑ کو لیکر ساتھ والے کیبن میں چلے گئے۔ جو میڈم کا کیبن تھا۔ میڈم کے کیبن میں جاتے ہی بیتال بھائی کو میڈم کی یاد آئی۔ بولے "میڈم کہاں ہیں؟" سیٹھ بھگت لال نے مسکرا کے کہا " وہ تو اپنی سہیلی راج لتا کے ہاں گئیں ہیں۔ مجھ سے کہا۔ آپ انہیں وہاں ٹیلی فون کر دیں۔ اگر کوئی کام ہو"

بیتال بھائی نے پوچھا " چیک ؟"

" ابھی دیتا ہوں " یہ کہہ کر سیٹھ بھگت لال نے چور گھڑے کو اندر بلایا۔ ایک لمحہ بیتال بھائی کی طرف دیکھا پھر چور گھڑے کو یہ کہ کر " ایک منٹ کے لئے معاف کرنا " کہہ کر وہ چور گھڑے کو لے کر سب سے اندر کے کیبن میں چلے گئے۔ جو میڈم کے کیبن سے ملحق تھا جس میں سیٹھ بیتال بھائی خود بیٹھے تھے۔ اندر جا کے بھگت لال نے چور گھڑے سے کہا " ارے یار مجھے یہاں آکے یاد آیا۔ بیتال بھائی کو ایک ہزار روپیہ دینا ہے نقد، تم اُس رقم میں سے دے دو "

چور گھڑے بولا " جوشی جی کی تصویر پر دوں گا "

" اچھا۔ اچھا" بھگت لال بے صبری سے بولے۔

چور گھڑے پہلے ہی سے جیب میں ایک ہزار کی رقم لے کے آیا تھا۔ وہ یہ سب باتیں

خوب جانتا تھا۔ کہ کیسے بات ہوگی۔ اُس نے آہستہ سے نوسو کے نو نوٹ گن کے بھگت لال کو دیئے اور دس کے پانچ نوٹ گن کے دیئے۔

بھگت لال نے کہا " یہ تو کُل نوسو پچاس ہوئے "

"پچاس دھکی کے لئے رکھ لئے" چور گھڑے نے مسکرا کے کہا " نہیں یو گے کیا۔ ابھی تو رات جوان ہے اور ہاں " یہ کہہ کر چور گھڑے نے فوراً جیب سے ہزار روپے کی ٹائپ شدہ رسید نکالی۔ اور فونٹین پین بھگت لال کے آگے بڑھا دیا۔ بھگت لال نے ایک ہزار کی رسید پر دستخط کر دئے اور نوسو پچاس کے نوٹ اپنی جیب میں ڈال لئے۔ اس کے بعد اس نے چور گھڑے سے کہا " ذرا باہر جا کے بیتال بھائی کو یہاں بھیج دو "

بیتال بھائی اندر آیا۔ سیٹھ بھگت لال نے اُسے ساڑھے آٹھ سو روپے دیئے۔

بیتال بھائی نے نوٹ گن کے کہا " مگر یہ تو ساڑھے آٹھ سو ہی ہیں۔ سیٹھ۔ تم نے تو ایک ہزار ــــ "

سیٹھ بھگت لال نے بات کاٹ کے فوراً کہا " دلّی سے ڈرافٹ نہیں آیا ہے۔ یہ تو میں اپنی جیب سے دے رہا ہوں۔ میں نے کہا تمہاری شوٹنگ نہ رکے "

پھر اُس نے اپنی جیب سے ایک ہزار کی ٹائپ شدہ رسید نکالی۔ اور اس پر بانکڑیا کے دستخط لے لئے۔ بیتال بھائی نے روپے جیب میں رکھے اور سیٹھ کو وہیں چھوڑ کر میڈم کی کیبن میں جوشی جی کو بُلا کے کہنے لگے " یہ ساڑھے سات سو اس وقت ملے ہیں۔ یہ لے جاؤ اور اس سے ابھی کام چلاؤ "

جوشی نے کہا " سیٹھ ہزار کا خرچہ ہے۔ ساڑھے سات سو میں کیسے چلے گا ؟ "

" ابھی چلاؤ نا " بیتال بھائی نے جوشی کو آنکھ مار کے کہا۔ کل پرسوں تک اور کرتا ہوں "

جوشی نے روپے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا " ایسے کیسے چلیں گا سیٹھ۔ وہ جو تجوری میں روپیہ رکھا ہے سیٹھ اُسے ہی کھولو نا "

مرے کدھر ہے۔ روپیہ آج کل " بانکڑا یا سیٹھ مونہہ بنا کے بولے" سالے بھگت لال نے ساڑھے سات سو دے کے ہزار کی رسید لے لی ہے مجھ سے۔ یہ کوئی دھندے کا زمانہ ہے۔ اب میں ہزار روپیہ کدھر سے پورا کروں۔ اچھا۔ لے۔ تو بھی اس ہزار کی رسید پر دستخط کر دے "

جوشی جی نے چپکے سے رسید پر دستخط کر دیے۔

باہر کیبن میں آ کے جوشی نے بھٹا کو آنکھ ماری۔ بھٹا اور وہ دونوں چپکے سے کیبن سے کھسک گئے۔ اُن کا خیال تھا۔ گویا کسی کو معلوم نہیں ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ سب جانتے تھے۔ وہ چوری کھیل رہے تھے وہ سب سے زیادہ جانتے تھے۔ مگر چپ تھے۔

جوشی نے بھٹا کو پانسو روپے دے کر کہا "بس یہی سیٹھ نے دئے ہیں "

"مگر ؟"

جوشی نے بھٹا کو آنکھ مار کے کہا "اگر مگر کچھ نہیں۔ اب اسی میں کام چلانا ہے۔ ہزار کی رقم اسی میں پورا کرنا ہوگی۔ "ایک ہزار کی رسید بھی مجھے چاہیئے "

"بہت اچھا جناب کل تک دے دوں گا " بھٹا نے سر ہلا کے بڑی خوش اسلوبی سے کہا جیسے سب کام ٹھیک ہو گیا ہو۔ اس کے بعد اس نے کیبن کے اندر بیٹھے ہوئے بابو لال کو بلا کر اس کے ہاتھ میں چار سو روپے دئے اور کہا "کل ساڑھے چار سو ملے ہیں۔ اس میں پچاس میں نے شوٹنگ کے لئے رکھ لئے ہیں باقی یہ چار سو روپے تم لڑکیوں میں بانٹ دو "

"انہیں چار سو میں سب کچھ " بابو لال نے معنی خیز نگاہوں سے بھٹا چاریہ کی طرف دیکھ کر کہا

"جی ہاں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہزار کی رسید بھی اُنہی سے بنے گی۔ لڑکیاں تو سب تمہاری اپنی ہیں نا ؟" بھٹا نے پوچھا "اُن سے زیادہ رقم کی رسید بھی حاصل کر سکو گے ؟"

بابو لال نے اپنی جگہ سے جہاں وہ کھڑا تھا۔ ہال میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرف نظر دوڑائی۔ بولا "ضرور

کے سوا میں سب کو جانتا ہوں۔"

"رفیعہ کو میں ٹھیک کر لوں گا۔" بھٹاچاریہ نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" بابو لال بولا "میں لڑکیوں کو موٹروں میں بٹھاتا ہوں۔"

چھ لڑکیاں تھیں۔ چھ مرد تھے۔ دو موٹروں میں ٹھونس ٹھانس کے کسی طرح بیٹھ گئے۔ لڑکیوں نے پہلے اوئی۔ آں؟ ہاں؟ کی۔ کچھ رو نکھے سے قہقہے لگائے لیکن "ہٹو"، "چھوڑو"۔ "مرکم بخت" کے بعد سب سلسلے سے ٹھکانے پر لگ گئیں۔ بس ایک رفیعہ تھی۔ جو سب سے الگ بیٹھی تھی۔ موٹر دادر سے نکلی۔ خداداد سرکل پر پہنچی۔ تلک برج پار کر کے شیواجی پارک کی طرف گھوم گئی۔ تو پنجابی لڑکی نے جوجگہ نہ ہونے کی وجہ سے لالہ بھگت لال کی آغوش میں بیٹھی تھی۔ اس کے پیٹ میں انگلی چبھو کر بولی "ائے پیٹئے۔ تیرے پیٹ میں کتنی ہوا ہے؟"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ رفیعہ جل کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چور گھڑے بار بار اس پر گرا پڑتا تھا۔ اور وہ سمٹ کر الگ ہو جاتی تھی۔ بیتال بھائی اس لڑکی کو گود میں لئے ہوئے تھے جو دس برس سے فلم انڈسٹری میں کام کر رہی تھی۔ وہ بیتال بھائی کو خوب اچھی طرح جانتی تھی۔ واقعی اچھی طرح جانتی تھی بیتال بھائی اور دوسرے لوگ بھی دیکھ رہے تھے۔ کہ چور گھڑے کا معاملہ کچھ جم نہیں رہا ہے۔ مگر وہ سب لوگ خاموش تھے۔ پھر باندرہ کی مسجد گئی۔ سانتا کروز کا سٹیشن گیا۔ جب موٹریں کالینا کی سڑک سے بھی آگے ہولیں تو رفیعہ نے چلا کے کہا۔ اِدھر کونسا سٹوڈیو ہے؟ بھگت لال نے چور گھڑے کی طرف پھر ننگا ہو کے دیکھا۔ چور گھڑے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔ "اِدھر سٹوڈیو تو کوئی نہیں ہے۔ بہار جھیل ہے۔"

"بہار جھیل پر ہم کیا کرنے جا رہے ہیں؟"

"وہیں تو ٹرائی ہو گی۔" ایک لڑکی نے ہنس کے کہا۔

اور اس کی آواز مرد اور عورتوں کے بلند بانگ قہقہوں میں ڈوب گئی۔

رفعیہ نے کہا: "گاڑی روک دو۔"

گاڑی چلتی رہی۔

رفعیہ نے چلا کے کہا: "گاڑی روک دو۔ نہیں تو میں شور مچاؤں گی"

بانکڑیا نے غصے سے بابولال کی طرف دیکھا جو ایک ہاتھ سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اپنی بغل میں بیٹھی ہوئی لڑکی کی کمر ٹٹول رہا تھا۔ بابولال نے اپنے شانے ہلا کے بانکڑیا سے کہا "سیٹھ اسے بھٹا لایا تھا۔ کہتا تھا میں سمجھ لوں گا اس سے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

بانکڑیا نے بابولال سے کہا "گاڑی روک دو بابولال۔ بائی کو جانے دو۔" رفعیہ جلدی سے دروازہ کھول کر اتر گئی۔ گاڑی آگے چل دی۔ ایک لڑکی غصے سے چلا کے بولی۔ بڑی شریف زادی بنتی ہے۔ دوسری بولی نئی نئی آئی ہے۔ تو۔ چار چھ ماہ میں جب جسم کے فاقے لگیں گے پھر خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ سب ہنسنے لگے۔ گاڑیوں کی آواز رفعیہ سے دور ہوتی گئی۔ رفعیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آج میرے گھر میں پھر کچھ نہیں ہے۔ اسے اپنی بہن کے پانچ بچوں کا خیال آیا۔ تم کیوں مر گئیں میری بہن۔ اُس مرحوم بہن کو بددعا دی۔ تم کیوں مر گئے میرے شوہر! اس جوانی میں۔ اس نے اپنے مرحوم شوہر کو بددعا دی۔ تم کیوں مر گئے میرے باپ۔ اُس نے اپنے مرحوم باپ کو بددعا دی۔ اَب کہاں سے بستے بڑے کنبہ والوں کو پالوں۔ میرے پاس تو اس جسم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور ناچ بھی میں نے شوقیہ ہی سکول میں یوں ہی سیکھ لیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ناچ کا فن بیچنے سے پہلے جسم بیچنا ہوگا۔ میرے شوہر میرے باپ۔ میری بہن۔ میرے خدا۔ میرے کنبے والو۔ میرے خاندان والو۔ میری بوٹی بوٹی کاٹ کے کھانے والو تم پر لعنت۔

جب وہ ایک درخت سے لگ کر خوب اچھی طرح سب کو گالیاں دے چکی تو پھر اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے

اور اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے اور کالینا کی طرف واپس چلتے ہوئے اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہنے لگی۔ آج بھوکی ہو تو کیا ہے۔ کام کم ملتا ہے تو کیا ہے۔ کبھی کبھی تو ملتا ہے۔ اور عزت سے ۔۔ ہے۔ اور جب بے عزتی سے ملتا ہے۔ تو تم نہیں لیتیں! تو اس میں مرجانے کی کون سی بات ہے۔ ایک دن دنیا دیکھے گی۔ دُنیا تمہاری قدر کرے گی۔ ایک دن تم اس سارے جنجال سے نکل جاؤ گی۔ بس کسی طرح چالاکی سے۔ کسی کو بہلا پھسلا کے ایک ایک بڑا سا رول حاصل کر لو، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــــ ہاں۔ ہاں! میں یہی کروں گی۔ رفعیہ اپنے دل کے اندر کی دوسری رفعیہ کو سمجھانے لگی۔ میں اپنی عصمت تھوڑے بیچوں گی۔ ان سستی لڑکیوں کی طرح۔ مگر میں ذرا چالاکی اور ہوشیاری سے کام لے کے کسی ڈائریکٹر کو بناؤں گی۔ اور اس سے ایک بڑا سا رول لے کے اُسے ٹھینگا بتا دوں گی۔ پھر جب میں مشہور ہو جاؤں گی۔ پھر مجھے کون ہاتھ لگا سکے گا۔ رفعیہ اپنی شطرنج کی چال پر خود ہی مُسکرانے لگی۔ اور تیز تیز قدموں سے واپس چلنے لگی۔

اُدھر بانگڑ یا سیٹھ کی گاڑی بیہار جھیل کی طرف گئی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد اِدھر میڈم کی جیگر نو بھارت پروڈکشن کے باہر آکے رُکی۔ گاڑی میں سے میڈم دو ہیروئنوں کو لے کے اُتری۔ راج لتا اور شمشاد۔ دونوں فلم انڈسٹری کی اوّل درجے کی ہیروئنیں سمجھی جاتی تھیں۔ جونہی وہ گاڑی سے اُتریں تیز خوشبوؤں کے جھونکے نُکڑ کے ایرانی رستوران تک اُڑتے گئے اور راہ چلتے لوگ جو صرف پرانی ڈبل روٹی کی باس۔ بیڑیوں کے پرانے تمباکو کی سڑاند اور دن پھر کاڑھے کی طرح اُبلتی ہوئی رستوران کی غلیظ چائے کی کھاند سے واقف تھے۔ یکایک ٹھٹھک کر دیکھنے لگے۔ یہ خوشبو کدھر سے آئی تھی۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ کچھ دیکھ سکتے۔ ریشمی لباسوں میں سرسراتی ہوئی ہیروئنیں میڈم کے ساتھ نو بھارت پروڈکشن کے آفس میں داخل ہو گئیں۔ جہاں جوشی جی کے کیبن میں صرف اکرم اور بھٹاچاریہ۔ دو مایوس ہارے ہوئے جواریوں کی طرح بڑی بے دلی سے تاش کے پتے پھینک رہے تھے کھیل نہیں رہے تھے۔ پھینک رہے تھے بھٹا کے ہاتھ سے رضیہ گئی تھی اور اکرم کے ہاتھ سے ہزار کا چیک۔ اس لئے زندگی کی تاش کا ہر پتہ چاہے وہ نئی ہو یا کہ ہو اس وقت اکرم اور بھٹا کے لئے ایک سی حیثیت رکھتا تھا اسی لئے جب میڈم راج لتا اور شمشاد کو لے کے اندر آئی تو اکرم جان بوجھ کے نہیں اُٹھا۔ اگر وہ لوگ اس کی بے عزتی کر سکتے ہیں تو وہ بھی ان کی بے عزتی کر سکتا ہے۔ یہ

روپے والے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ مگر بھٹا کھڑا ہو گیا۔ میڈم نے کرسی پر سر جھکائے اپنے جام میں غرق اکرم کی طرف دیکھا۔ اور سمجھ گئی کہ کیا ماجرا ہے۔ اس بے چارے کو آج بھی ہزار کا چیک نہیں ملا۔ اس نے اکرم سے بات بھی نہیں کی۔ وہ بھٹا سے مخاطب ہو کے بولی۔

"سیٹھ کہاں گئے ہیں؟"

"سٹوڈیو!" بھٹا جاریہ نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں وہ اس نئے سٹوڈیو میں گئے ہیں۔ جو بہار جھیل کے کنارے تیار ہو رہا ہے" اکرم نے بھٹا کی کے پیگ کی طرف بڑے غور سے دیکھ کر کہا" ساتھ میں چھ لڑکیاں بھی تھیں"

میڈم سب سمجھ گئی۔ مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ بھٹا سے پوچھنے لگی" اور کون کون تھا؟"

بھٹا کا مہینی ہوئی آواز میں بولا" لالہ جگت لال تھے۔ شری چوہر گھڑے تھے۔ بابو لال تھے بجن دت تھے"۔ اکرم نے غصے سے کہا" اور اپنے ڈائریکٹر جوشی جی کا نام کیوں نہیں لیتے جو جن کے بغیر بہار جھیل کا کوئی پروگرام مکمل نہیں ہو سکتا!"

میڈم پھر اکرم سے کچھ نہیں بولی۔ اس نے اپنے ہونٹ چباتے اپنے فراک کو گردن کے قریب سے ٹھیک کیا۔ یہ میڈم کی عادت تھی۔ جب اُسے غصہ آتا۔ یا جب وہ کسی گہری سوچ میں ہوتی یا جب کبھی بزنس میں وہ کوئی نیا داؤں کھیلنے کو ہوتی وہ اس سے پہلے بالکل بے اختیار ہو کر بالکل غیر شعوری طور پر اپنی گردن کے قریب سے فراک کو ٹھیک کرتی تھی۔ فراک میں کوئی نقص ہو نہ ہو۔ گردن کے قریب فراک میں چاہے ایک بل یا ایک چنٹ بھی نہ ہو۔ مگر میڈم اپنا فراک ضرور ٹھیک کرے گی۔ یہ اعلان ہوتا تھا کہ میڈم کو غصہ آیا ہے یا سنبھل کے بیٹھو نیا داؤں آیا ہے"

مگر میڈم نے اس وقت کچھ نہ کہا۔ اس نے اپنے پتلے باریک سُرخ ہونٹ ایک دوسرے کے نیچے زور سے دبائے اور غصے کو پیتی ہوئی راج لتا اور شمشاد کو لے کر اپنی کیبن میں چلی گئی۔ کیوں کہ

اسے اپنی اگلی دو فلموں کے لئے راج لتا اور شمشاد سے فیصلہ کرنا تھا۔ اُن کے اندر چلے جانے کے بعد اکرم نے ایک گھونٹ بہت آہستہ آہستہ سے پیا۔ جیسے شراب کی تلخی ہر قطرے میں سے کشید ہو کے مقطر اور مصفّا ہو کے اس کی زبان پہ آ رہی ہو۔

واہ! واہ! کیا تلخی ہے! میڈم کے موڈ کی طرح اس وقت اس میں کتنا غصہ ہے۔ جیسے یہ وسکی اپنے دانتوں سے میری زبان کو کاٹ رہی ہو۔

بھٹا چاریہ چُپ تھا وہ ابھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ اس لئے اپنے سے بڑوں کے سامنے شراب بھی نہیں پی سکتا تھا۔

اپنے سے بڑوں سے ہما رجھیل پر داد عشرت بھی نہ دے سکتا تھا۔ کوئی کیسی ہی غلط بات کیوں نہ کہہ دے اس کا فرض تھا کہ وہ ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملائے اسسٹنٹ کا بھلا اور کام بھی کیا ہوتا ہے۔ یوں کہنے اور کرنے کو تو کام بہت سے ہیں۔ لیکن اگر اسسٹنٹ ڈائریکٹر یہ کام نہیں کر سکتا تو پھر سمجھو وہ کسی کام کا نہیں۔

"بھٹا!" اکرم نے اپنی آنکھیں بھٹا چاریہ کی عینک پر جماتے ہوئے کہا

"یہ جو سُرخ و سپید عورت اس کیبن کے اندر گئی ہے۔ جس کے بال سنہلے ہیں۔ جس کی دو ٹھوڑیاں ہیں جو ہمیشہ تنگ فراک پہنتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں ہیرے کی دو انگوٹھیاں چمک رہی ہیں۔ یہ ہماری میڈم ہے۔"

بھٹا نے کہا" میں جانتا ہوں"

"تم خاک نہیں جانتے۔ کچھ نہیں جانتے" اکرم نے انکار میں زور سے سر ہلا کے کہا "یہ ہماری میڈم ہے۔ اس کا نام میں نہیں جانتا۔ مگر برسوں سے لوگ اسے میڈم کہتے ہیں۔ اس لئے ہم بھی اگر اسے میڈم کہیں تو کیا ہرج ہے۔ یہ میڈم جو ہے نا۔ اصل میں اس فلم کمپنی کی یہی مالک ہے۔ اس دفتر کی

پروپرائیٹر ہے۔ اس کی بانکی خوب صورتی پر نہ جاؤ۔ اوپر سے یہ جتنی نرم دکھائی دیتی ہے۔ اندر سے اتنی ہی سخت ہے۔ اس لئے سپید موتیوں کے سے دانتوں کی چمکتی ہوئی مسکراہٹ ہیرے کی کنی کی طرح سخت ہے۔ اس مسکراہٹ کو آج تک کوئی نہیں کاٹ سکا بڑے بڑے بلند بانگ لہجے والے چالاک پنجابی۔ سندھی مگرمچھ۔ گجراتی پاکٹ مار اور مارواڑی خانوں غپ آئے مگر خود کٹ کر چلے گئے۔ دراصل اس مسکراہٹ میں میڈم کا کوئی قصور نہیں۔ کبھی یہ مسکراہٹ بڑی معصوم تھی۔ نرم تھی۔ بھولی بھالی تھی کبھی اس میں پھول کی پتیوں کی سی نرمی اور بہار کی کونپلوں کی سی نازکی تھی مگر آہستہ آہستہ یہ مسکراہٹ سخت ہوتی گئی۔ جس روز میڈم کے ماں باپ مر گئے اور اس کے چچا نے اُسے دھر کے پیٹا۔ اس کی مسکراہٹ نے اوپر سے نرم رہنا اندر اندر سے سخت ہو جانا سیکھ لیا۔ اور جس روز اس کے چچا نے اسے چھ سو روپے میں ایک سکھ ڈرائیور کے ہاتھ فروخت کر دیا! اس روز اس کی مسکراہٹ کے اوپر آنسوؤں کے لہریے دوڑنے لگے لیکن اندر سے یہ مسکراہٹ لوہے کی طرح سخت ہو گئی۔ پھر جب وہ سکھ ڈرائیور دو سال کی عیاشی میں اُس سے اپنی رقم وصول کر چکا تو اُس نے اسے بمبئی کے ایک سیٹھ بانکے پاس آٹھ سو میں فروخت کر دیا ——— تو ——— تو اس مسکراہٹ میں ہیرے کی کنی آ گئی سمجھے بھٹا؟"

"جی!" بھٹا بڑی نرمی سے اور آہستہ سے بولا" کہیں کیبن میں میڈم نہ سن لے"

"اب اس مسکراہٹ کو کوئی نہیں کاٹ سکتا" اکرم نے اپنے دونوں ہاتھ زور سے انکار میں شرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف جھلا کر کہا" اپنی چھوٹی سی زندگی میں میڈم نے رو کر نہیں مسکرا کر جینا سیکھ لیا ہے۔ اسے جلد معلوم ہو گیا۔ کہ بمبئی میں نرم دل عورتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے خصوصاً ایسی عورتوں کے لئے جن کا کوئی گھر نہ ہو۔ میڈم کا کوئی گھر نہیں ہے" اکرم نے زور زور سے چلا کے کہا" تم کیا سمجھتے ہو بھٹا۔ گھر کیا مکان سے ہوتا ہے۔ کمروں سے۔ ٹیلی فون سے۔ ریڈیو گرام اور ریفریجریٹر سے ہوتا ہے۔ گھر کیا غالیچوں، گیتوں۔ روشنی کے قمقموں اور چینی کی پلیٹوں سے ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں آپ

کو ایک ہی بازار میں مل سکتی ہیں۔ مگر گھر اور بازار میں فرق ہے بھائی!"

بھٹّا نے کہا "آہستہ بولئے۔ میڈم کہیں سن لیں گی۔"

"سُن لے۔ میں اسے سُنانا چاہتا ہوں۔ ساری دنیا کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ میڈم کا کوئی گھر نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے کبھی کوئی گھر نہیں بنایا۔ کیونکہ گھر بنانے کا حق اُس سے شروع میں ہی سے چھین لیا گیا تھا اب وہ کیا کرے۔ میڈم۔ میڈم بڑی چالاک ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ ایک گھر نہیں بنا سکتی تو ایک آفس تو بنا سکتی ہے۔ اُس نے سوچا۔ کیا ہوا۔ اگر اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس کے پاس ہیرے جیسی سخت۔ لیکن تاباں اور درخشاں مسکراہٹ تو ہے۔ ہیرے کی کنی تو فولاد کو بھی کاٹ سکتی ہے انسان کا دل کیا چیز ہے۔ اس لئے تو میڈم نے اس تبسم کو ایک ہتھیار کی طرح استعمال کرکے دھیرے دھیرے آگے بڑھنا شروع کیا۔ ہاں۔ مگر اس کا دھیان رکھو۔ شروع شروع میں اُسے ناکامیاں بھی ہوئیں۔ آگے بڑھنا کوئی خالہ جی کا کھیل نہیں ہے۔ مگر میڈم نے سب کو کاٹ کے پھینک دیا۔ اور آخر میں سیٹھ بانکڑیا سے محبت کرانے میں کامیاب ہوگئی۔"

"یہ محبت کرانا کیا ہوتا ہے" بھٹّا کو ذرا دلچسپی محسوس ہوئی کیونکہ اُسے اپنی رضیہ یاد آرہی تھی۔

اکرم خود ہنسا۔ بولا "ہنسو نہیں۔ محبت کرانے پر ہنسو نہیں۔ اس میں کوئی بُری بات نہیں ہے۔ آدمی اگر خود کسی سے محبت نہ کرے۔ بلکہ اپنی چالاکی سے اپنے سے محبت کرنے پر مجبور کرے۔ تو اسے محبت کرانا نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ سیٹھ بانکڑیا کا خیال تھا کہ انہوں نے خود میڈم سے محبت کی ہے۔ حالانکہ میڈم جانتی تھی کہ کس جتن سے اس نے بانکڑیا سے محبت کرائی تھی۔ اس پورے معاملے میں وہ بالکل ٹھنڈی رہی۔ اوپر سے آگ .... اندر سے برف .... ایک روز سیٹھ بانکڑیا نے گھٹنے ٹیک دئے اور پھر ظفر کینی۔ چار دفتر۔ تین سٹوڈیو۔ کالینا کا مکان۔ بہت بڑا باغ۔ باغ سے پرے بیسیوں بنگلوں میں پھیلی ہوئی زمین سب میڈم کے حصّے میں آئی۔ اور وہ جو لاہور کی رہنے والی تھی اور شلوار اور قمیص پہنتی تھی اب صرف فراک

پہننے لگی اور وقت بے وقت انگریزی بولنے پر اصرار کرنے لگی۔

"دیکھو بیٹا میڈم سے سبق سیکھو۔ میڈم خود اس قدر خوبصورت ہے کہ چاہے تو آج ہیروئن بن سکتی ہے مگر میڈم کو ہیروئن بننے کا شوق نہیں ہے۔ اُسے صرف روپیہ اکٹھا کرنے کا شوق ہے۔ اپنی چھوٹی سی عمر میں ہی پیٹھا۔ لاکھوں روپیہ اکٹھا کر لیا ہے۔ روپے کے معاملے میں میڈم بہت محتاط ہے اور کیوں نہ ہو وہ میری طرح چغد نہیں ہے۔ جس نے دس لاکھ روپے بے کار ملک اور عوام کی خدمت کرنے والی تصویروں میں گنوا دیا۔ کون چاہتا ہے ملک اور قوم کی خدمت کرنے والی تصویروں کو دیکھنا؟ لعنت ہے میری عقل پر۔ میڈم بہت سمجھ دار ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ زندگی نے خود جوتے مار کر اُسے سمجھا دیا ہے۔ وہ وقت وہ کیسے بھول سکتی ہے جب اُسے ایک بار اور دو بار نہیں بلکہ سہ بار اور چہار بار روپوں کے عوض بیچا گیا۔ پھر وہ چیز جو اس کی شخصیت سے اس کی ذات سے اُس کے فن سے۔ اس کی عصمت سے اس کے ماں باپ اور خاندان والوں کے پیار سے اُس کے پہلے اور آخری معاشقے سے زیادہ قیمتی ہو۔ وہ کیوں اسے حرز جاں نہ سمجھے۔ وہ کیوں اس روپے کی ایک ایک پائی کو اپنے سینے سے نہ لگا کے رکھے۔ میڈم کی کنجوسی دراصل ایک طرح اس کی مدافعت ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ وہ دن واپس آئیں جب کوئی اُسے ترازو میں تول سکے۔ جیسے وہ پروڈیوسر اور فنانسر لوگ آج مجھے ترازو میں تولتے ہیں۔ ناکام بچھڑوں کا ڈائرکٹر وہ نہیں چاہتی کہ اب پھر کوئی اس کی طرف اس نگاہ سے دیکھے جیسے قصاب کسی بھی موٹی تازی بکری کی طرف دیکھ کے اندازہ لگاتا ہے کہ اس میں سے کتنا گوشت نکلے گا جیسے یہ لوگ میری طرف دیکھ کے اندازہ لگاتے ہیں کہ اب اس کی عقل کی ہڈی پر کتنا گوشت باقی رہ گیا ہے۔ اور کیا اب یہ کامیاب تصویر بنا سکے گا یا نہیں اس لئے تو آج بانکے بلانے جوشی جی کو چیک دے دیا۔ اس لئے تو میڈم اب خود اندازے لگاتی ہے خود تولتی ہے۔ اور پھر بڑی احتیاط سے چیک لکھتی ہے۔ جبھی تو لوگ کہتے ہیں کہ میڈم کی نگاہوں میں اور اس کے تبسم میں میرے نئی کئی کی کاٹ ہے۔ اور کوئی اُسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اور کوئی اس کے

جذبات سے نہیں کھیل سکتا۔ گو اس میں بھی میڈم کا کوئی قصور نہیں ۔" اکرم ذرا رک گیا۔ اوپر دیکھنے لگا ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر ایک عجیب نرمی سی آگئی۔ اور وہ دھیرے دھیرے کہنے لگا ... "کبھی میڈم کے پاس بھی خواب تھے۔ خوابوں میں کھلنے والے پھول تھے۔ ترم و حیا کی طرح سمٹنے والے جذبات تھے۔ مگر زندگی نے آہستہ آہستہ پیٹ پیٹ کر اس کے سارے جذبات کا پانی نکال دیا۔ اب میڈم کی روح ایک کمائے ہوئے چمڑے کا ٹکڑا ہے۔ جس کے اندر پانی کی ایک بوند بھی نہیں۔ کہیں سے بھی دباؤ آنسوؤں کا ایک قطرہ نہ نکلے گا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ بھتّا۔ کہ ایک عورت۔ ایک خوب صورت عورت کی آنکھ کا پانی مر جائے! .... مگر کس کے لئے ٹریجڈی ہے؟ سماج کا چمڑا بیچنے والوں کے لئے تو نہیں ہے۔"

میڈم نے یکایک اندر آ کے کہا "کیا بات ہو رہی ہے؟"

"آپ کے کردار پر اس بے چارے کو لیکچر دے رہا تھا میڈم!" اکرم نے وسکی کا آخری قطرہ اپنے حلق میں اُتار کے گلاس خالی کر دیا۔

"اور پیو گے!" میڈم بغیر کسی تبسّم کے بولی۔

"نہیں۔" اکرم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میڈم نے بھتّا سے کہا "انہیں گھر چھوڑ آؤ۔ میری جیگر لے جاؤ۔" "اور آپ۔؟" بھتّا چاریہ نے پوچھا۔

"میں شمشاد کی لنکن میں چلی جاؤں گی۔"

اکرم نے کہا "یہ کہیں نہیں جائیں گی۔ رات بھر یہیں بیٹھ کر کراہیں گی۔ جب تک اُن کے سیٹھ نہیں آتے .... ڈم فو .... ڈم فو .... بہت عمدہ نام ہے۔ میڈم .... جوشی جی کے پکچر کا نام ہے۔ اب میں بھی ایسی ہی پکچر بناؤں گا۔"

"حرام زادہ۔ حرام زادہ۔ کیسا نام رہے گا یہ میڈم ....؟"

میڈم نے بھٹا کو اشارہ کیا۔ بھٹا اکرم کو دونوں کندھوں سے پکڑ کے کیبن کے باہر لے گیا۔
باہر جاتے جاتے اکرم اپنی انگلیوں پر گنتے گنتے کہنے لگا۔ بانگڑیا۔ مانگڑیا۔ ٹانگڑیا۔ جھاکڑیا۔ آنگڑ گھانپڑیا۔ سالا کیسا نام ہے؟ دنیا کی کسی زبان میں اس کا قافیہ نہیں ملتا!

میڈم اس لئے باہر نہیں آئی تھی کہ وہ اکرم کا تجزیہ سننے کے لئے بے قرار تھی یا اسے اکرم سے کسی طرح کی ہمدردی تھی۔ دراصل اپنے کیبن کے اندر وہ جو معاملہ ان دو ہیروئینوں سے طے کر رہی تھی۔ اس میں ایک الجھن آپڑی تھی۔ وہ دونوں ہیروئینیں اس کی اگلی پکچر میں کام کر رہی تھیں وہ چاہتی تو دونوں کو الگ بلا کے معاملہ کر سکتی تھی۔ مگر چونکہ دونوں کا کام ایک ہی تصویر میں تھا۔ اکٹھا تھا۔ اور وہ دونوں سہیلیاں تھیں۔ اول درجے میں شمار ہوتی تھیں۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ معاملے کی رقوم ایک دوسرے سے چھپی رہتیں۔ اگر وہ ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم پر راضی کر لیتی۔ تو ایک نہ ایک دن یہ بھید کھل جاتا۔ اور پھر کم رقم لینے والی ہیروئن پکچر کے بیچ ہی میں وہ فساد شروع کرتی.... نہیں .... نہیں.... میڈم نے کچھ سوچ کے ہی دونوں کو اکٹھے بلا کے دونوں سے ایک ہی وقت میں فیصلہ کرنے کا اقدام کیا تھا۔ اب مصیبت یہ آپڑی تھی کہ دونوں ہیروئینیں پچاس پچاس ہزار سے کم لینے پر تیار نہ تھیں۔ اور یہ رقم میڈم کے بجٹ میں نہ آتی تھی۔ اس لئے میڈم اُٹھ کے اپنی کیبن سے جوشی جی کے کیبن میں آگئی تھی۔

اکرم کے جانے کے بعد بھی میڈم کچھ دیر اس خالی کیبن میں کھڑی سوچتی رہی۔ پہلے تو اس کی بھوئیں تن گئیں

ابرو ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ پھر دُور ہو گئے۔ مطلع صاف ہو گیا۔ میڈم مسکرائی۔ اُس نے گردن کے قریب اپنے فراک کو ایک جھٹکا دیا۔ جوشی جی کے میز سے تاش اُٹھائی۔ اور اپنی کیبن میں چلی گئی۔ میڈم نے تکرار مار لیا تھا۔

میڈم نے اندر جاکر تاش کے پتے میز پر پھینک کر کہا "میں ایک راؤنڈ تاش کا ہو جائے تو ٹھیک ہے یعنی کہ اگر میں جیت جاؤں تو تم دونوں کو میری پکچر میں ایک ہزار روپیہ روز پر کام کرنا پڑے گا۔ اور اگر تم دونوں میں سے کوئی جیت جائے۔ تو میں تم دونوں کو الگ الگ اس پکچر کا معاوضہ پچاس ہزار روپیہ ہی دوں گی۔ طے ؟"

"طے!" راج لتا نے شمشاد کے چٹکی لے کر کہا۔

"طے!" شمشاد نے بھی کہہ دیا۔

راج لتا نے سوچا۔ جوشی جی کی پکچر ہے۔ ایک سو دن سے کم میں وہ پکچر نہیں بناتے۔ اب اُن ایک سو دنوں میں پچاس دن تو اپنے نکلیں گے ہی۔ اور اگر نہ نکلے۔ تو وہ سب ترکیب جانتی ہے۔ دن میں دو شفٹ سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اور میڈم نے سوچا۔ میری بنّو۔ تم ہو کس خیال میں میں تمھارا کام پچیس دنوں میں ختم کر کے نہ رکھ دوں تو میرا نام میڈم نہیں۔ پچاس کے پچیس ملیں گے۔ میڈم نے تاش پھینٹی شمشاد نے کٹ کیا۔ میڈم نے تین تین پتے ہر ایک کو پھینکے۔ پتے اُٹھاتے وقت راج لتا نے پتوں کو چوم لیا۔ شمشاد جلدی میں پتوں کو چومنا بھول گئی تھی۔ اس لئے اب وہ ہائے کہہ کے مُسکرا اُٹھی۔ اس کے پتوں میں غلام بیگم۔ اور دُگّی تھی۔ راج کے پتوں میں دو بادشاہ تھے پہلے شمشاد نے جلدی سے اپنے پتے کھول کے سامنے رکھ دئے۔ پھر راج نے۔

ابھی تک میڈم نے اپنے پتے کھولے نہ تھے۔ راج نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کے کہا "ہار گئیں

میڈم تم ہار گئیں۔ لاؤ پچاس ہزار کا کنٹریکٹ بناؤ" میڈم نے دہیں میز پر رکھے ہوئے پتّوں کو باری باری سیدھا کیا۔

پہلا جوکر تھا!

دوسرا اکّہ!!

تیسرا بھی یکّہ!!!

"ہائے!" ایک دم راج اور شمشاد دونوں کے منہ سے نکلا۔ حالانکہ ایک صبح بنارس تھی۔ دوسری شام اودھ۔ مگر ہائے دونوں میں تھی۔ ہائے کے بغیر کوئی عورت مکمل نہیں ہوتی۔

میڈم نے کہا۔ "چلو۔ ایک ہزار روپیہ روز میں۔ ٹھیک ہے"

ابھی تک راج اور شمشاد اُداس تھیں۔ دونوں کچھ نہیں بولیں۔ میڈم اپنی جگہ سے اُٹھی اپنے پرس کو کھول کر اس نے چابیوں کا گچھا نکالا۔ چابی لگا کر سیف کھولا۔ دو ہزار کے نوٹ نکالے۔ اور دونوں کو ایک ایک ہزار دے کے بولی۔

"اب ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے" اب کی دونوں نے سر ہلا کے کہا۔

اس کے بعد راج بولی شمشاد سے "چل تاج چلے گی؟"

"چلوں گی"

"اور آپ میڈم؟"

"تم جاؤ" میڈم نے کہا۔ "میں سیٹھ کا انتظار کروں گی"

میڈم کی آواز میں ہلکی سی تھکن تھی۔ ہلکی سی اُداسی۔ جیسے کسی نے ذرا سی راکھ کرید دی تھی۔ اور اس کے نیچے ذرا سی چنگاری اور اس کی سُرخ زبان دہکتی ہوئی، تڑپتی ہوئی دیکھ لی تھی۔

راج نے اپنا نچلا ہونٹ ذرا سا نیچے لٹکایا۔ اور اپنی آنکھوں کو بڑے معصوم انداز میں میڈم سے شمشاد کی طرف گھماکر اپنی انگلیوں کو اس طرح نچایا جیسے وہ اپنے دماغ سے نہیں اپنی انگلیوں سے سوچ رہی ہو۔ اور یہ واقعی سچ تھا۔ وہ جب بات کرتی تھی تو اس کا چہرہ اس قدر بھولا اور معصوم معلوم ہوتا تھا۔ اور انگلیاں اس طرح جلدی جلدی حرکت کرتی تھیں۔ جیسے وہ واقعی صرف اپنی انگلیوں سے سوچنا جانتی ہو۔ اس وقت بھی اس نے یہی حرکت کی۔ آہستہ آہستہ بولی ۔ ۔ ۔ "میڈم ۔ ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے سیٹھ ـــــ کا انتظار کریں گی۔ ہم کس کا انتظار کریں، چلو بہنا ناچ میں ۔ ۔ ۔ "

راج نے شمشاد کا بازو اپنے بازو میں ڈال لیا۔ اور لنکن میں بیٹھ کر ناچ میں چلی گئی۔

"کھانا کھاؤ گی" شمشاد نے پوچھا۔

"اوں ہوں" راج نے جواب دیا۔

"ناچ دیکھو گی"

"اوں ہوں" راج نے جواب دیا۔

"پھر ـــــ پیو گی؟ ـــــ" شمشاد نے دھیرے سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"اوں ہوں!" راج نے اسی بلند لہجے میں کہا۔

"پھر؟" شمشاد نے حیران ہو کے پوچھا۔

"پھر تمہارا سر" راج شمشاد کے گلے میں باہیں ڈال کے بولی "ہائے شمو۔ تو کس قدر خوب صورت ہے۔ جی چاہتا ہے۔ تجھ سے شادی کر لوں"

"شادی کر کے کیا کرے گی" شمشاد نے پوچھا۔

"اسی لئے تو کرتی نہیں"

"اچھا بول راجو۔ کیا پئے گی" شمشاد نے پوچھا۔

"ٹماٹو جوس"

"ٹماٹو جوس؟" شمشاد نے حیرت سے پوچھا "تو یہاں ٹماٹو جوس پینے آئی تھی"

"اور کیا؟" راج نے ایک بیرے کو آواز دی۔ اور اس سے ٹماٹو جوس لانے کو کہا۔ اور جب وہ دونوں ٹماٹو جوس پی چکیں تو راج نے۔ دو روپے کے بل کے اوپر سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ اور جب بیرہ اٹھانوے روپئے لے کے آیا تو راج نے بڑے بھولے پن سے کہا "KEEP THE CHANGE" بیرہ چکرا گیا۔ بولا "حضور . . . . یہ اٹھانوے روپے"

"رکھو" راج اُٹھتے ہوئے بولی "چل بہنا"

اور وہ شمشاد کو لے کر تاج سے باہر چلی گئی۔ بیرہ حیرت سے راج نتا کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اتنے میں ایک اور بیرہ پہلے بیرے کے قریب آ کے کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہوا؟"

پہلے بیرے نے زیرِ لب سیٹی سی بجا کے کہا "میاؤں میاؤں۔ فش فش!"

ٹکسی میں بیٹھ کر شمشاد سوچنے لگی۔ راج مجھ پر رعب گانٹھتی ہے۔ اس کے پاس تو چھ کانٹریکٹ ہیں۔ اور میرے پاس آٹھ ہیں۔ میں اس کو دکھا دوں گی۔ میں اگلی دفعہ اسے لے کے تاج میں آؤں گی اور صرف سوڈا پیوں گی۔ اور بیرہ کو دو سو روپے بخشش میں دے دوں گی۔ بیرہ جب میرے پاس بل لے کر آئے گا۔ میں اس پر سو روپے کے دوہرے نوٹ ڈال کے کہوں گی! KEEP THE CHANGE یہ راج کیا اپنے آپ کو مجھ سے بڑی ہیروئن سمجھتی ہے۔ او نہہ مکالمے تو ٹھیک سے بول نہیں سکتی فیضل دین کو بھی دین کہہ رہی تھی اس روز شوٹنگ میں۔ اور یہاں تاج میں آ کے دن کی لیتی ہے KEEP THE CHANGE

شمشاد اندر ہی اندر غصے سے کھول گئی۔

پھر شمشاد نے مسکرا کر اپنا سر راج کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور بولی "ہائے تو کتنی ——— میری کتنی اچھی سہیلی ہے راج۔ تیرے بالوں سے کتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے جی چاہتا ہے تیرے کندھے سے لگی لگی

سوجاؤں۔"

"سونا اپنے گھر جاکر۔ نہیں تو وہ تیری دادی امّاں چلائے گی۔ بولے گی۔ جانے یہ راج میری شمّو کوکس مسٹنڈے کے پاس لے گئی۔"

شمشاد ہنسی! اُسے مسٹنڈے کا تخیل بہت عمدہ عمدہ معلوم ہوا جیسے مضبوط مضبوط باہیں اور رخساروں کو چھوتی ہوئی مونچھیں۔ اری کیا یہ سچ ہے: تیری دادی امّاں ہر ایک پر ڈورے سے کہتی ہے۔ میری شمّو۔ میری شمّو۔ تو جب سے پیدا ہوئی ہے: آج تک ویسی کی ویسی ہے۔ کیا یہ سچ ہے بتا! راج نے پلٹ کے شمّو کو چیلنج کرتے ہوئے بولی۔ جواب میں شمّو نے راج کے گدگدی کی اور دونوں سہیلیاں فاختاؤں کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔

امیر علی ڈرائیور کے جسم میں ایک عجیب سی جھرجھری سی آئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر سے جیسے بلبلے سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک لمبا تڑنگا تنومند پٹھان تھا۔ اور اُسے عورتوں کا یہ پیار پسند نہیں آیا تھا اس نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پاکے کہا" بائی کدھر چلوں؟"

"گھر" شمشاد نے جواب دیا۔

شمشاد وارڈن روڈ پر رہتی تھی۔ مگر جب وارڈن روڈ کے گھر میں شمشاد نے دادی امّاں کے کمرے میں روشنی دیکھی تو راج سے کہنے لگی "دادی امّاں جاگ رہی ہیں۔ ابھی نہیں جاؤں گی۔"

"پھر کہاں چلے گی؟"

شمشاد نے امیر علی سے کہا" امیر علی گاڑی ہینگنگ گارڈن کی طرف گھمالے۔"

ہینگنگ گارڈن کے سامنے دل آرام ریستوران تھا۔ سرسبز اور بالکل الگ تھلگ۔ راج اور شمشاد دونوں تیسری منزل کے کھلے فرش پر چلی گئیں۔ انہوں نے بیرے سے کہہ کر ایک چھوٹی سی میز اور کرسیاں لوہے کے جنگلے کے قریب سرکالیں۔ یہاں سے بمبئی کا شہر چاروں طرف پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی روشنیاں۔ اور آسمان پر چاروں طرف ٹمٹماتے ہوئے ستارے۔ اور میرین ڈرائیو کے نیم دائرے میں نیلی نیلی روشنیوں کے قوس۔ کسی دوشیزہ کے کنگن کی طرح جھلملاتی ہوئی اور سکیسر کے درختوں میں کہیں کوئی قطرہ کرنے والی چڑیا ابھی تک اپنے محبوب کو بلا رہی تھی اور ہوا کے ہر سانس میں رات کی رانی کی خوشبو تھی اور چوپاٹی کی ریت پر ایک گوانی سمندر کی طرف منہ کئے گیتار بجا رہا تھا۔

اس خوب صورت شہر کے اوپر کھلے خوب صورت آسمان اور روشنیوں کی جھالروں سے سجے لامتناہی نیلے سمندر کو دیکھ کر کیا کچھ یاد نہیں آتا..... یہ کائنات!——یہ انسان کے ہاتھوں کی محنت کی نازک سی خوب صورتی جس کا یہ شہر ایک ادنےٰ سا کرشمہ ہے۔ وہ گھروندا جہاں شمشاد پیدا ہوئی تھی۔ راج کی وہ پہلی محبت۔ جواب کتنی دور رہ گئی تھی۔ وہ ابلی کے جب طلی پہلی دفعہ بری طرح دھڑکا تھا..... وہ صبح جب شمشاد پہلی بار سکول گئی تھی۔ کتنی ہی نازک سی پیاری پیاری باتیں عزت کا تقدس لئے۔ دل میں ایک عجیب سی پاکیزگی ایک عجیب سی سنجیدگی کے احساس کو جگانے والی باتیں ایسے لمحوں میں یاد آتی ہیں۔

شمشاد نے اک آہ بھر کے اپنی ٹھوڑی ریلنگ پر ٹکادی۔

"کیوں کچھ یاد آرہا ہے؟" راج نے پوچھا "خدا؟"

"نہیں جیمس سٹوارٹ!" شمشاد آہ بھر کے بولی ..... "اور تمہیں؟"

"ہائے میرا ایلن لاڈ!" راج لتا بالکل بے قرار ہو کر شمشاد کے کندھے سے لگ گئی۔ شمشاد کو جیمس سٹوارٹ اور راج لتا کو ایلن لاڈ پسند تھا۔ دونوں ہالی ووڈ کے کلاکار تھے۔ یہ دونوں ہندوستانی ہیروئنیں تھیں اور

ابھی حشر تک کوئی امکان اس کا نہیں تھا۔ کہ کوئی انہیں ہالی وڈ بلا کے انہیں جمیس سٹوارٹ یا ایلن لاڈ کے ساتھ کام دے سکے۔ اس لئے بادل ناخواستہ ان دونوں نے اپنے اپنے محبوب کی تصویر اپنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ لی تھیں یہ بات نہیں تھی کہ ہندوستان میں خوب صورت مردوں کی کمی تھی۔ مگر ہندوستان کی چوٹی ادا کارہ اگر ہالی وڈ کے چوٹی کے اداکار سے محبت نہ کرے تو کس سے کرے۔ ذرا اس سے کم سطح کے محبت کرنا کچھ گھٹیا سا معلوم ہوتا ہے۔

اور اب تو ایلن لاڈ کی ایک عرصے سے شہر میں کوئی تصویر بھی نہیں آئی۔" راج تقریباً رو کر بولی۔

ثمشاد نے پھر اک آہ بھری۔ یہ آہ۔ جو صاف اور صریحاً کہہ رہی تھی۔ تمہارا ایلن لاڈ جائے بھاڑ میں مجھے تو اس وقت اپنا پیارا راجی یاد آ رہا ہے۔

بہرے نے آ کے پوچھا "حضور کیا پئیں گی؟"

راج بولی "اٹھو بہنا۔ یہاں تمہیں کوئی جینے نہیں دے گا۔" پھر وہ بیرے سے مخاطب ہو کے بولی۔
"ہم اپنا غم پئیں گے۔"

بیرہ حیران رہ گیا۔ راج لتا ثمشاد کو لے کے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔ اترتے اترتے اسے خیال آیا۔ اس نے کتنا عمدہ فقرہ کہا تھا۔ وہ خود ہی اپنے خیال کی عظمت سے مرعوب ہو گئی کتنی بڑی بات ہم اپنا غم پئیں گے۔ فلسفے میں ڈوبی ہوئی بات! ہائے میں نے کتنی اچھی بات کہہ دی۔ پھر اسی نے فیصلہ کیا۔ کل جب وہ سنت گمن گمن گھنیشور کے سیٹ پر شوٹنگ کرنے جائے گی۔ تو منشی جھڑ ڈوس جھڑ نالوی مکالمہ نویس کو ضرور یہ فقرہ بتائے گی اور اس سے اصرار کرے گی کہ وہ یہ فقرہ ضرور اس کے کسی ڈائیلاگ میں ڈال دے۔ راج لتا ادب اور شاعری کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے منشی بھاگیر تھ رام بھوجپوری کے سارے ناول اور ہمزاد لکھنوی کے سارے دیوان پڑھ ڈالے تھے۔ جب کہ دوسری ہیروئنیں بڑی مشکل سے صرف کھانے کا مینو پڑھ سکتی تھیں۔

لوٹتے ہوئے شمشاد نے بڑے اُداس لہجے میں کہا۔" راج! ہماری بھی کوئی زندگی ہے۔ یوں دیکھو تو سب کچھ ہے۔ فلیٹ، گاڑی، شہرت، دولت، مگر یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جس کے بغیر سب سونا معلوم ہوتا ہے۔"

"سچ کہتی ہے تو!" راج آہستہ سے بولی "ارے میرا لاڈو .... !"

شمشاد کچھ دیر خاموش رہی۔ کچھ دیر گاڑی خاموشی سے وارڈن روڈ کی طرف چلتی رہی۔ پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کے شمشاد نے کہا۔

"راج! مجھے وہ ماٹی پلا شاعر۔ کیا نام ہے ..... کم ذات کی غزل سنا دے۔"

"کم ذات نہیں ہمزاد"

"ہاں ہاں ہمزاد کی غزل ہی سنا دے۔ بہنا جی بہت اُداس ہے۔"

شمشاد کو وارڈن روڈ پر چھوڑ کر راج اس کی لنکن لے کر اپنے بنگلے کو چلی گئی جو باندرہ میں تھا۔ پالی ہل پر۔ پالی ہل کی طرف مڑتے مڑتے امیر علی ڈرائیور نے سوچا میں اسے پالی ہل، کیوں لے جاؤں۔ اسے باندرہ کے ساحل پر کیوں نہ لے جاؤں۔ اس وقت وہاں باندرہ کے ساحل پر کوئی نہ ہوگا۔

پھر اس نے سوچا۔ اگر اُسے تین سال کی جیل ہوگئی۔ تو اس کی بیوی زبیدہ اور اس کا چار سال کا بچہ شہباز کیا کرے گا۔ عین ممکن ہے۔ اس کے جیل کے دنوں میں کوئی اس کی بیوی کو باندرہ کے ساحل پر لے جائے۔ غریبی میں کیا کچھ ممکن نہیں ہے۔

"مگر اس وقت موقع اچھا ہے۔" امیر علی پٹھان نے امیر علی ڈرائیور سے کہا۔

"ہاں مگر اس موقع کو حاصل کر لینے کے بعد زندگی بھر کوئی مجھے ڈرائیور نہیں رکھے گا۔"
امیر علی ڈرائیور نے امیر علی پٹھان سے کہا۔
"خو ....." پٹھان اصرار کرنے لگا۔
"چپ رہو" ڈرائیور نے بڑی سختی سے کہا۔ اور پھر گاڑی کا رخ پالی جل کی طرف موڑ دیا۔

راج کو پتہ نہیں چل سکا کہ امیر علی نے اپنے دل میں کیا باتیں کیں۔ کیونکہ وہ اپنے دل کی باتوں میں مصروف تھی۔ اتنے میں اس کا بنگلہ آ گیا۔ جیوں ہی گاڑی پورچ میں رُکی ایک دُبلے پتلے سوکھے گھاڑ سے آدمی نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ جلدی سے کھول کے راج لتا کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے وہ نگاہیں کہہ رہی ہوں "کہاں گئی تھیں؟"

یہ راج کا خاوند شنکر تھا۔ راج اس وقت تک چپ رہی جب تک امیر علی گاڑی کو بنگلے سے باہر نکال کے نہیں لے گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاوند کی طرف مڑی اور گرج کے بولی "جہنم میں گئی تھی!"

اُس کا خاوند گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا "مگر میں نے تو کچھ نہیں کہا راج!"

راج اس کی بات کا جواب دئے بغیر آگے بڑھ گئی۔ آگے برآمدے میں اُس کے چچا کھڑے تھے چوڑی دار پاجامہ۔ سر پر دوپلی۔ چہرے پر جھرّیاں۔ آنکھوں میں وہی شبہہ اور عجیب ڈر سا....

راج نے ڈپٹ کے پوچھا "آپ ابھی تک سوئے نہیں"
"تمہارا انتظار کر رہا تھا!"

راج نے بڑی سختی سے کہا "میں نے کب کہا ہے میرا انتظار کیجئے۔ میرا انتظار کبھی نہ کیجئے گا۔ دس دفعہ کہہ چکی ہوں۔ کوئی بچی نہیں ہوں۔ اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ خبردار جو آئندہ سے کسی نے میرا انتظار کیا۔ راج اِدھر اُدھر دیکھ کر گرجی۔ مگر وہاں برآمدے میں چچا کے سوا کوئی نہ تھا خاوند چپکے سے کان لپیٹ کے گراج میں چلا گیا۔ کیونکہ وہ گاڑی چلاتا تھا۔ اور باہر دنیا میں اُسے صرف ڈرائیور ہی سمجھا جاتا

تھا۔ یہ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ راج کا خاوند تھا۔
راج چچا کو وہیں برآمدے میں ٹھٹھر اچھوڑ کر اندر ہال میں چلی گئی۔ ہال میں اس کا بھائی ابھینو جنگ پہ مٹھیاں بھینچے بیٹھا تھا۔ اس نے آتے ہی راج کو بالوں سے پکڑ لیا "کہاں گئی تھی سالی"
راج نے اس کے منہ پر زور کا ایک طمانچہ جڑ دیا۔
بھائی نے ایک گھونسہ مارا۔ راج رونے لگی۔ مگر روتے روتے لڑتی بھی گئی۔ اس نے ناخنوں سے اپنے بھائی کا چہرہ جگہ جگہ سے لہولہان کر دیا۔ چلا چلا کر کہنے لگی "سور کا بچہ!"
"سور کی بچی!" بھیا ابھینو غصے میں غرائے "سالی روز رات کو دیر سے آتی ہے یہ گھر ہے کہ رنڈی کا کوٹھا ہے"
"حرام زادے بہن کا کھاتے ہو۔ اوپر سے اکڑتے ہو" راج اس کے ایک طمانچہ مار کے بولی۔
ابھینو کو طیش آیا۔ اس نے راج کے اتنے زور سے بالوں کو پکڑ کے گھسیٹا کہ راج صوفے سے نیچے فرش کے غالیچے پر گر پڑی۔ اور تپائی پر رکھا ہوا گلدان گر کر ٹوٹ گیا۔
اتنے میں چچا آموور۔ ابھینو کی بیوی گوری اور چچی گھنشی اور موسی دلاری اور موسی کی بیٹی رام پیاری اور اس کا خاوند اجیت سنگھ اور دس بارہ لڑکے لڑکیاں۔ جانے کہاں کہاں بنگلے کے کونے کونوں سے نکل کر ہال میں جمع ہو گئے۔ اور ایک ہی وقت میں ایک دوسرے پر زور زور سے چیخنے چلانے چنگھاڑنے اور رونے پیٹنے لگے۔
آس پاس کے بنگلوں کی روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ باری باری سے پھر چمکنے لگیں۔ ساتھ والے بنگلے کے انجینیر کمال داس نے اپنی بیوی سے کہا "ارے یہی روز کا ٹنٹا ہے۔ یہی راج دیر سے آتی ہے۔ تھوڑی دیر تک غل غپاڑہ رہے گا۔ پھر سب سو جائیں گے.... چلو اندر...." کمال داس نے اپنی بیوی کی کمر پر ہاتھ رکھا۔ ابھی ان کی شادی ہوئے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے مگر ——"
بیوی تملا کے بولی "نہیں میں تو ذرا یہ جھگڑا سنوں گی"
"روز تو سنتی ہو" کمال داس نے جھپائی لے کر کہا "اس میں کیا رکھا ہے جاہل۔ بدتہذیب فلمی غنڈے ....."

"تم کیا جانو۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات ہوتی ہے۔" کمال داس کی بیوی بولی "تم کیا جانو عورتوں کی باتیں۔ تم جا کے سو رہو، میں ابھی آتی ہوں۔"

کمال داس کو خوب معلوم تھا کہ ابھی آتی ہوں کا مطلب ایک گھنٹے سے ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح صبر کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا ایک پیار تو دے دو۔"

"لو" کمال داس کی بیوی نے پیچھے سے دونوں ہونٹ جلدی سے اُس کے آگے کر دیئے۔ بڑی بے دلی سے.... کمال داس کو بوسہ لیتے ہوئے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ بوسہ نہیں لے رہا۔ رتیلی زمین میں پھاوڑا چلا رہا ہے۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اپنے کمرے میں رنجیدہ ہو کے چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ہوں، سالی کا دِل اس وقت جھگڑے میں ہے۔

کمال داس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کوئی گھنٹہ بھر میں جھگڑا رفع دفع ہوا۔ آہستہ آہستہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ اب صرف راج کے کمرے میں روشنی تھی۔

اب راج اور بھیا میں صلح ہو گئی تھی۔ راج اپنے بھائی کے چہرے پر جہاں جہاں ناخون کے نشان تھے کریم لگا رہی تھی اور سسکیاں لے لے کے کہہ رہی تھی "بھیا تم بھنگ کیوں پیتے ہو۔"

"تو کیا کروں۔ راجو۔ تم وہسکی کے پیسے جو نہیں دیتی ہو۔"

"کیسے دوں؟ تم خود ہی گھر کی حالت تو دیکھتے ہو۔ بھیا جی۔ جو رشتے دار ہے۔ جو بے کار گاؤں والا ہے جس مونہے سے کبھی بچپن کی ایک دن کی جان پہچان تھی۔ وہ سیدھا یہاں باندرے میں راج کے بنگلے پر چلا آ رہا ہے۔ لگ بھگ کوئی پچاس آدمیوں کا کھانا صبح و شام تیار ہوتا ہے۔"

اور یہ بات بالکل سچ تھی۔ مگر اس میں راج کا خود اپنا قصور تھا۔ جب اس کے اچھے دن آئے

اور اس کا شمار ہندوستان کی گنی چُنی اداکاروں میں ہونے لگا۔ اور اسے پچاس پچاس ہزار کے کانٹریکٹ ملنے لگے۔ تو اس نے بھی اپنا خرچ بے تحاشا بڑھا لیا، گاڑیاں، مکان، فلیٹ، کپڑے۔ گتے تو تھے ہی۔ اب اس نے ایک ایک کر کے اپنے سب رشتہ داروں کو اپنے پاس بُلانا شروع کیا۔ پہلے چچا آئے پھر اس کا خاندان۔ پھر پھوپھا آئے۔ پھر اُن کا خاندان۔ پھر بہت سے بے کار لوگ۔ مگر دُور پار کے رشتے دار بھی بنا بلائے چل پڑے۔ راج کو اپنے بنگلے کے ساتھ ایک اور بنگلہ کرائے پر لے کر ان سب لوگوں کو رکھنا پڑا۔ ان کے علاوہ اس کا اپنا خاوند تھا۔ جو چاہے کچھ نہیں کہتا تھا۔ مگر زندہ تو تھا۔ اور ہر روز مارفیا کا انجکشن لیتا تھا۔ پھر اس کے چچا تھے۔ جو اپنی بیوی کے علاوہ ایک رنڈی رکھے ہوئے تھے اس کا خرچہ پانی بھی راج کو دینا پڑتا تھا۔ ابھیمنیو بھنگ پیتا تھا۔ اور شعر کہتا تھا شعر تو نہیں کہتا تھا۔ لیکن اُردو کے سارے دیوان اُس کے پاس تھے۔ اُن میں سے شعر چُرا چُرا کے فلم کے رسالوں کو بھیجتا تھا اور وہ لوگ اس لئے چھاپتے تھے کہ وہ راج کا بھائی تھا۔ کبھی کبھی اس کے سہارے راج کا نیا فوٹو، یا اس کا کوئی انٹرویو ان رسالے والوں کو مل جاتا تھا کبھی کبھی کوئی چٹپٹی مزے دار خبر۔ کیونکہ جب راج اور بھیّا کی زور کی لڑائی ہوتی۔ تو راج کئی کئی روز اپنے بھائی کو منہ نہیں لگاتی اور اسے پیسے نہیں دیتی تھی۔ ان دنوں ابھیمنیو بے چارا کیا کرے بھنگ کیسے پئے۔ اپنی بیوی بچوں کا خرچہ کیسے پورا کرے۔ چنانچہ وہ ان دنوں اپنی بہن کے معاشقوں کے حالات رسالے والوں کو اونے پونے میں بیچ دیتا کئی بار ایسا بھی ہوا کہ راج سے لڑائی ہوگئی۔ مگر کوئی معاشقہ نہیں ملا اور بھنگ کی ٹوٹ ہو رہی ہے اس لئے ابھیمنیو کو ایسے موقعوں کے لئے نئے نئے معاشقے بھی خود ہی گھڑنے پڑتے تھے۔ گویا وہ ایک خلّاق فن کار بھی تھا۔ مگر اس وقت ابھیمنیو اور راج کی صلح ہوگئی تھی۔ وہ اُسے بھیّا کہہ رہی تھی اور وہ اُسے راجو کہہ رہا تھا۔ اور دونوں بہن بھائی ایک ہی صوفے پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے گھل مل رہے تھے۔

راج نے بڑے پیار سے کہا "میں آج اپنے بھیّا کو وسکی پلاؤں گی۔"

یہ کہہ کر راج صوفے سے اٹھی۔ اور اس نے الماری کھول کر وسکی کی بوتل نکالی۔ تپائی پر دو گلاس رکھے ریفریجریٹر سے سوڈے کی بوتلیں لائی پھر وہ دونوں وسکی پینے لگے۔

دو پیگ پینے کے بعد ابھینو نے کہا " راجو تم سب کو نکال دو۔ ان سب رشتے داروں کو "

" ہاں بھیا تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں کل ہی ان سب کو چلتا کر دوں گی "

" صرف ہم اور تم رہیں گے "

" ہاں بھیا صرف ہم اور تم ۔ ۔ ۔ ۔ "

دو پیگ اور پینے کے بعد ابھینو نے کہا " راجو۔ تم شنکر کو بھی نکال دو "

" شنکر تو میرا شوہر ہے " راج بولی۔

" تو کیا ہوا " ابھینو بڑے غصّے میں بولا " سالا۔ بالکل تمہارے لائق نہیں ہے۔ سوکھا سڑا۔ ننھا۔ تمہارے ماں باپ نے اس سے تمہاری شادی کر کے تم سے بڑا ظلم کیا ہے۔ میں تمہارا بھائی ہوں میں تم سے انصاف کروں گا۔ تم شانتا رام سے شادی کر لو "

" مگر شانتا رام تو شادی شدہ ہے "

" اچھا تو محبوب سے کر لو "

" وہ بھی شادی شدہ ہے "

" اچھا تو کاردار سے کر لو "

" وہ بھی شادی شدہ ہے " راج بولی۔

یہاں آ کے ابھینو کا دماغ رُک گیا۔ اور دو پیگ پینے کے بعد اس نے سوچ سوچ کے کہا " اچھا تو مجھ سے شادی کر لو "

" مگر تم تو میرے بھائی ہو " راج بولی۔

"ہاں ٹھیک ہے ....." بھیانے سر ہلا کے کہا۔ "اچھا تو پھر مجھے اور وہسکی دو۔"

پیشتر اس کے کہ راج اس کے گلاس میں اور وہسکی انڈیلتی۔ ابھینو نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور صوفے پر اوندھا ہو کر خراٹے لینے لگا۔ راج نے اسے ٹانگ سے گھسیٹ کر فرش کے غالیچے پر سُلا دیا۔ پھر اس نے زور سے گھنٹی بجائی۔ باہر پھر روشنی ہوئی۔ ایک نوکر آیا۔ راج نے ابھینو کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خراٹے لیتے ہوئے ابھینو کو اپنے بازو میں اُٹھا کے لے گیا۔ راج نے چٹخنی چڑھا دی اور بتی گل کر کے مسہری پر لیٹ گئی۔

راج نے کروٹ لے کے مسہری کے قریب تپائی پر رکھی ہوئی ایلن لاڈ کی تصویر کی طرف دیکھا۔ جو ریڈیم کے فریم میں جڑی ہوئی اندھیرے میں بھی جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ ریڈیم واچ کی طرح .....

"ڈارلنگ۔" راج لاڈ کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی، اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رئیس گنج کا عشرت بہت خوب صورت تھا۔ اس کی خوب صورتی میں اس کی تخلیق میں اس کی افزائش میں۔ اُسے عشرت کی ذات میں مجتمع کرنے میں عشرت کے ماں باپ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اور انہوں نے عشرت کو ایک وجیہہ پروقار خوب صورت تعلیم یافتہ، متمدن نوجوان بنانے میں بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ کوئی تاج محل بناتا ہے، کوئی عشرت بناتا ہے۔ خوب صورتی کی تخلیق کا جذبہ ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔

ہر باپ اپنے بیٹے کے آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ عشرت کے والد ریٹائرڈ سشن جج تھے۔ اس لئے عشرت کو کم از کم ہائی کورٹ کا جج تو ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ عشرت بی، اے کے بعد لا کالج میں داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے اثر اور رسوخ سے آہستہ آہستہ ایک دن ـــــ ایک دن جو کبھی نہیں آیا۔ اور عشرت کے والد اسی حسرت کو اپنے دل میں لے گئے۔ انسان آئینہ ساز کیوں ہوتا ہے۔ وہ انسان گر کیوں نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بیٹے کی شبیہہ میں ماضی کا عکس کیوں دیکھتا ہے مستقبل کی تہ در کیوں نہیں دیکھتا ہے؟

عشرت کے باپ نے کانچ کی سطح پر جو عکس دیکھتے تھے وہ ان خوابوں سے بہت مختلف تھے۔ جو

عشرت کے دل و دماغ پر چھا رہے تھے۔ ہر شخص کا دل۔ اس کا اپنا دل ایک ذاتی آئینہ ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا اپنی تصویر نہیں دیکھ سکتا۔ بہت سے باپ یہی غلطی کر جاتے ہیں اور پھر ساری زندگی اُسے بھگتتے رہتے ہیں۔ عشرت کے باپ اور ان کے مرنے کے بعد اس کی ماں اگر عشرت کے دل کے آئینے میں جھانک سکتی تو دھک سے رہ جاتی۔ کیونکہ اس آئینے میں ان خوابوں کی تعبیر موجود نہ تھی جنھوں نے اپنی زنگار رنگ بوقلموں کیفیتوں سے اُن کے خانۂ دل کو سجا رکھا تھا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ عشرت اکثر سوچا کرتا تھا۔ میرا آئینہ کسی کے آئینے سے کیوں ملے۔ میں انسان ہوں۔ کانچ کی سطح نہیں ہوں شروع شروع میں عشرت کے خواب مختلف تھے۔ اسے ورزش کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑا ہو کر جمناسٹک کا اُستاد بننا چاہتا تھا جب وہ اور بڑا ہوا تو فوج میں جنرل بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ جب وہ اور بڑا ہوا اور جب اسے دُزدیدہ نگاہوں شرمائی ہوئی نظروں اور عرق عرق جبینوں اور کانپتی ہوئی نیم مدہوش آہنگوں کے پیام ملنے لگے۔ تو وہ فلم میں ہیرو بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ بشت!۔ وہ جمناسٹک کا اُستاد کیوں بنے گا۔ باری زنٹل بار پر ورزش کرتے کرتے اس کا تو دم نکل جائے گا۔ اور فوج میں جنرل؟ پہلے تو وہ سپاہی میں بھرتی ہوگا اور لفٹ رائٹ کرتے کرتے پریڈ کرتے فٹیک کھاتے کھاتے جانے کب جنرل بنے گا۔ کہ کسی دن کورٹ مارشل ہو کے پھر سپاہی رہ جائے گا۔ لیکن یہ فلم کا ہیرو بننا کس قدر اچھا اور آسان کام معلوم ہوتا ہے جس طرح وہ چاہا گیا تھا۔ جس طرح رئیس گنج میں اس کی خوب صورتی کے چرچے تھے۔ جس طرح انجان بے سمجھ۔ نامعقول لڑکیوں نے چھپ چھپ کر اس سے محبت کی تھی جس طرح کی انجان، بے سمجھ۔ نامعقول ہندوستانی فلمیں اس نے دیکھی تھیں۔ اس سے عشرت کو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قطعی طور پر فلم میں ہیرو بننے کے قابل ہے اور ہیرو کا کام کس قدر آسان ہوتا ہے۔ فلم میں شروع سے آخر تک محبت ہی محبت کئے جانا۔ محبت کے گیت گانا۔ محبت کے خط لکھنا۔ محبت کے آنسو بہانا۔ محبت کی موت مرنا۔ یا محبت کی شادی کرنا گویا مزے ہی مزے ہیں۔ ہر طرف سے اس کے

مقابلے پر وزرش کا اُستاد یا فوج کا جنرل۔ یعنی ساری عمر ایڑیاں رگڑ رگڑ کے گذار و۔ عشرت کا ریشم میں ملبوس جسم اس خیال کے آتے ہی کانپ گیا اور اس نے فلم میں ہیرو بننے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

اس لئے عشرت بی اے پاس کرتے ہی بمبئی بھاگ گیا۔ اور اپنی بیوہ ماں کو اکیلا چھوڑ گیا۔ رُئیس گنج کا شہر اس کے لئے بہت چھوٹا تھا۔ یہاں کی کامیابیاں بہت حقیر تھیں۔ سکندر مقدر ونیہ میں کیسے رہ سکتا تھا۔ اتنی بڑی دنیا فتح یابی کے لئے اُسے چاروں طرف سے بلا رہی تھی۔ اس لئے سکندر رُئیس گنج سے بمبئی آگیا۔

ہر سال ملک کے اطراف و اکناف سے ہزاروں لوگ بمبئی کام کی تلاش میں آتے ہیں اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے۔ جسے روکا جاسکے بمبئی ہندوستان کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے اور کام کاج کے سلسلے میں ایک بڑا صنعتی شہر ایک بہت بڑا مقناطیس ہوتا ہے۔ جو بے روزگار لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہر جگہ ہر ملک میں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کیونکر یہاں تجارت ہوگی اور صنعت وحرفت ہوگی۔ وہاں باہر سے لوگ کھنچے ہوئے آئیں گے اور گھروں کو چھوڑ کر آئیں گے اور بیویوں کو چھوڑ کر آئیں گے اور ماں باپ کی خواہشوں کو روند کر آئیں گے اور دوستوں اور محبوباؤں کے آنسوؤں میں بھیگتے ہوئے آئیں گے جس طرح لوہے کے ذرّے مقناطیس کی طرف کھینچتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہاں عشرت بھی آئیں گے اور ڈیوڈ بھی آئیں گے۔ اور کرپال سنگھ بھی آئیں گے۔ یہاں غدرا بھی آئیں گی۔ سوشیلا بھی آئیں گی۔ ازابیل بھی آئے گی اور ساوتری بھی آئے گی۔ کوئی فاقوں کے ساتھ آئیں گی تو کوئی ڈھائی سو روپے لے کے آئیں گی۔ کوئی زیور چُرا کے آئے گی۔ تو کوئی کسی کی آنکھوں کی نیند چرا کے آئے گی۔ مگر آئے گی ضرور کیونکہ بمبئی ایک بہت بڑا مقناطیس ہے۔ جہاں واسنتی رہتی ہے مبلے چاری بیوہ واسنتی جو اپنے گاؤں میں بھوکی مرتی تھی۔ پر یہاں بمبئی میں ایک بل میں ساٹھ روپے پاتی ہے۔ یہاں رانی بالا ہے۔ جو سُنا ہے ایک فلم میں کام کرنے کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے لیتی ہے۔ پھر یہاں اپنے

کرپال کا بھتیجا گرنجش ہے۔ ارے وہی گرنجش جو اپنے قصبے میں مارا مارا پھرتا تھا۔ یہاں سُنا ہے اُس کے پاس چھ ٹیکسیاں ہیں۔ اور دیجے کمار کو تو دیکھا ہوگا۔ یہاں کا رسالہ "مہندر" بھی اس کے افسانے نہیں چھاپتا آج وہ بمبئی کا سب سے بڑا فلمی ادیب ہے۔ اور عشرت نے سوچا وہ تو راج کمار سے کہیں خوب صورت ہے۔ وجے کمار سے کہیں تعلیم یافتہ ہے۔ اس لئے اس نے اپنے سوٹ کیس میں تین اچھے سِلے ہوئے سوٹ رکھے کچھ قمیصیں، انگریزی جرابیں، جوتے، اور تین سو روپے ساتھ میں لئے ہوئے۔ وہ بھاگ کر بمبئی آگیا اور آکے سی سائیڈ ہوٹل میں ٹھہر گیا۔

سی سائیڈ ہوٹل کی غلام گردش میں ٹہلتے ہوئے کھنہ نے عشرت کو دیکھ لیا۔ کھنہ راج محل اسٹوڈیو میں کیمرہ مین تھا۔ اور بظاہر بہت حلیم۔ بردبار اور متین قسم کا انسان نظر آتا تھا۔ گول گول چہرہ، گول گول عینک، گول گول مسکراہٹ کچھ کہتی بھی ہے۔ کچھ کہتی بھی نہیں۔ پان کلے میں دبائے ہوئے ایک نیلے رنگ کی چوڑی مہری والی پتلون۔ اور پتلون کے اوپر ڈھیلا ڈھالا براؤن رنگ کا بش شرٹ پہنے ہوئے گھسٹتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ کھنہ بظاہر سوئے ہوئے لہجے میں کام کرتا تھا۔ سوئی ہوئی رفتار سے چلتا تھا۔ سوئی ہوئی اَدھ مُندی آنکھوں سے اس طرح دیکھتا تھا۔ جیسے وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہے۔

مگر در اصل اُس کی غفلت اک بظاہر سوئے ہوئے کنڈلی مارے ہوئے، دھوپ سینکے ہوئے سانپ کی غفلت تھی۔ آپ ذرا اس کے قریب گئے اور اس نے ڈنک مارا۔ کھنہ نے عشرت کو غلام گردش میں ٹہلتے ہوئے تاڑ لیا۔ کہ نئی آسامی ہے۔ فلم کے چکر میں ہے۔ اس لئے معاملہ پٹ جائے گا۔ چنانچہ اُس نے عشرت سے دوستی کرلی۔ اور اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اُسے سیٹھ بیتال بھائی بانکڑیا کے راج محل سٹوڈیو میں لے جائے گا۔ اور اسے اپنے دوست جوشی ڈائریکٹر سے ملا دے گا۔

"مگر تمہارے پاس کیا سٹیل ہیں؟" کھنہ نے کہا۔

"سٹیل کیا ہوئے ہیں" عشرت نے گھبرا کے پوچھا۔

"تمہاری تصویریں میک اَپ کے ساتھ روشنی اور زاویئے کے دلچسپ امتزاج انسان کی صورت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں اور تم تو یوں بھی اچھے خاصے ہیرو نظر آتے ہو۔ پوری فلم انڈسٹری میں تمہاری ایسی شخصیت مجھے تو کسی دوسرے ہیرو کی نظر نہیں آتی۔ سٹیل کھچوانے میں پچاس روپے لگیں گے۔ میں خود کھینچوں گا۔"

عشرت کچھ تصویریں اپنے ساتھ لایا تھا۔ کھنہ نے اُنہیں دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ رئیس گنج کے ماہر فوٹوگرافنگ بال کے فوٹو یہاں نہیں چلیں گے۔ جن میں تم چیتے کی کھال پر کرسی رکھ کے یوں ٹیک کے بیٹھے ہو جیسے تمہیں سچ مچ بواسیر ہے۔"

عشرت ہنسا اور اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کے کھنہ کو دے دئے۔ کھنہ نے گذشتہ تین مہینے سے ہوٹل کا بل نہیں دیا تھا۔ اس لئے۔ اور پھر کھنہ نے عشرت کو جوشی جی سے ملا دیا۔ اور اس طرح ایک ہفتہ میں اس سے ڈیڑھ دو سو روپے اور کھینچ لئے۔ اس کا ایک سوٹ گروی رکھوا دیا دو قمیص مانگ لیں ایک جوتا پہن لیا۔ اور جب عشرت کے پاس کچھ نہ رہا۔ اور جب منیجر نے عشرت کا سامان ہوٹل سے باہر پھینک دیا۔ تو کھنہ صاحب عشرت کی طرف سے یوں غافل ہو گئے اور اس طرح اُدھ مُندی آنکھوں سے عشرت کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہیں موتیا بند کی شکایت ہو۔

جب عشرت ہوٹل سے باہر نکلا۔ تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ زندگی میں پہلی بار اُسے کوئی آدمی ایسا بھی ملا تھا جس نے اس کی خوب صورتی کی رتی بھر پرواہ نہیں کی تھی جس نے ایک مشاق جیب کترے کی نگاہوں سے اُسے چاروں طرف سے ٹٹول ٹٹول کر اُسے اچھی طرح سے الٹا پلٹا کے چھان پھٹک کے خالی کر دیا تھا۔۔۔۔

یکایک عشرت کو معلوم ہوا کہ وہ اس شہر میں بالکل اکیلا ہے۔ اس کی جیبیں آستینوں سے

باہر لٹک رہی ہیں اور ساری دُنیا اسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

وہ رات اس نے بامبے سینٹرل سٹیشن کے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں جاگتے گزاری۔ صبح ہوتے ہی اس نے راج محل سٹوڈیو کا رُخ کیا۔ کیونکہ جوشی ڈائریکٹر نے اس کا فلم ٹسٹ لینے کا وعدہ کیا تھا۔

اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوا، تو۔۔۔ اور عشرت سوچنے لگا کہ پھر وہ اپنا نام کیا رکھے گا۔ اور پھر اس کے ذہن میں ایک بادامی رنگ کی بیوک کار زناٹے سے گزر گئی۔ یہ بیوک وہ خود چلا رہا تھا۔ تاج میں بلوری فانوس روشن تھے۔ اور وہ ایک شفاف شفان کی ساری میں تھرتھراتی ہوئی تتلی کے ساتھ رقص کر رہا تھا

جوشی نے کہا "عشرت مسکراؤ۔"

عشرت صبح سے بھوکا تھا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کونین پینے کے بعد مسکرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ارے بھائی تمہارے سامنے ایک خوبصورت لڑکی کھڑی ہے۔ بتاؤ کیسے مسکراؤ گے؟" جوشی نے پوچھا۔

عشرت نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

"باپ رے!" جوشی بڑے زور سے غصے میں چلایا۔ پھر اس نے کہا۔

"اچھا ہنسو۔"

"ہی۔ ہی۔ ہی۔" عشرت ہنسا۔

اُسے اپنی ہنسی بڑی کھوکھلی معلوم ہوئی۔

"گدھا!" جوشی پھر چیخا۔ "اچھا اب رو کر بھی دکھاؤ۔ میرا مطلب ہے۔ چہرہ اداس، آنکھوں میں آنسو، ہونٹ کانپتے ہوئے۔ چہرہ محبت کی حرماں نصیبی کی زندہ تصویر۔"

عشرت نے پھر کوشش کی۔ اُسے خود معلوم ہو رہا تھا کہ اس کوشش میں اس کا چہرہ بہت بھیانک

معلوم ہو رہا ہوگا۔

یکایک وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

"کٹ! کٹ!" جوشی نے غصے میں کہا "آجاتے ہیں رئیس گنج سے ہیرو بننے۔ کم بخت ایکٹنگ کی دُم سے واقف نہیں۔ گیٹ آؤٹ!"

گیٹ آؤٹ۔ ہو کے عشرت بڑی بے دلی سے راج محل کی سٹیج نمبر دو کے باہر پُرانے فرنیچر، پھٹے ہوئے پردوں، ٹاٹ کے بوریوں، لکڑی کی کھپچیوں مولڈنگ کے ٹکڑوں اور پلاسٹر کے پُرانے شکستہ بتوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے نٹ راج کا ٹوٹا ہوا مجسمہ تھا راج ترنگی کا بازو گنیش کی سونڈ پر پڑا تھا۔ اور سندی بیل کا بت ایک صراحی سے اپنا منہ لگائے ہوئے تھا عشرت لے سوچا لب وہ کیا کرے۔ سکندر واپس مقدونیہ چلا جائے۔ کہ خودکشی کرے۔ کہ ماں کو تار دے کے روپے منگانے کی کوشش کرے۔ کہ فاقہ مستی میں کوشش کرتا رہے۔ عشرت زندگی میں آج تک بھوکا نہ رہا تھا۔ اس لئے آج اس کا جی رونے کو چاہ رہا تھا۔ یکایک اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"اُجاڑ یہاں کیوں بیٹھے ہو جی؟"

عشرت نے سر اُٹھا کے دیکھا۔ سامنے مارواڑی رقاصہ کا لباس پہنے عمدہ میک اپ کئے ہوئے ایک جوان لڑکی اپنے ہونٹوں کو بڑی نخوت سے سکوڑتے ہوئے اُسی سے کہہ رہی تھی۔

یہ رفیعہ تھی "ساری" کہہ کے وہاں سے عشرت اُٹھ کھڑا ہوا، اور چلنے لگا۔

"لو!" رفیعہ بڑی حیرت سے بولی "میں نے ذرا دھمکایا تو اُٹھ کے چلنے لگے۔ ارے ایسے میں تمہارا کیسے گزر ہوگا۔ نئے معلوم ہوتے ہو" رفیعہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

عشرت بھی ہنسا۔

وہ دونوں پلاسٹک کے بتوں پر بیٹھ گئے۔ رفیعہ نے اپنا نام بتایا۔ وہ آج چتو بھی

منو بھائی کی شوٹنگ میں آئی تھی۔ ڈانس کے لئے۔ اس کی ایک ماں ہے۔ ایک بہن تھی سو مرگئی۔ پانچ بچے چھوڑ گئی۔ وہ ان پانچ بچوں کو پالتی ہے۔ بھنڈی بازار میں ایک چھوٹی کھولی میں رہتی ہے۔

"تم کہاں رہتے ہو کیا کام کرتے ہو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟"

عشرت نے سب بتایا۔ بتاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اُجاڑ! مرد ہو کر روتے ہو" رفیعہ غصّے سے بولی "چلو میرے ساتھ گھر پر۔۔۔"

عشرت اُٹھا۔

"لو یہ ابھی سے چلنے لگے؟ ارے ابھی نہیں شوٹنگ کے بعد چلیں گے۔ ساڑھے چھ بجے میٹیوں میں ابھی جاتی ہوں۔ شاٹ ہونے والا ہے۔"

رفیعہ کی کھولی میں روشنی بہت کم تھی۔ کالونچ بہت زیادہ تھی۔ رفیعہ کی ماں کے خاکستری مائل چہرے پر دُکھوں کے اَن گنت نشان تھے۔ اس کی ٹھوڑی ایک پنڈولم کی طرح ہر وقت آہستہ آہستہ حرکت کرتی رہتی تھی۔ اُس نے ایسی تُستی ہوئی نگاہوں سے عشرت کی طرف دیکھا۔ جیسے دنیا میں کوئی اجنبی نہیں ہے۔ اور کوئی دوست نہیں ہے۔ کوئی نیا نہیں ہے۔ کوئی پُرانا نہیں ہے۔ کسی کے آنے کی خوشی نہیں ہے۔ کسی کے جانے کا غم نہیں ہے۔ جتنے آنسو تھے وہ سب خشک ہو چکے۔ اور جتنے تبسم تھے وہ سب مرچکے۔ بس ایک پنڈولم ہے۔ جو ایک ہی مقررہ رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ موت سے زندگی کی طرف اور زندگی سے موت کی طرف ایسی ٹھہری، رُکی ہوئی، جامد و ساکت نگاہ تھی۔ اس بوڑھی عورت کی کہ عشرت کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی گھر میں نہیں۔ کسی برف خانے میں چلا آیا ہے۔ اس کے سارے جسم میں ایک جُھرجُھری سی آئی اور اُسے ایک لمحہ کے لئے کانپتا چھوڑ گئی۔

رفیعہ عشرت کو ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے گئی "تو کیا چپ کھڑے ہو۔ شرمائی ہوئی پٹی (لڑکی) کی طرح اب بیٹھ جاؤ۔ یہیں زمین پر بیٹھ جاؤ۔ ہم لوگ یہیں زمین پہ بیٹھتے ہیں۔ یہیں زمین پر سوتے ہیں" کھولی

کے ایک کونے میں نل تھا۔ رضیہ گماں کی نیکر اُتار کر وہاں دھونے کے لئے چلی گئی۔ بڑی ماں نے ہنڈیا میں چاول ڈالے۔ عشرت کرسی پر بیٹھ گیا۔ زمین پر پیاز کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ ایک چھلکا اُٹھا کے میدہ نے عشرت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم فلم میں کام کرتے ہو؟"

"ہاں" عشرت نے کہا۔

عشرت رات سے بھوکا تھا۔ اسی لئے بار بار اُبلتی ہوئی ہانڈی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی ماں نے آلوؤں کے ٹکڑے کاٹ کے ہانڈی میں ڈال دئے۔ پہلے چاول ڈالے جا چکے تھے۔ جب نمک کے بعد ہلدی ڈالی گئی۔ تو ہانڈی میں بڑا مزے دار اُبال آیا۔ سوندھا سوندھا۔ پیلا پیلا۔ جھاگوں والا سوں سوں کرتا ہوا اُبال، عشرت کی آنتیں اندر سے کھنچنے لگیں۔ اس کی نگاہیں ہانڈی پر جم گئی تھیں۔ یکایک اُس نے دیکھا۔ اُن پانچ بچوں کی نگاہیں بھی اس ہانڈی پر جمی تھیں: نگاہیں گرسنہ، منہ میں پانی گردن کا حلقوں نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے جاتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ موت سے زندگی کی طرف، زندگی سے موت کی طرف۔

ہانڈی کب اُتاری گئی۔ کب چاول بانٹے گئے کس طرح ہاتھ چھپٹے۔ کس طرح جبڑے ہلے اور نوالے اُترے۔ عشرت کو اور دوسرے بچوں کو کوئی علم نہ تھا بس ایک بھوک تھی جو ایک خون آشام چمگادڑ کی طرح رات کے تاریک سایوں کی طرح ان کی روح پر اُن کے ہوش و حواس پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور جب چمگادڑ نے اپنا خون پی لیا تو وہ سب نڈھال ہو کر وہیں فرش پر جانوروں کی طرح سو گئے۔ اور آلوؤں اور پیاز کے چھلکوں اور خاک میں سنے ہوئے چاول کے چند دانوں کو اُٹھا کر رضیہ نے کھڑکی کے باہر پھینکتے ہوئے دیکھا کہ باہر بازار میں دوکانوں پر خوب صورت کتابیں رکھی ہیں۔ اور ڈوریوں پر انگور کے گچھے لٹک رہے ہیں۔ کپڑے والے کی دوکان پر خوش پوش عورتیں ریشم کی ساڑیاں خرید رہی ہیں۔ اور رستوران سے مصالحے دار شامی کبابوں کی خوش بو اُٹھ رہی ہے اور رضیہ نے سوچا کہ بازار

یں کتابیں بک رہی ہیں۔ لیکن اس کی بہن کے بچے اَن پڑھ ہیں۔ وہ اخبار بیچتے ہیں پڑھ نہیں سکتے۔ اور ڈوریوں پر لٹکے ہوئے انگور گھٹے ہیں اور ریشم بہت مہنگا ہے۔ اور شامی کبابوں کی خوشبو بہت دُور ہے ایک آہ کے ساتھ اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کردی اور فرش پر پاؤں پھیلا کے لیٹ گئی۔ فرش ٹھنڈا تھا اور اس کے جسم کا ہر انگ دِن بھر کی شوٹنگ کی مشقت سے ٹوٹ رہا تھا۔

رضیہ نے کہا " میری بہن کا خاوند بھی بمبئی تمہاری طرح آیا تھا، ہیرو بننے کے لئے آخر خودکشی کر کے مرگیا اس کے غم میں میری بہن تپ دق سے مرگئی۔ آج تم جب سٹوڈیو میں کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھے تھے تو مجھے تمہارا ارادہ نیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔"

عشرت نے اداس ہو کے کہا " کیسی کیسی اُمیدیں لے کے آیا تھا۔"

" کوئی اُمید ایک دم پوری نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر تم محنت کے لئے تیار نہیں ہو تو واپس اپنی ماں کی گود میں لوٹ جاؤ۔" رضیہ نے طنزاً کہا۔

" میں واپس نہیں جاؤں گا۔" عشرت نے جواب دیا۔

" تو پھر کیا کرو گے ؟"

" تمہاری طرح ایکسٹرا بن کر کام کروں گا۔ تمہاری ایکسٹرا انجمن کا ممبر بن جاؤں گا۔ کل مجھے ایک کارڈ بنوا دو، ممبری کا۔ سُنا ہے اُس کارڈ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

" اور ہیرو نہیں بنو گے ؟" رضیہ نے پوچھا۔

عشرت چُپ ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کروٹ بدل کے سو گیا۔

دوسرے دِن رضیہ عشرت کو لے کر رضیہ کے گھر گئی۔ جومرن پورہ کی ایک گلی میں ایک لرائی

رستوران کے اوپر واقع تھا۔ رضیہ کی ماں اپنا پیٹی کوٹ گھٹنوں سے اُوپر کیے سو رہی تھی رضیہ کا بھائی جو ایک موٹر ورک شاپ میں مکینک کا کام سیکھ رہا تھا۔ ایک کھڑکی میں بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ رضیہ دانت صاف کر رہی تھی۔

رضیہ نے عشرت کو رضیہ سے ملایا۔ رضیہ اُسے دیکھ کر مسکرائی۔ پھر ہنسی۔ پھر خوب زور سے ہنسی عشرت کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

رضیہ نے رفعیہ کو گلے لگاتے کہا "ہائے کس قدر سویٹ ہے۔ بالکل گڈّو سا معلوم ہوتا ہے۔ میں تو اگر اپنے دلدار کو نہ چاہتی۔ تو اُسے چاہنے لگتی۔ فنا ہو جاتی۔ بلکہ . . . "

واقعی عشرت کی خوبصورتی میں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ پہلی ہی نظر میں اکثر لڑکیاں اُس پر فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ اس کی خوب صورتی میں مردانہ وقار کے علاوہ ایک عجیب طرح کا بھولپن معصومیت سی تھی جو نظر نہیں آتی مگر معلوم ہوتی تھی۔ اور جب وہ اپنی موٹی موٹی پلکیں اُٹھا کر ترچھی نگاہوں سے کسی لڑکی کی طرف ایک عجیب بے بس سی ادا سے دیکھتا تھا تو وہ لڑکی بقول رضیہ وہیں "فنا" ہو جاتی تھی اس وقت بھی عشرت نے کچھ ایسی ہی نگاہ سے رضیہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی نگاہ عورت میں مامتا کے ایسے شدید جذبات پیدا کر دیتی تھی کہ اکثر لڑکیاں اُسے بیک وقت محبوبہ کے اور مامتا کے ملے جلے جذبات سے چاہنے لگیں اور اس قسم کی چاہت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ رضیہ کو نہیں معلوم تھا، مگر رضیہ جانتی تھی اور ایک ہی نگاہ میں اس نے جان لیا تھا۔ کہ عشرت کا حسن کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"اری! تو کہاں پھنس گئی"۔ اس نے رضیہ سے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں"۔ رضیہ اس کے شانے پر ہاتھ مار کے سرگوشی میں بولی "موئی، اجاڑ، ماٹی ملی۔ بات نہیں سنتی۔ اپنی کہے جاتی ہے، بے چارہ ـــــــــ"

رضیہ نے عشرت کی طرف اشارہ کیا "شریف خاندان کا ہے۔ بے کار ہے۔ گھر سے بھاگ کے بمبئی میں

ہیرو بننے کے لئے آیا تھا۔ اب اس کا دماغ ٹھکانے آگیا ہے۔ ظلم ایکسٹرا یونین میں تم اسے ممبر بنوا دو۔ ٹھاکر گجراج تمہاری بات سن لیتے ہیں؟"

ہاں۔ مگر یونین میں پہلے ہی سے پانچ ہزار ممبر ہیں؟" رضیہ نے اعتراض کیا۔

"ایک اور سہی۔ اُردو تو اس کی مادری زبان ہے۔ بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ درجہ اول کا کارڈ اسے مل جائے گا۔ اپنی روٹی کما کھائے گا؟"

"اور کارڈ کی فیس پندرہ روپے؟"

رضیہ بولی "پانچ میرے پاس ہیں۔ دس تو ڈال دے؟"

"فنا ہوگئی تو" رضیہ مسکرا کے بولی "اری پگلی۔ اگر اس طرح سے تو اس پر خرچ کرے گی۔ تو بالکل مرجائے گی۔ یہ تو تجھے کچا کھا جائے گا۔ اس کی خوب صورتی پر نہ جا۔ رقو؟"

"چل ہٹ کمینی . . . ؟" رفیعہ جھنجھلا کے بولی "تجھے تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہے؟"

"میں بھی تو از راہِ انسانیت کہہ رہی ہوں؟"

"تو بس ٹھیک ہے۔ انسانیت تک رہنا کہیں محبت تک نہ پہنچ جانا۔ ورنہ انجام برا ہوگا؟" رضیہ نے سمجھایا۔

"اچھا اب چلے گی بھی کہ باتیں بنائے گی؟"

"ذرا تیار ہولوں؟" رضیہ بولی۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے میں رضیہ تیار ہوئی۔ اس کا سنہرا رنگ سبز ساڑی میں اور بھی نکھر آیا تھا بالوں کے لچھے جو سر کے اوپر سے سینے پہ آئے تھے۔ اس کے شانوں پر پہنچ کر سنہرے جوڑوں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ لب اسٹک کی چھاپ بہت گہری تھی۔ یاقوت سے بھی گہری۔ سُرخ کچھ کچھ کاسنی رنگ۔

اس میں جھلکتا تھا جس سے رضیہ کے لب بڑے زہریلے معلوم ہوتے تھے۔ رضیہ اپنے لبوں کی وجہ سے بیج خطرناک حد تک دل کش سمجھی جاتی تھی۔

فلم ایکسٹرا یونین کے دفتر میں پہنچ کر جو دادر میں روڈ پر واقع تھا۔ رضیہ عشرت اور رضیہ کو نے کریمی یونین کے صدر کے دفتر میں گھس گئی۔

ایکسٹرا یونین کا صدر مختار گجراج سنگھ تھا۔ گجراج سنگھ کانگرسی تھا۔ اور کھدر پہنتا تھا۔ اور سماجی فلموں کا ہیرو بھی رہ چکا تھا۔ مگر کھدر پہننے والے باغیانہ سیاسی خیالات رکھنے والے ہیرو کی قدر اس ماحول میں کہاں ہوتی۔ جو اپنے رکھ رکھاؤ میں۔ طرز معاشرت میں، لباس میں، فرنیچر میں، ہیلیٹی میں، زندگی کے ہر شعبے میں ہالی ووڈ کی نقل کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گجراج سنگھ آہستہ آہستہ سماجی فلموں میں غیر مقبول سا ہوتا گیا۔ شراب سے، رنڈی بازی سے، غیبت سے۔ مردفن سے، یعنی ان تمام باتوں سے گجراج سنگھ کو نفرت تھی جن سے فلم انڈسٹری کا ماحول متاثر تھا۔ مجبور ہو کر گجراج سنگھ کو دھارمک فلموں میں آنا پڑا۔ جہاں پیسے بہت کم ملتے تھے۔ یہاں بھی اپنی افتاد طبع سے مجبور ہو کے وہ زیادہ دیر تک نہ ٹک سکا۔ اور دھیرے دھیرے بے کار ہوتا گیا۔ اب گذشتہ تین چار سال سے اسے کسی فلم میں ہیرو کا کام نہیں مل رہا تھا اس سے پہلے تو نہیں۔ لیکن اپنی بے کاری کے دنوں میں اُسے ایکسٹرا لوگوں کی یونین بنانے کا خیال آیا۔ جب وہ خود حالات سے مجبور ہو کر تقریباً ایکسٹرا سا ہو کے رہ گیا۔ تو اسے ان لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ جو تعداد میں ہزاروں تھے۔ مگر غیر منظم بلکہ قطعی طور پر نراجی حالت میں تھے یہ لوگ سٹوڈیو در سٹوڈیو گھومتے تھے۔ اور ایکسٹرا سپلائر لوگوں کے گھروں پر چکر لگاتے تھے۔ کام کے لئے۔ نہ اُن کا کوئی ریٹ بندھا ہوا تھا نہ ان کی کوئی عزت مقرر تھی۔ ایک ایکسٹرا سپلائر گویا ایک طرح ان کی جان و مال اور عزت کا ٹھیکہ دار تھا۔ ایک فلم کمپنی ایک ایکسٹرا سپلائر کو فلم کے دوران میں ایکسٹرا لوگوں کو سپلائی کرنے کا ٹھیکہ دے دیتی اور پھر سپلائر اپنی مرضی سے اپنا ریٹ لگا کے اُن لوگوں

کو کام دیتا کمپنی سے پندرہ روپے فی ایکسٹرا لیتا۔ اور سات روپے ادھر بانٹتا کسی کو سات دیتا۔ کسی کو پانچ کسی کو دو روپے پر ہی ٹرخا دیتا۔ اور ایکسٹرا عورتوں کی تو اور بھی بُری حالت تھی۔ انہیں کام کرنے کے علاوہ اپنی عزت بھی سپلائی کرنی پڑتی تھی۔ ایک ایک ایکسٹرا سپلائر نے درجنوں آشنائیں پال رکھی تھیں جیسے ڈربے خانے میں مرغیاں پالی جاتی ہیں۔ کبھی ایک کی آشنا غلطی سے یا غصّے میں کڑکڑاتی ہوئی کسی دوسرے ایکسٹرا سپلائر کے پاس چلی جاتی۔ تو دادر مین روڈ پر دنگا شروع ہو جاتا۔ چھریاں اور چاقو چلنے لگتے۔ جس میں ایک ایکسٹرا سپلائر کا گروہ دوسرے سپلائر کے گروہ پر مشتمل ہو کر حملہ کر دیتا۔ پولیس آجاتی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوتا۔

دادر مین روڈ کی بہار ان ایکسٹرا لوگوں سے تھی۔ اس سڑک پر چار سٹوڈیو تھے ایک چھوٹے چھوٹے کیبنوں والا قومی ہوٹل تھا۔ ایک مسجد تھی ایک شراب خانہ تھا، مسجد کے زیرِ سایہ نہ تھا کچھ پان کی دوکانیں تھیں کچھ لانڈریاں، درزیوں کی دوکانیں تھیں۔ باقی سب رستوران تھے اور پنجابی تندور تھے۔ اور سب کے سب میلے کچیلے گندے غلیظ۔ ہر دوکان دار ایکسٹرا لوگوں کو اُدھار دیتا تھا اور یہاں بور ادھنداؔ اُدھار پر چلتا تھا۔ پان کے بیڑے سے شراب کی بوتل تک ہر چیز کوپن سے ملتی تھی۔ اور اکثر اوقات جب کوئی ایکسٹرا بھاگ جاتا۔ یا ایکسٹرا سپلائر دیوالیہ ہو جاتا۔ تو دوکان دار کے ہاتھ میں صرف کوپن ہی کوپن رہ جاتے۔ ان دوکانوں کے اوپر کے کمروں میں مختلف فلم کمپنیوں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ دی گریٹ لدھیانہ فلم کمپنی۔ سردار جگت سنگھ الووالیہ کی کمپنی تھی۔ جنہوں نے جنگ کے دوران میں لکڑی کو گمی سپلائی کر کے ایک چھوٹے سے ٹھیکے میں چالیس ہزار کمائے تھے۔ اور اب وہ چالیس ہزار سے ایک فلم کمپنی کھولے ہوئے تھے۔

"روپ چترا" کھنو کے کوئی تیواری جی کھولے ہوئے تھے۔ جن کا باپ مرتے مرتے ان کے لئے ایک مکان چھوڑ گیا تھا۔ تیواری جی اس مکان کو بیس ہزار میں ٹھکانے لگا کے بمبئی آگئے تھے۔ اب یہ

بیر، ہزار بھی ٹھکانے لگ گیا تھا۔ لیکن اس دوران میں انہوں نے ایک فلمی رقاصہ، کنول سے آشنائی پیدا کرلی تھی۔ کنول کے پاس دس ہزار نقد تھا۔ جسے اب وہ ٹھکانے لگانے کی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے کمپنی کے لئے ایک نئی تختی پر لکھنے کو دیا تھا "کنول چترا" دادر مین روڈ پر تختیاں بدلتی رہتی ہیں۔ اور جس تیزی سے فلم کمپنی کی تختیاں بدلتی ہیں۔ اس سے ذرا کم تیزی پر نیچے دکانوں کی تختیاں بدلتی تھیں۔ مگر بدلتی ضرور تھیں۔ کیوں کہ پورے کا پورا بازار فلم انڈسٹری پر زندہ تھا۔ اس لئے اس کی سچی معاشرت اس کے صحیح سماجی نقطۂ نگاہ۔ اور اس کے پورے سماجی، مالی اور جنسی ماحول کی عکاسی کرتا تھا۔ دادر مین روڈ پر کھڑے ہو کر آپ آدھے گھنٹے میں دیکھ سکتے تھے کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کی کیا حالت ہے۔ حالانکہ اس کے سٹوڈیو دری۔ دادر اور مالابار ہل سے لے کر ملاڈ تک میلوں دور تک پھیلے ہوئے تھے مگر دادر مین روڈ کے اس آدھے فرلانگ کے فاصلے میں آپ اس میلوں دور پھیلی ہوئی حقیقت کو ایک جگہ دیکھ سکتے تھے۔

بہت آہستہ سے۔ بہت ہی دھیرے دھیرے سے۔ بڑے صبر اور استقلال سے اور کئی ایک ناکامیوں کے بعد گجراج نے ایکسٹرا لوگوں کی یونین بنائی تھی۔ شروع شروع میں اسے بہت سی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایکسٹرا سپلائر لوگوں کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی۔ کئی لوگوں نے اُسے جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی۔ اس پر دو ایک بار چاقو سے حملہ بھی کیا گیا۔ مگر گجراج بڑی خندہ پیشانی سے سب کچھ سہتا گیا۔ ٹھیک ہے، اپنے کام میں اُسے مفاہمت کرنا پڑی۔ اپنے اصولوں سے بہت ہٹ کے یہ یونین بنانی پڑی۔ کیوں کہ یہ ورکرز کی صحیح یونین نہ تھی۔ اس میں ایکسٹرا سپلائر لوگ بھی شریک تھے۔ اس طرح سے کہ گو ایکسٹرا لوگ یونین کے کارڈ پر فلم کمپنیوں میں جاتے تھے۔ گو اُن کے ریٹ بھی بندھ گئے تھے۔ مگر اب بھی وہ ایکسٹرا سپلائر کی معرفت ہی جاتے تھے۔ اور سٹوڈیو والے اور فلم کمپنیوں والے اب بھی ایکسٹرا لوگوں کا معاوضہ سپلائر ہی کو ادا کرتے تھے۔ ٹھیک ہے۔ سپلائر لوگوں کا کمیشن اب بھی اُن کے ریٹ کی طرح بندھ گیا تھا۔ مگر چونکہ رقم کمپنی سے سپلائر کو ادا ہوتی تھی۔ اس کا پلہ ہمیشہ

بھاری رہتا۔ وہ کبھی کہتا۔ رقم نہیں ملی کبھی کہتا کم ملی ہے کبھی کہتا اتنے لے جاؤ۔ اِتنے گئے۔ لیتے ہو تو لے جاؤ نہیں تو یہ بھی گئے۔ اور عورتیں؟ جو نورِ نظر تھیں۔ وہ تو کچھ بہتر حالت میں تھیں اور جو رفعیہ کی طرح دُھن کے کارڈ پر بھروسہ کرتی تھیں وہ دھکے کھاتی تھیں۔

اور سپلائر لوگ اور کمپنی کے لوگ اور سٹوڈیو کے لوگ یعنی سب لوگ اُن سے ناخوش رہتے تھے۔ اور بھی ٹھیک بھی ہے۔ بے عقل، بے دماغ، بے وقوف بکری جیسے لوگ عورت کہتے ہیں۔ آخر کس لئے ہے؟

گجراج سنگھ کو ان تمام خامیوں کا پتہ تھا۔ مگر وہ کہتا "دیکھو، اِتنا تو ہوا، اب ہولے ہولے اس سے آگے بھی کچھ ہو جائے گا۔ ایک دن میں تو بمبئی نہیں بسی تھی۔ ایک دن میں تو رام نے بھی سیتا کو راون سے نہیں جیت لیا تھا۔ پھر ـــــــ میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔"

گجراج نے رضیہ کو دفتر کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا۔ اور اُسے کاغذ کا ایک پرزہ دکھا کے کہنے لگا۔ "ایک اور کمپنی تیرے ہاتھ سے گئی۔"

"کیا ہوا؟" رضیہ بڑے مطمئن لہجے میں بولی۔

"یہ چندا فلم پروڈکشن والوں کی طرف سے نوٹس آیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اُن کی کمپنی میں ایکسٹرا لوگوں کو بھیجتے وقت رضیہ کو کبھی بھرتی نہ کیا جائے۔"

رضیہ مسکرائی۔ اب تک کوئی پندرہ کمپنیاں اُسے اپنی بلیک لسٹ پر رکھ چکی تھیں۔ گجراج نے رضیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تو ایسا کیوں کرتی ہے رضیہ؟"

مگر رضیہ کیا بُرا کرتی تھی۔ وہ یہی کرتی تھی نا۔ کہ جب کبھی اُسے کسی فلم کمپنی میں کام ملتا۔ اور چونکہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس لئے اُسے جلدی کام مل جاتا۔ اور پھر ڈائریکٹر اُسے انتخاب کرتے ہوئے الگ سے اپنے کمرے میں بلا کر اُسے ایک بہت عمدہ۔ بہت اچھا یعنی بس ہیروئن سے کچھ ہی کم درجے کا رول دینے کا وعدہ کرتے۔ اگر! اور اب اس "اگر" کے تو وہی جواب ہو سکتے تھے۔ یعنی ایک تو جوتا

اونچی ایڑی والا۔ ورنہ جومُو ... جومُو کا ایک ہوٹل! اب رضیہ کی یہ چالاکی تھی۔ کہ اس نے ایک تیسرا رستہ ڈھونڈھ نکالا تھا یعنی نہ وہ جوتا مارتی۔ نہ جو ہو پر جاتی۔ بلکہ جانے کا صرف وعدہ کرلیتی اور کام حاصل کرلیتی۔ اور اس کے بعد دیر تک مصیبت کو ٹالتی رہتی اور جب مصیبت بالکل مصیبت بن کر سامنے کھڑی ہو جاتی تو صاف انکار کردیتی۔ اس صورت میں لوگ بہت برہم ہوتے تھے۔ وہ لوگ اس کا پارٹ تصویر سے کاٹ دیتے۔ اس کا کنٹریکٹ کینسل کردیتے۔ مگر رضیہ کو ان باتوں کی پروا نہ تھی۔ کیوں کہ جب تک وہ کافی روپیہ اُدھر سے کھینچ چکی ہوتی۔ اس لئے تو اس کے پاس ——— حالانکہ وہ بہت کم تصویروں میں نظر آتی تھی۔ اس کے پاس عمدہ کپڑے تھے۔ اچھے زیور تھے۔ طلائی گھڑی تھی۔ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ ایک دلدار تھا۔ جس پر وہ سو جان سے فدا تھی۔ اور جس سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی ——— اب اگر رضیہ یہ نہ کرے تو کیا کرے۔ وہ رقعیہ کی طرح لٹھ مار ہوتی تو اب تک بھوکی مرجاتی۔

رضیہ نے اپنے ہونٹ بڑی نفرت اور حقارت سے ملا کے کہا۔ "ہونہہ۔ بہت سی فلم کمپنیاں پڑی ہیں گجراج سنگھ جی اور جب پُرانی فلم کمپنیاں بند ہوجائیں گی۔ تو اُن کی جگہ نئی فلم کمپنیاں آجائیں گی۔ آتی ہی رہتی ہیں۔ کتنی کمپنیاں مجھے بلیک لسٹ پر لائیں گی۔ ذرا سوچو تو۔ گجراج جی۔ کوئی تین چار سو فلم کمپنیاں ہوں گی ——— ارے جب تک تو میں بوڑھی ہوجاؤں گی"

گجراج نے کہا۔ "مگر تو یہ چار سو میں کیوں کرتی ہے؟"

رضیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ایسوں کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے۔ ٹھاکر جی، تم تو بڑے بھولے ہو۔ اچھا چھوڑو یہ کھٹ راگ اور رقعیہ کے ... کو ایکسٹرا یونین میں بھرتی کردو"

"مگر" گجراج سنگھ نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر رضیہ نے اس کی میز پر سے ایک خالی کارڈ اُٹھا کے عشرت کو دے دیا۔ اور کہا۔

"جلدی سے اسے بھر دو"

پھر وہ گجراج سنگھ سے مخاطب ہو کے بولی: "یہ اپنے پندرہ روپے۔ لڑکا خوب صورت ہے۔ گریجویٹ ہے۔ اُردو اس کی مادری زبان ہے۔ اوّل درجے کا کارڈ بنا دو۔ تمہیں زندگی بھر دُعا دے گا"

کارڈ لے کے عشرت باہر نکلا۔ تو رضیہ نے اس کا تعارف دو چار دوسرے ایکسٹرا بھائیوں سے کرا دیا۔ اور پھر مڑ کے رضیہ سے کہنے لگی "وہ نو بہار پروڈکشن والوں نے بلایا ہے۔ انہیں ڈانس کی کچھ لڑکیاں چاہئیں۔ چلو"

رضیہ نے عشرت سے کہا: "میں چلتی ہوں۔ اب تم خود گھر آ جاؤ گے نا؟"

"ہاں!"

رضیہ جب چلنے لگی۔ تو عشرت اُس کے پیچھے دوڑا دوڑا گیا۔ رضیہ نے پوچھا "کیا بات ہے؟" بجائے عشرت خاموش کھڑا رہ گیا۔ رضیہ نے پھر پوچھا "کیوں بولو۔ کیا بات ہے؟" بڑی مشکل سے عشرت نے کہا: "وہ بس کا کرایہ"

رضیہ نے عشرت کو ایک اٹھنی دی "اٹھنی" دیتے ہوئے رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "بے چارہ!"

بعد میں بس میں بیٹھ کر نو بہار پروڈکشن کی طرف جاتے ہوئے رضیہ نے رفیعہ سے کہا "کمبخت پر زیادہ ترس نہ کھایا کر۔ مر جائے گی"

"کیا کروں" رضیہ بولی "مجھے بے چارے پر بڑا رحم آتا ہے"

رات کو جب رضیہ ڈانس کی ریہرسل کے بعد گھر لوٹی تو عشرت ابھی تک آیا نہ تھا۔ حالانکہ گیارہ بج چکے تھے۔ رضیہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ کہاں گیا۔ بمبئی میں نو وارد ہے۔ گیا ہو۔ مگر ایسا بچہ بھی نہیں۔ پھر اُس کے دل میں رضیہ کی باتیں گھومنے لگیں۔ عجیب عجیب طرح۔

وسوسے اور شبہے دل میں آنے لگے۔ رضیہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ ان مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ رفعیہ فرش پر لیٹی اپنے کمرے میں انتظار کرتی رہی۔ ایک کونے میں اس نے عشرت کے لئے تکیہ اور چادر بچھا دی تھی۔ فرش کو خوب جھاڑو سے صاف کیا تھا۔ ڈبے میں اس کا کھانا بند کر کے رکھ دیا تھا۔ اماں کو روشنی میں نیند نہیں آتی۔ اس لئے اس نے بتی گل کر دی تھی۔ مگر رفعیہ کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ بھلا نیند کیوں نہیں آتی۔ وہ کیوں ایک اجنبی کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ کون ہوتا ہے اُس کا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتی اس کے متعلق۔ جاننے سے کیا ہوتا ہے۔ اسے اپنے متعلق اتنا کچھ معلوم تھا۔ ایک شریف مسلم گھرانے کی بیٹی۔ باپ چھوٹا سا جاگیردار۔ گھر میں ایک موٹر۔ ابا کے ہاں لڑکا کوئی نہ تھا۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی جو بیاہ دی گئی۔ پھر بہت مدت کے بعد رفعیہ ہوئی۔ مگر ابا نے مجھے لڑکا ہی سمجھا۔ ہمیشہ لڑکوں کی طرح ہی رکھا۔ قمیص میں اور پاجامے میں اور ترکی ٹوپی میں۔ مجھ سے مردوں کی طرح باتیں کرائیں۔ پھر ابا مر گئے۔ وہ موٹر بھی چلی گئی۔ وہ مکان بھی چلا گیا پھر بڑی بہن کا شوہر مر گیا اور اماں رفعیہ کو اور بڑی بہن کے پانچ بچوں کو لے کر حیدر گوڑہ کے ایک چھوٹے سے غلیظ مکان میں چلی آئیں جس کے آنگن میں جام کا ایک پیڑ تھا۔ اماں نے ایک بہت ہی خوب صورت مرد سے رفعیہ کی شادی کر دی۔ اسلم آٹھویں فیل تھا۔ اور ایک بڈھے جاگیردار کا لڑکا تھا۔ اچھا ہے، شادی اپنے خاندان میں ہوئی۔ لڑکا اپنے خاندان کا ہے، گو آوارہ ہے۔ بدچلن ہے۔ اور بے کار ہے۔ مگر ہے تو اپنے خاندان کا۔ خاندان کی عزت رہ گئی۔ اماں نے بڑا شکر ادا کیا اور کیسی کیسی دُعا کی ہے۔ اللہ اس جوڑے کو خوش رکھے۔ چند دن تو یہ جوڑا خوش ہی رہا۔ مگر پھر پولیس ایکشن ہو گیا۔ اور اسلم کے پاس چونکہ کوئی کام نہ تھا۔ اور اس لئے وہ رضاکاروں میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اس لئے پولیس ایکشن میں وہ شہر سے باہر بھاگ گیا۔ تندوپیٹھ میں۔ مگر تندوپیٹھ میں بھی پولیس ایکشن ہوا۔ چنانچہ اسلم مارا گیا۔ گھر والوں کو اس کی لاش نہیں ملی، مگر موت کی خبر مل گئی۔ رفعیہ

بہت روئی دھوئی۔ حالانکہ مرنے سے چند ماہ قبل اسلم نے اُسے ایک بہت ہی بڑی "خفیہ" بیماری عطا کی تھی۔ جو وہ کسی "باہر والی" سے لے کے آیا تھا۔ رفیعہ تو گھل گھل کے کوئلہ ہوگئی ہوتی۔ اگر اماں کو بروقت پتہ نہ چل جاتا۔ اور حیدر گوڑے کے حکیم سلطان صاحب ازراہِ ہمدردی اس کا شافی علاج نہ کرتے۔

پھر بھی اتنے علاج کے بعد بھی رفیعہ کی رنگت جو پہلے گندمی تھی، اب سانولی سی ہوگئی تھی اور اس کے چہرے پر اکثر دانے سے نکل آیا کرتے تھے ۔۔۔۔ پھر بھی ۔۔۔ رفیعہ اپنے خاوند کے مرنے پر روئی تھی کچھ بھی ہو اس کا خاوند تھا۔ اور لوگ کہتے تھے کہ اسے رونا چاہیے۔ حالانکہ اندر سے اسے اپنے خاوند سے سخت نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ وہ روئی، اور پھر اسے فاقے بھی کرنے پڑے۔ کیوں کہ وہ لوگ عزت دار تھے۔ اور پولیس ایکشن کے دنوں میں اور اس کے بعد بھی کئی دنوں تک گھر سے باہر نہ نکلے۔ آنگن میں جام کا پیڑ تھا۔ رفیعہ کو یاد ہے۔ کئی بار سالن نہ ہونے سے اس نے خشک روٹی کے ساتھ جام کے پھل کھائے تھے۔ پھر جام بھی ختم ہوگئے۔ اور گھر میں کچھ نہ رہا تو ـــــــ ایک دن ـــــــ بلکہ ایک شب رفیعہ گھر سے نکل بھاگی۔ اور سیدھی ایک طوائف کے پاس پہنچی۔ کیوں کہ وہ ایک شریف عزت دار گھرانے کی عورت تھی۔ اور اس لئے اُسے کوئی کام نہیں آتا تھا۔ نہ وہ چاول کوٹ سکتی تھی۔ نہ برتن صاف کر سکتی تھی۔ اس لئے وہ سیدھی طوائف کے پاس گئی۔ اور پھر جب اُس نے گاہک کو دیکھا تو لوٹ آئی۔ جانے کیا ہوا۔ کیوں اس کی روح نے اس کے جسم نے اس کی ہستی کے ذرّے ذرّے نے اس کام سے ایسی بغاوت اختیار کرلی کہ رفیعہ مجبور ہوکر روتی ہوئی وہاں سے واپس آگئی۔ اُسے معلوم ہوگیا۔ کہ وہ یہ پیشہ اختیار نہیں کر سکتی۔ اور جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ نچلی عورتوں کا یہ دھندا بھی نہیں کر سکتی تو پھر وہ اپنی اماں کے صلاح مشورے کے خلاف پردے سے باہر آگئی۔

باہر کی دنیا میں! اس نے سوچا۔ وہ مردوں کی دنیا میں عورتوں کے لئے جگہ بنائے گی۔ اس لئے کہ اسے زندہ رہنا ہے۔ اور چونکہ اب وہ طوائف بھی نہیں بن سکتی تو اسے لامحالہ ایک شریف عورت کی طرح رہنا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی کام کرنا ہوگا۔ مگر حیدرآباد میں رہ کر اپنی برادری کے اصولوں کو توڑ کر۔ وہ برادری جو اس کے لئے کچھ کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ رہ کیسے سکتی تھی۔ کام کیسے کر سکتی تھی پھر بھی ریڈیو پر اُسے کچھ کام مل گیا۔ اور ریڈیو پر اس کی واقفیت پولیس ایکشن کے دنوں میں ہوگئی تھی جب اس نے اپنے خاوند کی تقلید میں ریڈیو پر ایک ڈرامے میں کام کیا تھا۔ اور حیدرآبادی زبان میں سردار پٹیل کے خلاف ایک فیچر بھی لکھا تھا۔ غنیمت ہے کہ اب ریڈیو والوں کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کیوں کہ بہت سے پُرانے لوگ چلے گئے تھے۔ اور نئے لوگ آ گئے تھے۔ اور یہ نئے لوگ کہتے تھے۔ خدا جانے خوشامد تھی کہ حقیقت کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ اس لئے اس نے چند ماہ ریڈیو پر کام کیا۔ اور جب یہاں بھی ایک صاحب نے اُس سے محبت ظاہر کی۔ جن کا مشغلہ ہی محبت ظاہر کرنا تھا۔ اور جو محبت سے اپنا جی اس طرح بہلاتے تھے۔ جیسے لوگ فرصت کے اوقات میں ہاکی۔ فٹ بال۔ گنجفہ یا چوسر سے اپنا جی بہلاتے ہیں تو رفعیہ کو اس محبت کے لفظ سے ایک عجیب کراہیت سی پیدا ہوگئی! اس کی رگوں میں ابھی پچھلی محبت کا زہر باقی تھا۔ جو اس کے شوہر نامدار نے اُسے دیا تھا۔ اتنی جلدی وہ کسی دوسری جگہ کیسے محبت کر سکتی تھی۔ ناچار رفعیہ کو حیدرآباد چھوڑ کر بمبئی آنا پڑا۔ اور فلم کمپنیوں کا سہارا لینا پڑا۔

جاگتے جاگتے صبح ہوگئی۔ اس رات رفعیہ نے اپنی ساری زندگی پھر سے پڑھ ڈالی جسے وہ کئی بار پڑھ چکی تھی وقتی طور پر اس کے دل میں جو لرزش پیدا ہوئی تھی آنکھ کے کونے میں جو ایک آنسو سا جھلملایا تھا اندھیرے میں کہیں سے جو روشنی کی ایک کرن آئی تھی۔ اس کے بازوؤں میں جو ایک اُمید سی کسمسائی تھی۔ یکایک وہ اس کے اعصاب میں ٹوٹ ٹوٹ سی گئی۔ وہ اپنے جسم کے بند بند میں اُسے ٹوٹتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ سُن سکتی تھی، چکھ سکتی تھی۔ ہائے کتنا تلخ ذائقہ تھا۔ مگر زندگی تو ہوتی

ایسی ہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کی زندگی۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی زندگی۔ خوب صورت سپناتو ایک انگڑائی کی طرح ہوتا ہے۔ اور سر سے پاؤں تک سارے اعضاء کو جھنجھوڑتا ہوا چلا جاتا ہے مگر چلا جاتا ہے۔ اور پھر کبھی نہیں آتا۔ عشرت کی طرح۔

رفعیہ کا جسم گندھے آٹے کی طرح کچا کچا سا ہو رہا تھا۔

یکایک دروازے پر دستک ہوئی۔

اَمّاں نے دروازہ کھولا۔

عشرت دروازے پر کھڑا تھا ...... مسکراتا ہوا جھجکتا ہوا۔ اندر آیا۔ سیدھا رفعیہ کے پاس۔ اس کے چہرے پر میک اپ کے نشان تھے۔

عشرت نے کہا "مجھے رات کے لئے ایک میک اپ مل گیا تھا بولنے کا پارٹ تھا پینتیس روپے کا سپلائر نے پانچ روپے کھانے کے لئے ایڈوانس دئے ...." عشرت رُک گیا۔ پھر اس نے اپنی جیب میں سے ٹٹول ٹٹول کر پانچ روپے کا ایک پُرانا بوسیدہ سا نوٹ نکالا۔ اور اسے رفعیہ کے ہاتھ میں نظریں نیچی کر کے دے دیا۔

رفعیہ کا دل کانپنے لگا۔ اس ہلکے سے کمزور نوٹ کی طرح جو اس کی انگلیوں میں کانپ رہا تھا۔ اس کے روئیں روئیں میں خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس کا جی چاہا۔ کہ وہ عشرت کا سر جھکا کے اپنے سینے پر رکھ لے۔ جو اب اس طرح ایک گناہ گار کی طرح اس کے سامنے آنکھیں نیچے کئے کھڑا تھا۔ مگر اس نے اپنے آپ پر ضبط کر لیا۔ اور بڑے تحمل سے بولی "تمہارے لئے کھانا رات بھر سے رکھا ہے" اس کے بعد چولھے کی طرف کھانا گرم کرنے کے لئے چلی گئی ——————

جب اکرم کے دن اچھے تھے ۔ وہ کھار میں رہتا تھا۔ کھار میں اس کے پاس چار کمرے کا ایک عمدہ فلیٹ تھا۔ فلیٹ میں غالیچے تھے ۔ عمدہ فرنیچر تھا۔ ریڈیوگرام، ریفریجریٹر، ٹیلی فون، چاندی کے برتن، کتابوں کی لائبریری ۔ سبھی کچھ موجود تھا۔ اس کی بادامی رنگ کی ڈاج اُسے اپنی جان سے بھی پیاری تھی ۔ مگر جب اس کی تصویریں ناکام ہوئیں۔ اور جب پروڈیوسروں ۔ ڈسٹری بیوٹروں اور فنانسروں نے اس کی سماجی مقصدیت کو روپے کے ترازو میں تولا۔ اور اس میں بہت کم وزن پایا۔ تو انڈسٹری نے دھیرے دھیرے اُس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ دھیرے دھیرے اس کی فلیٹ کی چیزیں جنہیں اس نے انتہائی شوق سے خریدا تھا۔ قرضے میں اُٹھنے لگیں ۔ ریڈیوگرام گیا۔ ریفریجریٹر گیا۔ چاندی کے برتن گئے ۔ آخر میں ڈاج گاڑی بھی گئی ۔ کتابیں اس نے آخر تک بچا کے رکھیں، مگر جب وہ فلیٹ کا کرایہ دس ماہ تک مسلسل نہ دے سکا تو مالک مکان نے جو غیر معمولی طور پر شریف تھا۔ اس کی کتابوں کی لائبریری اپنے قبضے میں کر لی، اور اسے فلیٹ سے نکال دیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ جب بھی وہ فلیٹ کا کرایہ ادا کر دے گا۔ اُسے اُس کی کتابوں کی لائبریری واپس مل جائے گی۔

اس بات کو آج دو سال ہونے کو آئے ۔ اکرم ابھی تک اپنی کتابوں کی لائبریری نہ چھڑا سکا

تھا۔ اپنی کتابوں کے چھن جانے کا اُسے انتہائی غم تھا۔ اب وہ کھار سے پریل میں آگیا تھا۔ جہاں اُس کی بڑی بہن رشیدہ جو بیوہ تھی اور مسلم گرل اسکول بائی کھلہ میں اسّی روپے میں ٹیچر تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتی تھی۔ جگہ بہت کم تھی۔ کیوں کہ اسی کمرے میں بچے سوتے تھے لڑتے جھگڑتے اور پڑھتے تھے۔ اسی کمرے میں رشیدہ کھانا پکاتی تھی۔ اپنے بچوں کے کپڑے سیتی تھی۔ کپڑے دھوتی تھی۔ کمرے کے کونے میں ایک نل تھا جس کے گرد دو فٹ اونچی دیوار تھی جو پردے کے لئے ناکافی تھی۔ ناچار رشیدہ نے پردہ ٹانگ کر کچھ تھوڑا سا انتظام کیا تھا۔ کمرے سے لگی ہوئی ایک بالکونی تھی۔ اکرم اسی بالکونی میں سوتا تھا۔ یہیں پر اس نے اپنے کپڑوں کا ٹرنک اور چند کتابیں ایک ریک پر رکھی تھیں بالکونی میں کھلی ہوا آتی تھی۔ اور سونے کے لئے بہت عمدہ جگہ تھی۔ اور اس کے سامنے کی بلڈنگ کی درجنوں ایسی بالکونیاں تھیں۔ جہاں زندگی۔ اس کی اپنی زندگی کی طرح دھڑ سے اوپر ننگی یا صرف ایک بنیان پہنے ہوئے نظر آتی تھی۔ آدمی کپڑے پہن کر کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُس کے احساسات اور خیالات اور جذبات نے بھی ایک غلاف پہن لیا ہو۔ لیکن بالکونی میں آدمی کپڑے اُتار کر خالی ایک بنیان اور تہمد پہنے یا ایک باڈی یا بنڈی کوٹ پہنے۔ گرمیوں میں پنکھا جھلتے ہوئے یا برسات کے دنوں میں ٹاٹ کا بوریا باندھتے ہوئے کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے اس قدر قریب اس قدر بے ہنگم طور پر مساوی کہ اُسے حیرت ہوتی تھی کہ آج تک کسی مصلح کو انسانی مساوات کا ثبوت دینے کے لئے بالکونی کی مثال دینے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ چھ نمبر کی بالکونی میں ایک فلسفی رہتا تھا۔ پانچ نمبر میں ایک مل مزدور رہتا تھا۔ چار نمبر میں وہ خود ایک فلم ڈائریکٹر رہتا تھا۔ تین نمبر میں ایک بڑھئی رہتا تھا۔ دو نمبر میں ایک اخبار بیچنے والا رہتا تھا۔ ایک نمبر میں ریلوے کا ایک ٹی ٹی رہتا تھا۔ لیکن جب یہ لوگ بالکونی میں تہمد یا دھوتی پہنے۔ بنیان یا بنیان کے بغیر کھڑے ہوتے تھے یا اپنے بیوی بچوں سے باتیں کرتے تھے یا دانت مانجھتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تو اس قدر ایک ہی صف میں

کھڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کہ امتیاز مشکل سے ہوتا تھا۔ پتہ نہیں سیاست دانوں نے جنگ کے بجائے مزاح سے فاسزم کو ختم کرنے کا طریقہ کیوں نہیں سوچا۔

بالکونی کے مناظر دیکھتے دیکھتے اکرم کا پختہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ اگر کسی طرح ہٹلر کو پکڑ کر کے یا اُسے صرف ایک بنیان اور ایک لنگوٹ یا تہمد پہنا کے ایک بالکونی میں کھڑا کر کے لاکھوں آدمیوں کے سامنے تقریر کرنے کے لئے کہا جاتا۔ تو فاسزم اسی دن ختم ہو جاتا۔ لوگ ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے۔ اور جب وہ اپنے سینے کے اُلجھے ہوئے بالوں پر اپنا ہاتھ رکھ کے اپنی مچھر مار کر مونچھ کو ہلاتے ہوئے یہ کہتا جرمن آریائی نسل دنیا کے انسانوں کی بہترین نسل ہے۔ تو خود جرمن لوگ ٹماٹر اور گندے انڈے پھینک پھینک کے اس کا برا حال کر دیتے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں بڑے بڑے سجے ہوئے پلیٹ فارموں پر بنیان کی روشنیوں میں۔ درجنوں مائیکروفون کے سامنے تمغے لگائے ہوئے فوجی وردیوں سے ملبوس سینوں سے نکلتی ہیں۔ پھر بینڈ بجتے ہیں۔ مارچ ہوتے ہیں۔ ٹینک چلتے ہیں۔ لاکھوں آدمی قتل ہوتے ہیں۔ پھر کہیں جا کے یہ فتنہ دبایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کام کے لئے صرف ایک بالکونی کافی ہے خدا جانے انسانوں کو کب عقل آئے گی؟

مگر آج تو وہ خود یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا تھا آج تو وہ خود بالکونی میں اوندھا منہ کئے بیٹھا تھا۔ اور رشیدہ اُسے دو مرتبہ آ کے جگا گئی تھی۔ وہ اوں، آں کر کے پھر اوندھا ہو جاتا تھا۔ رشیدہ ایک دُبلی پتلی عورت تھی۔ رنگت بے حد زرد۔ لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ۔ اُن آنکھوں کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کی سنجیدہ فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ ہونٹوں کے کنارے ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ مگر یہ کوئی بے فکر مسکراہٹ نہ تھی یہ تو ایسی مسکراہٹ تھی جس نے دنیا کے سارے غم دیکھ کر اس پر رونے کے بجائے ہنسنا سیکھ لیا ہو۔ یا طنز کرنا سیکھ لیا ہو۔ رشیدہ کا لہجہ بڑا ملائم تھا۔ اور مخلص تھا لیکن اس لہجے کے اندر کتنے تیز کانٹے چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا احساس بہت ہی ذہین لوگ

کر سکتے ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ بھی "ارے" کہہ کے رہ جاتے، کیوں کہ انہیں بعد میں پتہ چلتا کہ رشیدہ اپنے ملائم اور نرم لہجے میں کیسی تیز بات کہہ گئی۔

رشیدہ نے پوچھا "دو مرتبہ جگا چکی ہوں آپ کے اُٹھو گے نہیں؟"

"نہیں!" اکرم وہیں بالکونی میں اوندھا پڑا پڑا بولا۔

"جوشی جی کی بچیر کا مہورت ہے اس لئے؟"

"کیا مطلب؟ کیا مطلب؟" اکرم جلدی سے اُٹھ کے بولا۔ مگر رشیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت اپنی دھلی ہوئی شلوار اور قمیص الگنی پر ٹانگ رہی تھی، اور اب ننھے جمیل کو نل پر نہلانے کے لئے جا رہی تھی۔

رشیدہ نے کچھ نہیں کہا۔ مگر یوں تو اس نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ وہ واقعی آج بستر سے اُٹھنا نہیں چاہتا تھا آج جوشی جی کی بچیر کا مہورت تھا۔ گو سیٹھ بانکے لال نے اس کی بچیر کا مہورت کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر۔ وعدہ جانے کب سے ملتا آ رہا تھا۔

"اور جانے کب تک ٹلے" رشیدہ نل پر جمیل کو نہلاتے ہوئے بولی "کیا؟ کیا!" اکرم نے خوفزدہ ہو کے کہا۔ رشیدہ کبھی کبھی اس کے اُلجھے ہوئے خیالات کو یوں پڑھ لیتی تھی۔ جیسے وہ آدمی نہ ہو ایک کھلی ہوئی کتاب ہو۔

اکرم نے کہا "تم چائے بنا لو۔ میں ضرور جاؤں گا۔"

رشیدہ بھی یہی چاہتی تھی۔ مگر نہیں چاہتی تھی کہ اسے یوں صاف صاف کہنا پڑے۔ اس نے جلدی سے چائے تیار کی۔ اتنے میں اکرم بھی ہاتھ منہ دھو کر قمیص اور پتلون پہن کر تیار ہو گیا۔ جب اُس نے چائے پی لی۔ تو رشیدہ نے ایک اٹھنی اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

اٹھنی کو دیکھتے ہی اُسے یاد آیا کتنے دنوں سے وہ رشیدہ سے وعدہ کر رہا تھا کہ وہ سیٹھ سے

اپنے گھر کے لئے کچھ رقم مانگے گا۔ مگر وہ کیا کرے۔ اس کی پکچر ہی شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور جب تک پکچر شروع نہ ہو جائے۔ وہ سیٹھ سے رقم مانگتے ہوئے ڈرتا تھا۔ شروع شروع کے تین چار ماہ تو اس نے تنخواہ مانگ لی تھی۔ لیکن اب گزشتہ پانچ ماہ سے اس نے سیٹھ سے ایک پائی طلب نہیں کی تھی پہلے تو یہ خیال رہا کہ سیٹھ خود سے دے دے گا۔ اور جب سیٹھ نے تنخواہ نہ دی تو اکرم نے سوچا اچھا ہے۔ سیٹھ میری پکچر کسی طرح شروع کر دے۔ پھر اکٹھی رقم مانگ لوں گا۔ اب پکچر بھی شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ رشیدہ کی نگاہ کہہ رہی تھی۔ تو کب تک بہن کے آسرے پر۔۔۔؟

"نہیں نہیں" اکرم بولا "میں آج جمعرات کے بعد ضرور سیٹھ سے بات کر دوں گا۔"

رشیدہ کچھ نہ بولی۔ کئی بار اکرم نے تہیہ کیا تھا وہ سیٹھ سے بات کرے گا۔ مگر رات کو وہ اس طرح منہ لٹکائے ہوئے واپس آ جاتا تھا کہ رشیدہ پھر کچھ نہ کہہ سکتی۔ کاش! وہ کچھ کہہ سکتی۔ کاش اس نے زندگی کو اس طرح نہ سمجھا ہوتا۔

کیسی طنزیہ مسکراہٹ تھی رشیدہ آپا کی! جیسے کسی نے زندگی کے سارے دکھوں اور تکلیفوں مصیبتوں اور صعوبتوں کو کشید کر کے ان کا عطر نکال لیا ہو۔ اور اسے ایک دل کش تبسم کی صورت میں رشیدہ کے ہونٹوں پر پھیلا دیا ہو۔ ایسی بھی بھلا کیا مسکراہٹ ہوئی۔ اکرم کبھی کبھی تو اس سے پریشان ہو جاتا مجھے یہ مسکراہٹ قطعی پسند نہیں۔ اس قدر سوجھ بوجھ رکھنے والی۔ ہر بات فوراً سمجھ جانے والی مجھے تو شمشاد کی مسکراہٹ پسند ہے۔ اتھلی، فروعی، سطحی۔ بے فکر مسکراہٹ، فضا میں اڑتی ہوئی تتلی کی طرح۔ شوخ اور خوش رنگ۔ یہ مسکراہٹ۔ جو کچھ سوچتی ہی نہیں۔

رشیدہ نے کہا "جمعرات میں ضرور جاؤ۔ شمشاد بھی وہاں ہو گی نا!"

اکرم نے پھر چونک کر اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ رشیدہ پلٹ کر اپنے ننھے بیٹے معصوم کو لحاف اوڑھانے لگی۔ معصوم کے دونوں پھیپھڑوں میں نمونیہ سرایت کر چکا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے کھانس رہا تھا اکرم سر جھکا کے

کمرے سے باہر نکل گیا۔

"وہ کیوں بدل نہیں سکتا؟ وہ کیوں "لڑکا یا لڑکی؟" دنیا گول مٹول ہے"۔ سلت مسخرے "ایک بیوی" نہیں بنا سکتا۔ وہ کیوں "پہلی ملاقات ہے۔ دوسری کرامات ہے" ایسے معرے نہیں سوچتا۔ وہ کیوں انسان کی بھلائی کے پیچھے لٹھ لئے گھوم رہا ہے۔ وہ کیوں اپنی بھلائی کی نہیں سوچتا وہ کیوں لڑکیوں کو لے کے جوہو پر نہیں جاتا۔ وہ کیوں اس قدر خشک، متین اور سنجیدہ بنا رہتا ہے کہ لوگ اُسے سوکھا ہوا آلو کہنے لگے ہیں، دنیا میں کیا وہی ایک انٹلکچوئیل رہ گیا ہے۔ بڑے بڑے گنجے سروں والے اوندھے دماغوں والے۔ الٹی کھوپڑیوں والے انسان یہاں بستے ہیں۔ جن کی تجوریوں میں بھی لاکھوں روپیہ ہے وہ کیوں سماج کی بھلائی کے لئے تصویریں نہیں بناتے؛ صرف اُتھلی چھچھوری بے ہنگم باتیں کر کے بجانے والی موسیقی اور کولھے مٹکانے والی کلا دے کر اپنا گھر بھر رہے ہیں۔ اور ایک تم ہو میاں اکرم کہ سارے جہاں کا درد اپنے دل میں لئے فاقے کر رہے ہو۔ میاں کچھ عقل کے ناخن لو۔۔۔

وہ راستے میں ایک راہ گیر سے ٹکرا گیا۔ راہ گیر گھور کے اُسے دیکھنے لگا۔ اکرم نے جلدی سے کہا "ساری"

"ساری کا بچہ!" راہ گیر غصے سے چلّایا۔ مگر اکرم آگے بڑھ گیا۔ بات یہ ہے کہ اس سماج میں رہ کے اُسے اس سماج کے ماحول کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ اس قسم کی باتوں کے لئے جس قسم کی سیاسی۔۔۔ کی ضرورت ہے وہ اس انڈسٹری میں قطعی نہیں۔ پھر خالی تھنوں سے دودھ کی کوشش کیوں کر رہا ہے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ جوشی جی کی طرف دیکھو ڈم فو شروع ہو چکی۔ اب ڈمرو کا مہورت کر رہے ہیں۔ تین تین ہیروئینوں کو ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ اور ایک جناب اکرم ہیں۔ کہ قوم کے غم میں چکرم ہوئے جا رہے ہیں۔۔۔ چکرم۔۔۔ چکرم۔۔۔ اکرم نے سوچا چکرم کیسا نام ہے؟ عمدہ بڑھیا۔ ایک دم ہٹ! اکرم خوشی سے اُچھل پڑا۔ اور اچھلتے ہی بجلی کے کھمبے سے ٹکرایا۔ آس پاس کے راہ چلتے ہوئے لوگ اس پر ہنس پڑے۔ وہ تو خیریت ہوئی۔ دلجیت سٹوڈیو قریب آ گیا تھا۔ اکرم جلدی سے اپنی خفت چھپاتے ہوئے

ماتھے سے ماتھے کو رگڑتے ہوئے دلجیت سٹوڈیو کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

اکرم کو سر نیچا کر کے چلنے کی بہت بُری عادت تھی۔ چلتے ہوئے آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھتا تھا بس اپنی دُھن میں غرق چلا جا رہا ہے۔ اکرم نے سوچا اب اسے اپنی زندگی کا سارا ڈھرا بدل دینا پڑے گا۔ آج سے وہ سر اُٹھا کے چلے گا۔ بڑھ بڑھ کے باتیں کرے گا۔ منہ پر گھونسہ مار کے گالیاں بک کے پروڈیوسروں کو مرعوب کیا کرے گا۔ یہ لوگ شرافت سے دبنے والے نہیں ہیں۔ ان کے سامنے تو اسے دوسرا جوشی جی بننا پڑے گا۔

سٹیج نمبر تین میں مہورت تھا۔ مہورت میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ مگر سٹیج فلم ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں، فنانسروں، ڈسٹری بیوٹروں، دلالوں، ایکسٹرا کام کرنے والوں اور چھوٹے موٹے رول کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ فلم انڈسٹری میں ہر روز کہیں نہ کہیں مہورت ہوتا رہتا تھا۔ اس لئے بہت سے بے کار لوگوں نے یہی شغل اختیار کر رکھا تھا کہ صبح کا ناشتہ مہورت پر جا کے کریں گے۔ لڈو تو کھانے کو مل ہی جائیں گے۔ یہ لوگ مہورتیئے کہلاتے ہیں۔ اور کوئی بھی مہورت ہو۔ کہیں بھی مہورت ہو۔ انہیں کارڈ ملے نہ ملے۔ وہاں ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تعداد انہیں مہورتیوں کی ہوتی ہے۔ مہورت کی رونق انہیں کے دم سے ہے۔ ورنہ کام کے آدمی تو دس بارہ ہی ہوتے ہیں۔

مہورتیوں کی ٹولیوں میں گزرتے ہوئے سیٹھ بانجڑیا اکرم کی طرف آ رہا تھا۔ اکرم کو پکڑ کر ایک کونے میں لے گیا۔ اور جلدی جلدی سرگوشی کرتے ہوئے بولا

"تمہاری پکچر کا بھی آج ہی مہورت ہو گا۔"

"کب؟"

"ابھی۔ اسی دم۔ ایک ڈسٹری بیوٹر ایڈوانس دینے پر راضی ہو گیا ہے۔ ابھی چیک ملتا ہے۔ تصویر کا نام بتاؤ۔"

"چکرم!"

"چکرم کیا؟" بانکڑیا قریباً غش کھاتے ہوئے بولا "کوئی قومی تصویر ہے؟"

"قومی تصویر کی ایسی تیسی" اکرم گھونسا تانتے ہوئے بولا۔ اُس نے آس پاس دیکھا۔ لیکن اُسے میز نظر نہ آئی جس پر گھونسا مار کے وہ چختا اور تاثر پیدا کر سکتا۔ ایک لمحہ کے لئے اکرم کے دماغ میں خیال آیا۔ کہ کیوں نہ وہ یہ گھونسا سیٹھ کے جبڑوں میں گھسا دے۔ مگر پھر اُسے تہذیب کے خلاف سمجھ کے اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور گھونسے والا ہاتھ بادل نخواستہ نیچے کر کے بولا "ارے سیٹھ وہ کامیڈی دوں گا۔ وہ کامیڈی دوں گا کہ سالا چارلی چیپلن بھی دیکھے تو غش کھا کے گر پڑے ...."

سیٹھ نے ذرا اور دلچسپی سی محسوس کی۔ وہ ایک نئی نظر سے اکرم کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا "مگر اکرم بھائی۔ یہ چکرم نام کچھ ....؟"

اکرم جلدی سے بات کاٹ کے بولا "تو جانے دو۔ اور نام لو۔ ناموں کی اپنے پاس کیا کمی ہے غبڑ غوش کیسا نام رہے گا؟"

"غبڑ غوش کیا؟" سیٹھ حیرانی سے بولا۔

"غبڑ غوش عرف ٹکھن ٹوشش"

"غبڑ غوشش؟.... مگر اس کا مطلب کیا ہے؟"

"تم مطلب چھوڑو سیٹھ۔ سوچو۔ نام بولنے سے منہ بھرتا ہے کہ نہیں"

"ہاں" بانکڑیا نے سر ہلا کے کہا "منہ تو بھرتا ہے"

"منہ بھرتا ہے۔ تو ایک دن تجوری بھی بھرے گی سیٹھ۔ جلدی سے اعلان کرو۔ غبڑ غوشش کا اعلان کیا ابھی کرتا ہوں۔ ڈسٹری بیوٹر سے چیک لیتا ہوں" بانکڑیا مسکراتے ہوئے بولا "کیا م بتایا"

"غبڑغوش!"

"غبڑغوش... کیا پھینٹاسی! (PHANTASY) ہے۔"

"ارے پھینٹاسی کی ماسی ہے۔ سیٹھ، تم جا کے ڈسٹری بیوٹر سے بات تو کرو۔ وہ کہانی دوں گا کہ دماغ گھوم جائے گا۔"

سیٹھ نے خوش ہو کے اکرم کی طرف دیکھا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ایسی بات تم مجھ سے پہلے بولتا۔ تو اب تک تمہارا پکچر شروع ہو کے ختم ہو گیا ہوتا۔ پھر ذرا رک کر رازدارانہ لہجے میں۔ اکرم کی پیٹھ تھپتھپا کے بولا "مہورت کے بعد پانچ سو کا چیک لے کے جانا مجھ سے۔"

"بہت اچھا سیٹھ!"

جوشی جی، راج لتا، شمشاد۔ اور نیا چہرہ رنجنا کے درمیان کھڑے ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کا ہاتھ بار بار رنجنا کی پتلی کمر کی طرف چلا جاتا تھا۔ سلور سکرین، مووی نیوز کے کیمرہ مین فوٹو لے رہے تھے۔ اکرم نے سوچا، باادب، باملاحظہ ہوشیار۔ اب میری باری آئی ہے! بیٹا جوشی۔ میں اپنی فلم میں پچاس لڑکیوں کا ڈانس رکھوں گا۔ ڈیڑھ لاکھ کا ایک ہی سیٹ بنواؤں گا۔ دیکھے جاؤ...! ایسا نیا چہرہ۔ ایسا نیا چہرہ لاؤں گا کہ دیکھتے ہی عش عش کر اُٹھو گے۔ اور جب اکرم کو نئے چہرے کا خیال آیا تو اس کے ذہن میں ولایت بیگم کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

جب ولایت بیگم کو اکرم نے پہلی بار دیکھا۔ وہ گلابی رنگ کے پیراشوٹ سلک کی قمیض اور سفید ساٹن کی شلوار پہنے اور سیاہ سلک کے برقعے کا نقاب اُٹھائے گرانٹ روڈ سٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ پہلی نظر میں بھانپ گیا کہ یہ پنجابی لڑکی ہے اور بمبئی میں نئی آئی ہے۔ ورنہ اس کے رخساروں پر یہ سیب کی سی چمک نہ ہوتی۔ اور وہ اپنے برقعے کو یوں لئے دئے نہ پھرتی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی جس کا رنگ بے حد گورا تھا۔ نقش تیکھے تھے۔ لیکن بے حد ناموزوں۔ بھوئیں کمان کی طرح۔ آنکھیں بادام کی سی۔ ہونٹ پتلے۔ ناک تلوار کی دھار کی طرح۔ تمام نقوش اپنی جگہ انفرادی حیثیت سے خوب صورت تھے لیکن اس کے چہرے پر ایک عجیب غیر مناسب ترتیب کا اظہار کر رہے تھے۔ ولایت بیگم کے ساتھ کھڑی ہو کے وہ اپنی بدصورتی کو نمایاں اور ولایت بیگم کے حُسن کو دوچند کر رہی تھی۔ جب تک گاڑی نہیں آئی وہ ان دونوں کے قریب کھڑا ہوا اُن کے جسمانی تضاد کا اندازہ لیتا رہا۔ یکایک کسی بات پر ولایت بیگم ہنس پڑی۔ اور اُس کے بے حد سفید اور متناسب دانت دیر تک اکرم کے ذہن میں چمکتے رہے۔ اور اس کی ملائم نسوانی آواز دیر تک اس کے دل کے گوشوں میں گونجتی رہی۔ پھر گاڑی آگئی اور وہ دونوں لڑکیاں زنانے ڈبے میں چلی گئیں۔ اور اکرم پلٹ کر کتابوں کے سٹال پر چلا آیا۔ کیوں کہ اب اُسی گاڑی میں ایک

الگ ڈبے میں بیٹھ کر جانے سے اُسے بڑی کوفت ہوتی۔

غبارِ خوشس کے مہورت کے کچھ دنوں بعد اکرم نے ولایت بیگم کو اسی گلابی پیراشوٹ سلک کی قمیض اور سفید ساٹن کی شلوار میں دلجیت سٹوڈیو کے باہر کھڑے دیکھا۔ اکرم گاڑی میں تھا۔ اس لئے صرف اسے پل بھر کے لئے دیکھ سکا۔ پھر وہ سٹوڈیو میں چلا گیا۔ اور دفتر میں آتے ہی اُس نے اپنے ہاں کے ایکسٹرا سپلائی کرنے والے دارا کو بلایا اور اُس سے کہا کہ دلجیت سٹوڈیو کے باہر اس وضع قطع کی لڑکی کھڑی ہے اور بیشتر اس کے کہ وہ کہیں اور جائے اور یا اگر وہ راج محل سٹوڈیو میں چلی گئی ہو تو تم اسے کسی طرح گھیر گھار کے بہلا پھسلا کے اپنے ہاں لے آؤ ــــــ دارا اس معاملے میں بڑا تیز تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس کا سر آگے سے چھوٹا اور پیچھے سے بڑا تھا۔ اور اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے وہ دُور سے دیکھنے میں بالکل تَگی چوہا نظر آتا تھا۔ مگر لڑکیاں پھانسنے میں بے حد مشاق تھا۔ وہ چند منٹوں میں ہی ولایت بیگم کو اکرم کے پاس لے آیا۔

ولایت بیگم کے ساتھ وہی گورے رنگ کی بدصورت لڑکی تھی۔ اور زنانہ اطوار والا ایک لڑکا جو شکل و صورت سے ولایت بیگم کا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ ایک بارعب بھاری بھرکم، تن آسان عورت تھی۔ جس کی گھریلو سمجھ دار مسکراہٹ میں خندہ طنز کے کئی پہلو تھے۔ یہ عورت ولایت بیگم کی ماں تھی۔ جوانی میں ولایت بیگم سے کہیں زیادہ حسین ہو گی۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو بڑی بڑی مونچھیں رکھے ہوئے تھا۔ اور کُلاہ اور پگڑی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر بسم اللہ کُھدوا رکھا تھا۔ اُس کا نام جلال الدین تھا۔ لڑکے کا نام شفیع اور ادھیڑ عمر کی عورت کو وہ سب لوگ ’بے بے‘ کہتے تھے۔ گورے رنگ کی بدصورت عورت کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ شفیع اسے ”جان“ کہتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شفیع کی بیوی ہے۔ لیکن شفیع سے کہیں بہتر مردانہ اوصاف رکھتی تھی۔

بات چیت جان نے شروع کی۔ بولی ”سلام اے“ پھر مڑ کر ولایت سے کہنے لگی ”ڈائریکٹر ہیں

انہیں سلام کرو" ولایت بیگم نے اپنی کجلائی ہوئی آنکھوں سے اکرم کو ایک بار دیکھا۔ پھر ہنس کر مُنہ پھیر لیا لیکن اکرم اب بھی اس کا رُخ دیکھ سکتا تھا۔ وہ تیز تیکھا سرمئی و سانولہ، وہ پلکوں کی گھنی صف اور اس کے نیچے وہ سنہری سنہری رنگت۔ رخساروں کی جان کوئی غازہ نہ تھا۔ صرف شبنمی شفاف چمک تھی۔ اس کی جھکی نگاہیں بھی پیروں پر پڑیں۔ اور پھر ولایت نے جلدی سے اپنے خوب صورت ٹخنے چھپائے۔

جان بولی "آپ نے ہم کو بلایا ہے نا؟"

"جی"

"پکچر میں کام کرنے کے لئے"

"جی"

"رول کیا ہوگا؟"

"ایک چھوٹا سا رول ہے۔ مگر بہت اچھا ہے" اکرم نے جواب دیا۔

تو چلو چلیں" جان کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی "ہماری ولایت بیگم تو صرف ہیروئن کا رول کرے گی"

"پہلے کہیں کام کیا ہے" اکرم نے پوچھا

جان بولی "لاہور میں گئی یہاں مرہمودئی کا کام کیا تھا بعد میں ڈائرکٹر سے جھگڑا ہو گیا وہ مؤا اس سے تعلق چاہتا تھا"

ولایت بیگم نے سیاہ برقعے کی اوٹ کا سہارا لیا۔

جان بولی "چلو چلیں"

کوئی نہیں ہلا۔

اکرم نے کہا "بیٹھئے۔ بیٹھئے" جان بیٹھ گئی۔ شفیع ایک سُرخ رومال نکال کر اپنا منہ پونچھنے لگا۔

بے بے اکرم کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اکرم نے کہا "رول چھوٹا سا ہے۔ مگر بہت اچھا ہے پیسے بھی

کہیں گے گرد ڈائریکٹر ہوں۔ ہیروئن کے ساتھ کھڑا کر دوں گا۔ پبلسٹی کے محکمے کا آدمی میرا دوست ہے وہ پبلسٹی کراؤں گا ولایت بیگم کی کہ دوسری پکچر میں ہیروئن بننے کے لئے لوگ خود خوشامد کرتے پھریں، پھر دوسری پکچر بھی میں خود ڈائریکٹ کر رہا ہوں۔"

اکرم نے بے بے کی طرف دیکھا۔ اس کی پختہ سوجھ بوجھ رکھنے والے تبسم میں وہی خفتہ طنز تھا مگر بڑا بے ضرر میٹھا مہربان طنز تھا جیسے ماں اپنے ننھے سے کہے میں تیرے سارے کرتوت جانتی ہوں،

جان نے پوچھا "تنخواہ کیا ملے گی؟"

اکرم نے کہا "ڈھائی سو روپے ماہوار۔"

جان پھر اُٹھ کھڑی ہوئی "تو چلو چلیں۔ ڈھائی سو روپے۔ وہ اندھری کے سٹوڈیو والے ہیں، ساڑھے چار سو بتاتے تھے اور پھر وہ لوگ مجھے بھی کام دیتے تھے۔ چار سو روپے دے رہے تھے۔ مفت میں ہمیں یہاں بلا کے خراب کیا۔"

شفیع بولا "گئی بہار" میں اُسے پانسو مل رہے تھے۔ سو روپے مجھے جیب خرچ ملتا تھا۔ سگریٹوں کے لئے۔"

بے بے بولی "ہیروئن کبھی نہ ہو گی۔ اور تنخواہ بھی ٹھیک سے نہ ملی تو بیٹا بتاؤ کام کیسے چلے گا۔"
بے بے نے لفظ کام پر ذرا زیادہ زور دیا۔ اس لئے اکرم کے لئے جواب دینا ضروری ہو گیا۔ اس نے کہا "کام تو دنیا میں کسی نہ کسی ڈھنگ سے چلتا ہی ہے۔ اور چلے گا بھی۔ تنخواہ اس سے زیادہ نہ ملے گی۔ سیٹھ لوگ نہیں مانیں گے۔ اور یہ تو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے سیٹھ کو یہ سب نہ پسند ہو۔"

جان بولی "یہ کنٹراک، کانکٹریکٹ، ہم کو پسند نہیں۔"

"چلو چلیں" شفیع بولا۔

"چلو" بے بے نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے" جلال الدین نے دھیمے سُر میں کہا۔

ولایت بیگم وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہیں۔

بے بے نے کہا "اُٹھ ولیتی اے!"

ولایت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لوگ باہر چلے گئے۔ سڑک پر آگے نکل گئے۔ اکرم بھرم دار کو سمجھنے والا تھا۔ کہ ولایت یکایک پلٹی۔ اس کے ساتھ کے لوگ اسے بلاتے رہ گئے۔ لیکن وہ نہایت تیزی سے چلی آ رہی تھی۔ وہ سٹوڈیو کے اندر داخل ہوئی۔ اکرم کے کمرے میں آگئی۔ اس کی میز کے سامنے آکے۔ بولی "میں کام کروں گی"

اس کا چہرہ غصّے سے تمتما رہا تھا۔

اکرم میز بجا رہا تھا۔ بجاتے بجاتے رک گیا۔ بولا "بہت اچھا میں ابھی اگریمنٹ تیار کروائے دیتا ہوں۔ دستخط کرکے جاؤ"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ کلرک اگری منٹ ٹائپ کرنے لگا۔ وہ بولی "مجھے کچھ روپے ابھی چاہئیں سرائے والے کے پیسے دینے ہیں"

"تم سرائے میں ٹھہری ہو؟"

"اور کہاں ٹھہرتی۔ اپنے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے۔ اور آج وہ بھی ختم ہوگئے۔ سرائے والا پریشان کر رہا تھا۔ آج مجھے کہیں نہ کہیں اگری منٹ کرنا ہی تھا" اس نے بڑے افسردہ تھکے تھکے تنوطی لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں بڑھاپے کی تھکن تھی۔ اور بچپن کی معصومیت۔ اس کی عمر مشکل سے پندرہ برس ہوگی

اگری منٹ ٹائپ ہوگیا۔ سیٹھ کے دستخط بھی ہوئے اور ولایت بیگم نے بھی جھٹ سے دستخط کر دئے۔ اور اکرم نے ایک سو روپے کا نوٹ اس کی ٹھنڈی برفاب انگلیوں میں تھما دیا۔ اتنے میں آ

کے گھر کے لوگ بھی چلے آئے۔ ولایت نے لاپرواہی سے نوٹ بے بے کے ہاتھ میں دے دیا۔ بے بے نے اپنے دوپٹے کے آنچل میں مضبوطی سے باندھ لیا شفیع نے سگریٹ کا کش زور سے اندر کھینچا۔ اور ماں نے گھور کے غصے بھری نگاہوں سے اکرم کی طرف دیکھا" اور میرے لئے تو کام نہیں ہے"
"نہیں"

"اچھا تو میں جاؤں" ولایت نے اکرم سے پوچھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اکرم نے کہا" ٹھہر جاؤ میں ایک ہوٹل کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔ آپ لوگوں کا سرائے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے"
بے بے آنچل پھیلائے اکرم کو دعائیں دینے لگی۔ اور سرائے والے کو گالیاں۔

اکرم نے ٹیلیفون پر بات کر کے کہا۔ بوری بندر ہوٹل میں ستائیس نمبر کمرہ آپ کے لئے طے کر دیا ہے آپ لوگ سرائے سے وہاں چلے جائیے۔ چلتے چلتے جان نے کہا" سلام لے"

شام کو جب اکرم اپنے کام سے فارغ ہو کے بوری بندر ہوٹل پہنچا تو ولایت بیگم ایک گہری سبز ساڑی میں ملبوس اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ بے بے نے اس کے بال بڑی خوب صورتی سے سجائے تھے۔ اکرم سٹوڈیو کی ایک گاڑی ساتھ لایا تھا۔ ولایت بیگم کچھ پوچھے بغیر اس کے ساتھ ہوٹل کے زینے سے نیچے اتر آئی۔ پیچھے پیچھے شفیع تھا۔

بے بے نے زینے کے اُوپر سے بلند آواز میں کہا" شفیع کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ باہر بیٹھا رہے گا"
اکرم گاڑی جوہو کے ایک خوب صورت ہوٹل کے کشادہ آنگن میں لے گیا۔ رستے بھر اُس نے ولایت سے کوئی بات نہیں کی۔ اور ولایت نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے دیکھا کہ اکرم بار بار دزدیدہ نگاہوں سے اس کے سینے کے ابھاروں کو دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کی کمر کے لچکیلے خم کو۔ مگر پھر بھی وہ مسکرائی نہیں سنجیدہ رو ہو کے باہر دیکھتی رہی۔ جہاں لوگ چلے جا رہے تھے، جہاں نوجوان بیویاں اپنے خاوندوں سے ہنس ہنس کے باتیں کرتی ہوئی گزرتی جا رہی تھیں۔ ماں نے اپنے

پیارے پیارے بچے گود میں اُٹھائے ہوئے تھے۔ جہاں کلرک تھیلیوں میں کھانے کا سامان یا راشن بھر بھر کے لئے جارہے تھے۔ ایک جگہ نیا مکان بن رہا تھا۔ موڑ پر پولیس کا سپاہی اطمینان سے آمدورفت کا بندوبست کررہا تھا۔ ہوٹل میں چاروں طرف سمندر کے کنارے کنارے خوش نما کاٹج بنے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ایک کاٹج میں چلے گئے ــــــــــ

شفیع گاڑی میں بیٹھا رہا۔ اور سُرخ رومال میں گرہیں لگاتا اور کھولتا رہا۔ اکرم نے جاتے وقت پانچ کا نوٹ اور سگریٹ کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شفیع نے مسرت سے اُچھل کر اکرم کے گھٹنے چھو لئے " تو سخی بادشاہ ہے۔ ایک پارٹ فقیروں کو بھی دے دے۔ ولایت کو میں لاہور سے لایا ہوں کہ اس کو پارٹ مل جائے گا۔ تو فقیروں کو بھی مل جائے گا۔ کیوں ؟ سخی بادشاہ ۔ ۔ ۔ "

اکرم نے کہا " عزیز سگریٹ پیو، اور سمندر پر ٹہلو۔ کل بات کریں گے "

شفیع نے اکرم کی طرف ہاتھ اونچا کر کے کہا " جیو چھیا!"

اندر کاٹج میں پہنچ کر اکرم نے دیکھا۔ پلنگ پر ولایت بیگم لیٹی نیم وا آنکھوں سے چھت کو تک رہی ہے۔ اس نے ساڑی اُتار کے الگ رکھ دی ہے۔ ایک کرسی پر۔ اور چھت کے پنکھے کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں اس کا سبز ساٹن کا پیٹی کوٹ لرز رہا ہے۔

اکرم نے کہا " یہ کیا بیہودگی ہے۔ ساڑی پہنو اور اِدھر صوفے پر آؤ "

وہ بولی " بعض لوگ پہلے پلنگ پر آتے ہیں۔ بعد میں صوفے پر جاتے ہیں۔ خیر جیسا تم کہو " اس نے ساڑی پھر پہن لی، اور اکرم کے قریب صوفے پر آکے بیٹھ گئی۔ اس نے میز پر پڑے ڈبے سے ایک سگریٹ سلگا لیا اور دو گلاسوں میں شراب انڈیل لی " تمہارے لئے سوڈا ڈالوں "

اکرم نے کہا " ہاں "

وہ بولی " میں سوڈا نہیں پیتی ہوں " اس نے سگریٹ کا ایک کش لگایا۔ اور پھر اپنا پیگ سوڈا ڈالے بغیر

ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ بولی "کتنا تلخ ذائقہ ہے۔ مگر گھر والے مجھے کبھی شراب اور سگریٹ نہیں پینے دیتے۔ چھپ کر پیتی ہوں"

"وہ کیوں؟"

"پتہ نہیں۔ ایک بار میں نے ابا کے سامنے سگریٹ پی تھی۔ ابا نے مجھے بہت مارا۔ ایک بار میں شراب کے نشے میں مدہوش گھر آئی تو پہلے تو رستے میں شفیع نے مجھے مارا۔ پھر گھر پر جلال آبا نے"

"اور بےبے نے کیا کہا؟" اکرم نے پوچھا۔

"بےبے مجھے بڑا پیار کرتی ہیں۔ چوری چھپے ہم دونوں سگریٹ پی لیتی ہیں۔ مگر شراب کو وہ بھی منع کرتی ہیں۔"

"عجیب چیز ہے۔ مگر کتنا اچھا تلخ ذائقہ ہے اس کا" اس نے دوسرا پیگ انڈیل لیا۔ "یہ کڑوا کڑوا ذائقہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس سے بھی اگر کڑوی شراب مل جائے تو مجھے بے حد پسند آئے"

اکرم نے کہا "شفیع تمہیں پیٹتا ہے۔ اور تم اُسے کچھ نہیں کہتی ہو"

وہ بولی "مجھے اس کا پیٹنا اچھا لگتا ہے۔ جیسے یہ سگریٹ اس وقت مجھے اچھا لگ رہا ہے" وہ کمرے کو چاروں طرف دیکھ کے بولی "کتنا اچھا کمرہ ہے۔ یہ خوب صورت پلنگ۔ رنگین دیواریں۔ یہ پنکھا۔ یہ مدھم مدھم نیلی روشنی والے قمقمے۔ یہ سنہری شراب۔ یہ سفید سگریٹ۔ یہ چمکتے ہوئے بلور کے گلاس ایمان سے میرا ہوٹل تو بہت بُرا ہے۔ اور وہ سرائے کتنی بری تھی۔ جہاں ہم آ کے چند روز ٹھہرے تھے۔ اور لاہور میں میرا گھر کتنا بُرا تھا۔ یوں تو اچھا تھا۔ مگر اس کے مقابلے میں ——" اس نے چُپ ہو کے سر ہلا یا۔

"لاہور میں تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"شالامار باغ کے قریب ہے۔ باغبان پورے میں کچا گھر ہے۔ مگر بڑا لمبا چوڑا آنگن ہے۔ بچپن میں ہمارے ہاں بھینس بھی تھی۔ بےبے اس کا دودھ اور مکھن مجھے دیا کرتی تھی۔ چوری چھپے ایک دفعہ کیا ہوا؟" اور وہ اتنا کہہ کے کھلکھلا کے ہنس پڑی اور اس کے سفید اور متناسب دانتوں کی لڑی بجلی کی طرح کوند

گی"۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ بے بے نے میرے لئے مکھن ڈھیر سارا رکھ دیا اور مصری کی ڈلی الگ رکھ دی۔ اور گھی میں تلے ہوئے نرم نرم چار پراٹھے بھی رکھ دیئے۔ اور ایک گلاس دودھ کا! اتنا گاڑھا دودھ ہوتا تھا وہ کہ کیا بتاؤں تمہیں۔ خیر جی جب میں سکول سے واپس آئی "۔

"تو تم سکول میں پڑھتی تھیں "؟

"ہاں میں اُن دنوں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُس وقت میری عمر کوئی آٹھ سال کی ہوگی۔ خیر جی جب میں گھر آئی۔ اور بے بے تو یہ سب سامان چھیکے میں ڈال کے چلی گئی تھیں۔ اپنے کسی ہمسائے کے یہاں میں نے گھر آتے ہی بستہ زمین پر پٹخا۔ اور اچک کر چھیکا نیچے اتار لیا۔ اور جلدی جلدی سے کھانے لگی اتنے میں شفیع کہیں سے آگیا۔ میں نے اپنا کھانا چھپانا چاہا۔ مگر اس نے دیکھ لیا۔ بولا "بے بے تمہاری طرفداری کرتی ہیں۔ تمہیں اچھا اچھا کھانے کو دیتی ہیں۔ اور اتنا زیادہ کھلاتی ہیں۔ اور ہمیں کوئی نہیں پوچھتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ دوسروں کے گھر میں لڑکے دیکھتا ہوں۔ اُن کی خاطر سب سے زیادہ ہوتی ہے یہاں ہمیں کوئی پوچھتا نہیں ہے۔ بس لڑکی کو کھلائے جاؤ"۔ بس دیر تک میری اُس کی لڑائی ہوتی رہی۔ وہ چھین جھپٹ کے میرا مکھن بھی کھا گیا۔ اور پراٹھے بھی۔ اور دودھ کا گلاس بھی پی گیا۔ اور میں زور زور سے رونے لگی۔ اتنے میں بے بے باہر سے آگئیں۔ اور انہوں نے شفیع کو خوب دھڑا دھڑ مکوں، طمانچوں، لاتوں سے پیٹا۔ رات کو جب وہ سویا تو میری طرف غصے میں پیٹھ کر کے سویا۔ ہم اکٹھے سوئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اس کے جسم کو دباتی رہی۔ اس روز میں رات بھر اپنے بھائی کا جسم دباتی رہی۔ اور پھر آخر اس کے جسم کے اوپر سر رکھ کر سو گئی۔ صبح ہم دونوں کو اس طرح سوئے دیکھ کے بے بے بہت ہنسیں "۔ اور اتنا کہہ کے ولایت پھر کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ پھر یکایک افسردہ ہو کے بولی "اُس وقت میری عمر آٹھ سال کی تھی اب پندرہ سال کی ہوں۔ مگر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے آٹھ سو سال گزر گئے "۔

اس نے تیسرا پیگ انڈیل لیا۔ اکرم نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولی "آج مجھے

کو ۔ کہو۔ جی بھر کے پینے دو۔ مدت کے بعد پی رہی ہوں ۔"
اس نے تیسرا پیگ بھی جلدی سے ختم کر دیا۔ اکرم ابھی پہلے ہی میں تھا۔ جب وہ آگے چلنے لگی تو اکرم نے کہا "مر جاؤ گی" وہ بولی "نہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو پوری بوتل پی جاؤں۔ اور مجھے کچھ نہ ہو۔"
اکرم نے حیرت سے دیکھ کر کہا "کب سے پی رہی ہو" وہ بولی "میں جب گیارہ سال کی تھی، جب میں نے پہلی بار شراب پی تھی۔ اُن دنوں ہم لوگ نئے نئے کراچی آئے تھے۔"
"تو کیا تم کراچی کی رہنے والی ہو؟"
"نہیں ہم تو لاہور کے ہیں۔ باغبان پورے کے۔ وہاں ہماری زمین ہے مکان ہیں۔ آبا کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اور ہم لوگ بڑے مزے میں رہتے تھے۔ پھر آبا مقروض ہو گئے۔ اور ہوتے ہوتے گھر سے سب اُٹھ گیا۔ یہاں دنوں کی بات ہے جب میں پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ بے بے سناتی ہیں۔ کہ جب گھر میں کچھ نہ رہا اور نوبت فاقوں پر آگئی۔ تو بے بے نے پیشہ کر لیا۔ بے بے بڑی حسین تھی۔ سارے خاندان میں بھی اُن کے برابر کوئی حسین عورت نہ تھی۔ جلال آبا اُن کو برقعہ پہنا کر باہر لے جانے لگے۔ ایک دفعہ کسی ہوٹل میں بے بے اور آبا پکڑے گئے۔ بے بے تو بچ گئیں۔ لیکن آبا کو تین ماہ کی قید ہوئی۔ جب وہ تیسرے ماہ رہا ہو کے آئے۔ تو بے بے نے لاہور چھوڑ دیا۔ اور کراچی چلی آئیں۔ وہیں پر شفیع اور میں پیدا ہوئے۔ ہم لوگ جلال آبا کی اولاد نہیں ہیں، ویسے وہ ہمارے آبا ہیں۔ مگر ہم ان کی اولاد نہیں ہیں۔" اکرم نے کہا "ہاں میں بھی غور کر رہا تھا۔ کہ تم دونوں بہن بھائی کی صورت اُن سے بالکل نہیں ملتی ہے۔"
دلایت نے سرگوشی سے اکرم سے کہا۔ حالانکہ اس وقت اُن کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جو اُسے سُن سکے "ہم دونوں شفیع اور میں چچا نبی بخش کی اولاد ہیں۔"
"چچا نبی بخش؟"

"ہاں چچا نبی بخش کا کراچی میں پٹرول کا پمپ تھا، اور سینکڑوں کی آمدنی تھی وہ بچپن ہی سے ہماری بے بے کو چاہتے تھے۔ مگر بے بے کی شادی ماں باپ نے جلال آبا کے ساتھ کر دی۔ اور جلال آبا تو بڑے کاہل اور نکھٹو ہیں جنہیں کام کرنا تو آتا نہیں۔ دن بھر حقہ پیتے رہتے ہیں۔ اسی کاہلی میں زمین بھی ہاتھ سے گئی۔ پھر سر پر پگڑ باندھ کے اور لمبی لمبی مونچھیں رکھ کے اپنی بیوی سے پیشہ کرانے لگے۔ میرا جی چاہتا ہے منہ جھلس دوں جلال آبا کا۔ مگر ڈر لگتا ہے۔"

"کاہے کو ڈر لگتا ہے؟"

وہ بولی "جب سے وہ قید سے رہا ہوئے ہیں۔ اُن کا ڈھنگ بھی بدل گیا ہے۔ اب وہ ہمیشہ اپنے پاس ایک چاقو رکھتے ہیں۔ لمبا سا چاقو۔ گھر میں ذرا ذرا سی بات پر چاقو نکال لیتے ہیں۔ ایک دفعہ تو شفیع کو جان سے مار دینے والے تھے کہ بے بے نے بچا لیا۔ پھر بھی شفیع کی باہوں پر کئی زخم آگئے۔ دو مہینے مرہم پٹی ہوتی رہی۔ سُنتی ہوں پہلے جلال آبا ایسے نہ تھے۔ جب اپنے ہاں زمین تھی۔ مکان تھے پر اب تو ——— خیر جی جانے دو ان باتوں کو۔ تو تم دوسرا پیگ پیو۔ تم اتنے چپ چاپ جو رہتے ہو مجھے بڑے اچھے لگتے ہو" ولایت بیگم نے کہا۔

اکرم بالکل فریفتہ ہو کے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ہر لحظہ حسین تر ہوتی جا رہی تھی۔ شراب کے ہر گھونٹ کے ساتھ نیل گوں روشنی میں پلنگ پر تنی ہوئی مچھر دانی کسی پُراسرار جہاز کا کیبن معلوم ہوتی تھی پلنگ کے اوپر پنکھا تھا۔ جس کی رَو سے مچھر دانی کی شفاف سطح پر ہلکی ہلکی موجیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اکرم نے ولایت بیگم کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور اس سے کہا "یہ پلنگ کتنا خوب صورت ہے۔ بالکل کسی جہاز کے کیبن کی طرح معلوم ہوتا ہے۔"

وہ اس کا بوسہ لے کے بولی "میں نے اس سے بھی خوب صورت پلنگ دیکھے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر کے ہاں پلنگ کے پایوں پر چاندی کے پترے جڑے ہوئے تھے۔"

اکرم نے چونک کر کہا "ڈپٹی کمشنر کو جانتی ہو؟"

وہ بولی "ہاں۔ اس کے پاس امیر ڈرائیور تھا"

"امیر کون ہے؟"

"امیر میرا خاوند ہے"

"تمہارا خاوند ہے؟"

"ہاں" ولایت بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ اس کی آواز لرزنے لگی۔ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی "وہ خبیث۔ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ جب کبھی شراب پیتی ہوں وہ کم بخت سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ یوں آنکھوں کے سامنے جیسے تم اس وقت میرے سامنے ہو۔ تم مسلمان ہو نا"

"ہاں"

"گیارھویں والے پیر کو مانتے ہو؟"

"مانتا ہوں"

"میں گیارھویں والے کی قسم کھا کے کہتی ہوں۔ مجھے اگر کسی سے اس دنیا میں محبت ہوئی ہے۔ تو وہ صرف امیر سے۔ باقی سب جھوٹے ہیں۔ اور ان سے میں بھی جھوٹی ہوں"

اکرم نے بڑے جانباز عاشقوں کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "سچ مچ اب تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا"

"کچھ نہیں۔ رتی بھر نہیں۔ میری چمڑی مرچکی ہے۔ کچھ محسوس نہیں ہوتا"

"حیرت ہے" اکرم نے اپنے گلاس میں شراب کا آخری قطرہ پیتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "حیرت تو ہے۔ مگر امیر پر اب بھی میرا اتنا ایمان ہے کہ وہ اس وقت بھی میرے سامنے آجائے تو میں تمہیں تو کیا ساری دنیا کو چھوڑ چھاڑ کے چلی جاؤں"

"کہاں؟"

"جہاں وہ کہے۔"

"ڈپٹی کمشنر کے پلنگ پر۔"

"وہ نہیں۔ وہ تو مجبوری کی بات تھی ـــــــ"

اکرم نے غصّے میں آکے کہا "کیا مجبوری تھی۔ دوسرا پیگ بناؤ۔"

وہ بولی "جب امیر مجھے اغوا کر کے لے گیا۔ اس وقت میری عمر مشکل سے چودہ سال کی تھی۔ چند ماہ کم ہی تھی۔ گویا کہ میں نابالغ تھی۔ لیکن میں گیارھویں سال ہی سے امیر سے محبت کرنے لگی تھی وہ ہمارے رشتے ناطے والوں ہی میں تھا۔ ایک دن۔ یہ میرے گیارھویں برس کی بات ہے۔ میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اور سکول سے پڑھ کر واپس آ رہی تھی کہ ہمارے کھیتوں کے پاس سے امیر نکلا۔ اور مجھے اپنی باہوں میں اٹھا کر لے گیا۔ میں نے امیر سے پوچھا۔ کیا کرتے ہو۔ وہ بولا ابھی بتاتا ہوں خیر جب میں گھر پہنچی تو ابا میری حالت دیکھ کے بہت پریشان ہوئے۔ بے بے بھی مجھے دھڑا دھڑ پیٹنے لگیں۔ کون تھا وہ حرامی۔ میں نے کہا۔ اپنا چچیرا بھائی امیر میرے ساتھ تھا۔ پھر انہوں نے امیر کو وہ بے نقط سنائیں کہ کیا کہوں۔ بے بے سر پیٹنے لگیں۔ ابا جلال گنڈاسا لے کر امیر کو جان سے مارنے کے لئے نکل پڑے۔ امیر چھپ گیا۔ کہیں ملا نہیں۔ میں تین چار دن کے بعد جب سکول گئی۔ تو رستے میں مجھے امیر مل گیا۔ میں نے کہا۔ مجھے پھر اُٹھا کے لے جاؤ گے تو ابا تمہیں جان سے مار دیں گے۔ وہ مجھے پھر اُٹھا کے لے گیا۔ میں چیختی چلاتی رہی۔ دراصل امیر بڑا خوب صورت جوان تھا، تم نے نہیں دیکھا۔ گول سانولا چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ گھنگریالے بال جب وہ ان بالوں کو جھٹک کے مانگ نکالتا۔ تو دل پر لکیر سی کھنچ جاتی ہے۔ کمر اس کی کیسی پتلی ہے۔ اور چھاتی اتنی چوڑی ہے۔ اور اس نے اپنی چھاتی پر میرا نام گُدوا رکھا ہے۔ وہ بچپن ہی سے مجھے چاہتا ہے۔ اور میں بھی اُسے چاہتی ہوں، مگر ہمارے

گھر والے اس رشتے کے خلاف تھے۔

"وہ کیوں؟"

"بے بے مجھ سے پیشہ کرانا چاہتی تھیں۔ مگر میں امیر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ اور پھر اس نے مجھ پر فتح پائی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرا دل یوں ہونے لگتا جس طرح شکاری کو دیکھ کر ہرنی چوکڑیاں بھول جاتی ہے۔ ہے نا؟"

اکرم نے کہا "سچی محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

وہ بولی "تم مسلمان ہونا؟"

"ہاں"

"گیارھویں والے پر یقین کرتے ہونا؟"

"کرتا ہوں۔"

"اس گیارھویں والے پاک پیر فقیر کی قسم کھا کے کہتی ہوں۔ میں گھر والوں کی مرضی کے خلاف گھر والوں سے چھپ چھپ کر۔ گھر والوں کی مار پیٹ سہہ کر بھی۔ امیر سے ملتی رہی۔ پہلے میں گیارہ برس کی تھی۔ پھر میں بارہ برس پورے کر کے تیرھویں میں آگئی۔ تب میں آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ اور امیر سے برابر ملتی تھی۔"

"وہ کیسے؟"

ولایت بولی "دل ملنا چاہے۔ تو کون روک سکتا ہے۔ دل تو کب سے لے ہوئے تھے۔ پھر میں ایک روز۔ امیر کے ساتھ لائل پور۔ تم نے دیکھا ہے کہ نہیں۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

اکرم نے کہا "میں یوپی کا رہنے والا ہوں۔"

وہ بولی "خیر لائل پور بڑا اچھا شہر ہے۔ سڑکیں چوکور۔ سیدھی ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی اور شہر بالکل گول ایک جگہ سے سیر کے لئے نکلو۔ گھوم کر پھر وہیں آجاؤ گے۔ لائل پور میں کوئی بچہ کبھی کھو جائے تو

گم نہیں ہو سکتا۔"

"خیر تم دونوں بچّوں کا کیا ہوا؟"

"میں چلتے وقت کچھ زیور لے کے آئی تھی کچھ روپے بھی امیر کے پاس تھے۔ پہلے تو امیر نے روپے خرچ کئے۔ ہم لوگ دن رات پلنگ پر پڑے رہتے۔ اور ایک دوسرے کو چومتے رہتے۔ اور جب چومتے چومتے تھک جاتے۔ تو اُٹھ کر سیر کرنے چلے جاتے۔ مجھے امیر نے دو نئے سوٹ سلوا دئے۔ اور خود بھی بوسکی کی قمیص سلوالیں۔ اور کاجوں میں سونے کے بٹن لگائے، اور ریشمی تہمد اور پمپ شو پہن کر جب وہ اور میں اپنے گھر سے نکلتے تو سارے بازار کی نگاہیں ہم دونوں پر ہوتیں۔ بڑے اچھے دن تھے وہ۔ ایسے اچھے دن اب نہیں آئیں گے۔"

"کیوں؟"

"اب میری چمڑی مر چکی ہے۔" ولایت نے ایک سانس میں گلاس ختم کرتے ہوئے اور دوسرا اُنڈیلتے ہوئے کہا۔ "اور پھر پیسے ختم ہو گئے۔ پھر امیر نے مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ پھر میں ہانڈی، توے، چولہے میں لگ گئی۔ اور امیر میرا زیور بیچ کر شراب پینے لگا۔ پہلے وہ شراب نہیں پیتا تھا۔ مگر اب وہ بیوی والا تھا، اور بے کار تھا۔ اسے سائیکلوں کی مرمت کا کام آتا تھا۔ اور وہ فٹ بال بڑا اچھا کھیلتا تھا۔ مگر سائیکل مرمت کرنے والے خود سب کام کرتے تھے۔ انہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ فٹ بال تو ایک کھیل تھا۔ اب وہ بے چارہ کرے تو کیا کرے۔ جب زیور بھی ختم ہو گئے اور ہم لوگ دو دن اور دو رات فاقے سے رہے تو امیر مجھے برقعہ اوڑھا کے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر لے گیا۔ اس کا بیرا امیر کا دوست بن گیا تھا۔ اور ڈپٹی کمشنر کے ڈرائیور نے اُسے ڈپٹی کمشنر کی موٹر پر بٹھا کے موٹر چلانا بھی تھوڑا سکھا دیا تھا اور ڈپٹی کمشنر کا بیرا اور ڈپٹی کمشنر کا ڈرائیور دونوں کہتے تھے۔ کہ اگر امیر مان جائے تو اس کی ساری مشکلیں حل ہو سکتی ہیں۔ میں بہت روئی دھوئی۔ چلائی۔ بین کئے۔ اسے کوسنے دئے۔ اُسے ننگی ننگی

فحش گالیاں دیں۔ اس کی ماں بہن کو اچھی طرح پُنا۔ مگر جب دو رات اور دو دن فاقے کرتے گزر گئے اور منہ میں اُڑکے ایک کھیل بھی نہ گئی تو امیر مجھے برقعہ اوڑھا کے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر لے گیا اور وہاں پر میں نے وہ پلنگ دیکھا جس کے پایوں پر چاندی کے پترے چڑھے ہوئے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟" اکرم نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوتا، امیر موٹر کا کلینر بن گیا۔ میرے لئے بڑے اچھے اچھے کپڑے بن کے آگئے۔ اور زیور بھی۔ اور گھر کا چولہا ویران ہو گیا۔ اور آگ بُجھ گئی اور میرا دل ہر وقت بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ پھر میرے ماں باپ ایک روز مجھے لینے کے لئے آگئے۔ ان کے ساتھ پولیس بھی تھی۔"

"پولیس کیوں تھی؟"

"میں نابالغ جو تھی نا۔ لاہور کی پولیس آئی تھی۔ انہوں نے میرے اور میرے امیر کے ہتھکڑی لگادی، اور ہمیں باندھ کے لے چلے۔ لائل پور کے ڈپٹی کمشنر نے مجھے بچانا چاہا۔ مگر وارنٹ لاہور کے مجسٹریٹ نے نکالے تھے۔ وہ دانت پیس کے رہ گیا۔ چلتے چلتے میں نے سب انسپکٹر کو جو مجھے گرفتار کرنے آیا تھا وہ گالیاں دیں وہ گالیاں دیں کہ بےچارا اپنا سامنہ لے کے رہ گیا۔ ہنس کے کہنے لگا اتنی خوب صورت لڑکی کے منہ سے اتنی بُری گالیاں میں نے آج تک نہیں سُنیں۔ مجھے سچ مچ بہت بُری بُری گالیاں یاد ہیں، ایک دن تمہیں سُناؤں گی۔"

"کب سناؤگی؟"

"جس دن تم سے لڑائی ہوگی جس دن تم مجھے شادی کے لئے کہوگے۔ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

"نہیں تو۔ مگر کیا تم شادی کے خلاف ہو؟"

"ہاں یہ سارے مرد بڑے حرام زادے ہوتے ہیں۔ میرا بس چلے تو اُن کی کھال کھینچ کر انہیں پھانسی پر لٹکا دوں۔"

اکرم نے کہا "تم نے تو ابھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ابھی تو میں نے تم سے شادی نہیں کی"
وہ بولی "تم مجھ سے کیا کھا کے شادی کرو گے"
اکرم نے میز پر گھونسہ مار کے کہا "میں تم سے ضرور شادی کروں گا۔ میں تمہاری زندگی سُدھار دوں گا تم میری نیک طینت بیوی ہو گی۔ میں تمہارا فرماں بردار خاوند۔ اور ہمارے گھر کے آنگن میں ہمارے پیارے پیارے بچے کھیلیں گے۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔"
اور وہ آہستہ سے بولی "اور پھر تم مجھے کسی ڈپٹی کمشنر کے پاس لے جاؤ گے"
وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اکرم بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر وہ چپ ہو گئی۔ پھر اکرم بھی چپ ہو گیا۔ پھر اکرم نگاہ اونچی کر کے اس پلنگ کی طرف دیکھنے لگا۔ جو سرور کے عالم میں اور بھی حسین دکھائی دے رہا تھا۔ اکرم نے ولایت کی کرسی ہاتھ ٹال کے کہا "یہ پلنگ کتنا حسین ہے"
وہ بولی "میں نے اس سے بھی خوب صورت پلنگ دیکھے ہیں۔ بہاولپور میں نواب میران شاہ کے پلنگ میں سونے کے پائے لگے ہوئے ہیں اور اس کی گلابی رنگ کی مچھردانی میں موتی اور جواہر لگے ہوئے ہیں اور اس کے ارد گرد چاروں طرف قد آدم آئینے ہیں۔ اور آرپار ننگی عورتوں کی تصویریں ہیں۔ اور جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو پہلی بار اپنے آپ کو چاروں طرف آئینوں میں دیکھ کر گھبرا گئی۔ اور شرما گئی لیکن نواب بے چارے بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کی عمر پچاس کے اوپر ہو گی۔ بال کھچڑی ہیں۔ ہونٹ اور رخسار لٹکے ہوئے ہیں۔ اور سوتے وقت طاقت کی دوا کھاتے ہیں۔ اُن کے پاس بے شمار دولت ہے بے شمار زمین ہے۔ بے شمار جائداد ہے۔ سنتے ہیں نواب میران شاہ کی دولت کا کوئی حساب نہیں خود چھوٹے لاٹ اُن کے گھر کھانا کھانے آتا ہے۔ اتنا بڑا آدمی مجھ پر عاشق ہو گیا ہے"
"کیسے ہوا۔ کیا اس نے تمہیں دیکھا تھا کہیں پہلے" اکرم نے پوچھا
"نہیں کہیں پہلے تو نہیں دیکھا تھا۔ لے کر تو مجھے میرے ابا جی وہاں گئے تھے۔ لائل پور سے جب میں

اور امیر گرفتار ہو کے آئے تو امیر مجھے رو رو کے سلام کرتا تھا۔ اور میں اُسے رو رو کے دہائی دیتی تھی۔ اور دنیا ہمارا تماشہ دیکھتی تھی۔ پھر جو سب انسپکٹر تھا وہ شفیع کا بڑا دوست بن گیا۔ اور شفیع اس کے ساتھ حوالات میں مجھے ملنے آتا تھا۔ اور میں اس کے سامنے سب انسپکٹر کو اور شفیع کو اور اپنے ماں باپ کو بے نقط سناتی تھی۔ بے چارہ انسپکٹر چُپکے چپکے سب کچھ سُنتا، میں نے اس سے کہا، میں امیر سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس نے کہا میں تمہیں امیر سے ملا دوں گا۔ مگر اس کا تمہیں معاوضہ دینا ہوگا۔ میں نے دیا۔ کیوں کہ میں امیر سے ملنا چاہتی تھی۔ اور جب ہم ملے۔ تو خوب ایک دوسرے سے گلے مل کر روئے اور میں نے امیر سے وعدہ کیا کہ اگر میرے ماں باپ نے اس کے خلاف مقدمہ چلایا تو میں صاف کہوں گی کہ میں اپنی مرضی سے امیر کے ساتھ گئی تھی۔ چنانچہ جب مقدمہ چلا تو میں نے صاف صاف ایسا ہی کہہ دیا اس پر مجسٹریٹ نے امیر کو ضمانت پر رہا کر دیا اور مجھے اپنے ماں باپ کے حوالے کر دیا۔ اور جس دن میں گھر آئی ہوں۔ اور ابھی چین سے بھی نہ بیٹھی تھی کہ دوسرے روز ابا مجھے برقعہ اوڑھا کے نواب میران شاہ کے گھر لے گئے۔ میں بہت روئی دھوئی۔ مگر بے بے نے کہا۔ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ تیرے جانے کے بعد ہم لوگوں نے دس دس دن فاقے کئے ہیں۔ تو کچھ تو گھر کا خیال کر۔ ہم بڈھے ہیں۔ شفیع نالائق ہے۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ تو بھی اگر گھر بار نہیں سنبھالے گی تو روٹی بھی نصیب نہ ہو سکے گی۔ اتنا کہہ کے بے بے رونے لگیں۔ اور میں بھی اُن کے ساتھ رونے لگی اور پھر آنسو پونچھ کر نواب میران شاہ کے محل میں چلی گئی۔" وہ دیر تک چپ رہی۔ پھر رُک رُک کے کہنے لگی۔" نواب کے منہ سے بُری بدبو آتی تھی۔ جیسے اُس نے مردے کھائے ہوں۔ اور اب تو مجھے ہر مرد کے منہ سے ایسی ہی بدبو آتی ہے گلی سڑی لاشوں کی بو۔"

اکرم نے کہا" میں بدبو دُور کر دوں گا۔ میں تم سے بیاہ کر لوں گا۔ تم میری زندگی میں چاند کی کرن۔ سمندر کی لہر۔ بھیروی کی تان بن کے آؤ گی اور کوئی تمہیں چھو نہ سکے گا۔ اور ایک چھوٹا سا آنگن ہو گا۔ جس میں تم اور میں۔ اور ہمارے بچے!"

اُس کی آنکھیں چھلکنے لگیں اور وہ اکرم سے لپٹ گئی بولی: "سچ کہتے ہو کئی بار اس قسم کی سُن چکی ہوں۔ پھر بھی ہر بار یہ سچ معلوم ہوتا ہے" اتنا کہہ کے وہ سسکیاں لے لے کے رونے لگی۔ اس کے دل کی آگ بجھ گئی تھی۔ اور اس کی چڑیا مر گئی تھی۔ اور اس کے سینوں کے پھول مرجھا گئے تھے۔ اور زندگی کے سارے غم اور ایشیائی عورت کے سارے آنسو شراب کے قطروں میں تحلیل ہو چکے تھے۔ اکرم نے پلنگ کی طرف دیکھا۔ اور اب اُسے وہ پلنگ بہت بُرا نظر آیا۔ پُرانا بوسیدہ پلنگ تھا پالش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ مچھر دانی بھی میلی میلی دکھائی دے رہی تھی۔ اور نیل گوں قمقموں کے اردگرد مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

ولایت روتے روتے وہیں صوفے پر سو گئی۔ اکرم حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ نیند میں اس کے اصلی خدوخال اُبھر آئے تھے۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ سوتے ہوئے بچے کی طرح رخساروں پر تازہ سیب کی سی چمک تھی۔ اور پلکیں تھکن سے نڈھال ہو کے گر پڑی تھیں۔ اور اس کی اُلجھی ہوئی آستین سے اس کی صندلی کلائی کی گدر گولائی نظر آ رہی تھی۔ اور اس میں ایک چھوٹا سا گڑھا پڑتا تھا۔ ایک بچے کی کلائی کی طرح اور اس کی اوپر اُٹھی ہوئی باہوں کے نیچے سے کمر کا مرمریں خم نمایاں ہو گیا تھا۔ اور ایک پاؤں صوفے پر اور دوسرا صوفے سے نیچے لٹک رہا تھا۔ اور گول ٹخنے کے پاس ایک گڑھا تھا ایک بچے کی طرح۔ اور اس بچے کی عمر شکل سے پندرہ برس کی ہو گی۔ اور پھر جیسے یہ بچی غائب ہو گئی۔ اور ولایت کے خدوخال میں بے بے کا خفتہ طنز اور اس کی ناک کی تراشش میں جمال آپا کی خشونت اُبھرتی نظر آئی۔ اور جبڑے کی ساخت میں شفیع کا شبہ! یعنی ایک ہی چہرے میں دو اوصاف جمع ہو گئے تھے، سو رہے تھے۔ گڈمڈ ہو کر ایک دوسرے سے مزاحمت کر رہے تھے۔ سوتے وقت بھی جیسے انسان کے چہرے پر جنگ ہو رہی ہو۔ سوچتے سوچتے اکرم بھی اونگھنے لگا۔ اور پھر اچانک چونک کر بالکل بیدار ہو گیا۔ اکرم نے ولایت کو ایک

ٹھوکا دے کر کہا: "اُٹھو۔ آج کی رات سونے کے لئے نہیں ہے۔ جاگنے کے لئے ہے۔ اور ان تمام پلنگوں کی کہانی سُنانے کے لئے ہے جنہیں تم نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دیکھا ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ سونے چاندی اور جواہرات کے علاوہ کیا تم نے کبھی کسی لوہے کے پلنگ کو بھی دیکھا ہے؟"

وہ آنکھیں ملتے ملتے بولی: "ہاں حوالات میں" اور پھر سو گئی اور ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی دراصل اس نے بہت پی لی تھی۔ اکرم نے بوتل خالی کر کے اس میں دیا سلائی سلگا کے پھینک دی اور بوتل میں ایک نیلگوں شعلہ پیدا ہوا۔ اور شعلے سے ایک ہلکی سی گونج پیدا ہوئی۔ اور پھر اکرم نے بوتل کے منہ پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔ اور نیلگوں شعلہ بجھ گیا۔ اور گونج غائب ہو گئی۔ اور اکرم نے سوچا۔ ولایت بھی شراب کی خالی بوتل ہے اس کے اندر نیلگوں شعلہ بھی ہے۔ دھماکے کی گونج بھی ہے۔ مگر یہ شعلہ اور گونج شیشے کی چار دیواری اور ظالم ہتھیلی کے باہر نہیں جا سکتے۔ کیوں نہیں جا سکتے۔ بھلا کیوں نہیں جا سکتے۔ یکایک یہ سوال اکرم کے دل کے گوشوں میں چکرانے لگا جس طرح رات کی سیاہی میں تاریک کمرے میں کوئی بھولی بھٹکی چمگادڑ بار بار چکر لگاتی ہے۔ اس طرح یہ سوال اس کے ذہن کے نہاں خانے میں چکر لگانے لگا۔ آخر سوچ سوچ کر اکرم نے فیصلہ کیا باہر جا کر شفیع کی رائے طلب کی جائے۔ چنانچہ اکرم لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل کر شفیع کے پاس گیا۔

شفیع ہوٹل کے بڑے کھلے آنگن میں موٹر میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

اکرم نے شفیع سے پوچھا: "کیوں شفیع۔ یہ شعلہ کیوں بجھتا ہے۔ یہ گونج کیوں دب جاتی ہے۔ شفیع میرے سالے" شفیع قہقہہ مار کے بولا: "زاہ غنی بادشاہ! تیری شراب دے صدقے۔ ایک گھونٹ فقیروں کو بھی پلا دے!"

گاڑی میں بیٹھ کر اکرم نے شفیع سے کہا "اندر جاؤ۔ ولایت بیگم کو باہر لے آؤ۔"

"کیوں؟"

"مجھے خود معلوم نہیں۔ کیوں۔ ہم واپس چلیں گے۔"

واپسی میں اکرم گاڑی چلا رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر شفیع اور ولایت بیگم تھے۔ ولایت بیگم بار بار اُٹھ کے قے کرتی۔ بار بار اکرم کو اپنی گاڑی روکنی پڑتی۔ اک عجیب بے کلی، بے چینی سی اُس کے دل و دماغ میں بڑھتی ہی جا رہی تھی، وہ الفاظ، اشیا، اجسام کی سطحی خوب صورتی پر قانع کیوں نہیں ہو سکتا؟ جوشی جی کی طرح، اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ سطح کو کرید اور چھیل کر دیکھے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ ہر کاوش اُسے بے قرار کیوں رکھتی ہے؟ وہ چیزوں اور رشتوں کو جیسی وہ ہیں کیوں منظور نہیں کر لیتا۔ ہر آدمی کتنا خوش رہ سکتا ہے۔ ہر روز رات کو آرام سے ایک قبرستان کی طرح سو سکتا ہے۔ اکرم نے سوچا۔ آخر وہ کیا چاہتا ہے۔ زندگی سے۔ اپنے کام سے۔ لوگوں سے۔ ارد گرد کے ماحول سے۔ وہ کیا چاہتا ہے اُن سے۔ کیوں وہ انہیں منظور نہیں کر لیتا۔ جیسا جوشی جی نے منظور کر لیا ہے۔ راج نائی نے منظور کر لیا ہے۔ اور بانکے لال نے منظور کر لیا ہے۔ کیوں نہیں! کیوں نہیں وہ بھی منظور کر لیتا۔

ولایت بیگم اور شفیع کو اُن کے ہوٹل میں چھوڑ کے۔ جب اکرم واپس ہریل پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ رشیدہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے سیڑھیوں پر اکرم کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی چاپ سُنی۔ اور چپ چاپ دروازہ کھول دیا۔ اکرم اندر آ کے ایک ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے اُلجھے ہوئے گھنگھریالے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔ دھیرے دھیرے....

رشیدہ کچھ بولی نہیں۔ چپ چاپ اُس کے پاس کھڑی تھی، یکایک اکرم نے کہا۔

"میں غبرغوش نہیں بناؤں گا۔"

"کیوں ـــــ؟" رشیدہ نے چونک کر پوچھا۔

"بس! میں منظور نہیں کرسکتا" اکرم کے لہجے میں ایک نئی سختی تھی۔

"کیا منظور نہیں کرسکتے"

"وہ ــــــ وہ سب کچھ جو وہ کہتے ہیں اور کرتے ہیں"

"وہ لوگ کون ہیں؟"

"وہ بہت ہیں۔ سینکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ اور انہوں نے فلم انڈسٹری کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے"

"پر تم ان کا مقابلہ کیسے کرو گے؟"

"کیوں کہ وہ سینکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ مگر لاکھوں نہیں ہیں"

"اور وہ لاکھوں تمہارے ساتھ ہیں؟"

"میرے ساتھ تو نہیں ہیں۔ لیکن میں اُن کے ساتھ ہوں۔ آیا؟"

"میرے خیال میں تمہیں ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے" رشید نے اکرم کو گردن سے پکڑا۔ اور اس کا سر نل کے نیچے رکھ دیا۔ اور اوپر سے نل چھوڑ دیا۔

اکرم بانگڑیا کی کمزوری تھا۔ اس لئے جب اکرم نے بانگڑیا سے کہا۔ کہ وہ اس کی پکچر بغیر خوش کی ہدایت کاری نہیں سرانجام دے گا۔ تو بانگڑیا نے اُسے بہت سمجھایا۔ بہت اونچ نیچ دکھائی۔ انڈسٹری کی بُری حالت۔ فاقوں کی تصویریں۔ مستقبل کا لالچ۔ اگر وہ۔ تصویر کامیاب کرسکا تو آگے اپنی مرضی کی تین چار تصویریں بنا سکے گا۔

"تم جانتے ہو" بانگڑیا بولا "ویسے ہاں تو ڈائرکیٹر ہی سبھی کچھ ہوتا ہے۔ ایک طرح سے وہی پکچر کا پروڈیوسر ہوتا ہے۔ روپیہ بھی اسی کے کہنے سے خرچ ہوتا ہے۔ بس ایک دفعہ میں کہانی پسند کروں، اور اداکاروں کا انتخاب ہو جائے۔ آگے میں کبھی دخل نہیں دیتا۔ میں تمہیں ابھی تمہاری مرضی کی تصویر دیدیتا

مگر کیا کروں۔ زمانہ خراب ہے۔ لوگ اچھا سبجیکٹ (موضوع) چاہتے ہیں ؟

"اچھا سبجیکٹ ——— کون سا ہوتا ہے ؟" اکرم نے پوچھا۔

"جو چلے!" بانکے ٹھانے بڑے اطمینان سے کہا۔

"اچھا اداکار کون سا ہوتا ہے ؟"

"جو چلے"

"اچھا سنگیت کون سا ہوتا ہے ؟"

"جو چلے ؟"

"ہیرا بائی بڑودکر اور لتا منگیشکر میں کون اچھا آرٹسٹ ہے ؟"

"لتا منگیشکر ؟"

"طلعت محمود اور بڑے غلام علی خاں میں سے کون اچھا ہے ؟"

"طلعت محمود ؟"

"بال گنگا دھر تلک کے بت اور ہیڈی لامار میں سے کون اچھا ہے . . . ؟"

"کیا احمقانہ بات کرتے ہو ؟" بانکے پانے ذرا غصّے سے کہا۔

اکرم بولا "میں تم کو بتاتا ہوں۔ ہیڈی لامار اچھی ہے۔ کیوں کر وہ چلتی ہے۔ اور بال گنگا دھر تلک کا بت چوپاٹی پر کھڑا رہتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اُس دن تلک کی برسی تھی، اور اتفاق سے اُسی دن ہیڈی لامار بمبئی کے ہوائی اڈے سے گزر رہی تھی۔ اس دن بمبئی کے ہوائی اڈے پر ہزاروں آدمی جمع تھے اور چوپاٹی پر فقط پندرہ بیس آدمی ہوں گے۔ کیونکہ ہیڈی لامار چلتی ہے۔ بلکہ اُڑتی ہے۔ اور تلک اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اس لئے میں غیر خوش نہیں بناؤں گا ؟"

"کیوں ؟"

"کیوں کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم چلتے ہو۔ اور میں بیٹھا ہوں۔ ایک دن نیوٹن بھی اسی طرح بیٹھا تھا۔ اور پھر ایک سیب اس کی جھولی میں گرا اور زمین کی کشش ثقل دریافت ہوگئی۔ ایک دن تمہارا سینما تھا ایک دن آپ کی تصویریں حرکت نہ کرتی تھیں۔ وہ ہلتی نہ چلتی تھیں۔ وہ بیٹھی تھی۔ اس بیٹھے اور چلنے کے بیچ میں ایک ربع صدی کے سائنسدانوں اور محنتی آدمیوں کی ان تھک کاوشوں، ناکامیوں اور محرومیوں کی داستان ہے۔ ان لوگوں کا شکر ادا کرو سیٹھ جن کی وجہ سے آج یہ سینما چلتا ہے۔ اور تم لاکھوں کماتے ہو۔"

"میں موجد نہیں ہوں۔ بزنس مین ہوں۔" بانکڑیا نے اسے یاد دلایا۔

اکرم نے کہا "سیٹھ ہر چیز جو آج چلتی ہے۔ کبھی نہیں چلتی تھی!"

"اس دن میں اسے خرید لوں گا۔" سیٹھ بولا۔

"تو جب تک مجھے خون تھوکنے دو۔" اکرم نے اپنی مٹھی بھینچ کر کہا۔

"تم خون کیوں تھوکو۔ تم کیڈی لیک میں آرام سے کیوں نہ گھومو۔" بانکڑیا نے مسکرا کے کہا۔

"اپنا اپنا حوصلہ ہے سیٹھ۔" اکرم نے کہا "کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہے۔ مگر میں تم سے یہ بات کیوں کر رہا ہوں۔"

اکرم مڑ گیا، اور سیٹھ کی کیبن کا دروازہ کھول کے میڈم کے کیبن میں داخل ہوگیا۔ میڈم کے کیبن کا دروازہ کھول کے جوشی کے کیبن میں داخل ہوگیا۔ جوشی کے کیبن کا دروازہ کھول کے باہر ہال میں چلا گیا۔ ہال سے باہر نو بھارت پروڈکشن کے دفتر کے باہر چلا گیا۔

میڈم اور جوشی دونوں اس کے چلے جانے کے بعد بانکڑیا کے کمرے میں آئے۔ میڈم نے پوچھا "نہیں مانا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم۔ یہ پکچر بھی جوشی جی کو دے دو۔"

"نگران کے پاس پہلے ہی سے دو پکچریں موجود ہیں۔"

"کوئی بات نہیں سیٹھ۔ میں اسے بھی مکمل کر دوں گا۔" جوشی جی نے کہا۔

"اچھا!"

جوشی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اُسے اکرم ذرا بھی پسند نہ تھا۔ سالا اس طرح میری طرف دیکھتا تھا۔ جیسے میں کوئی موری کا کیڑا ہوں۔ آج حساب برابر ہوگیا۔

باہر اکرم دادر مین روڈ سے گزر رہا تھا۔ فلم ایکسٹرا یونین کے دفتر کے باہر، بہت سے ایکسٹرا بھائیوں کے ہاتھ اُسے سلام کرنے کے لئے اُٹھے۔ اکرم ہاتھ ہلاتا ہوا آگے کے ایرانی رستوران میں چلا گیا۔ لوگ آج مجھے سلام کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا خیال ہے میں خبز خوش کا ڈائرکٹر ہوں۔ کل ان کا رویہ مختلف ہوگا۔ چائے کی پیالی منگا کے اکرم سوچنے لگا۔ مگر کل تم کیا کرو گے۔ اکرم آج تم بڑے بہادر تھے۔ بڑے جری۔ نہایت صاف گو آج تم نے خداؤں اور پیغمبروں کی طرح بات کی لیکن کل تم کیا کرو گے اکرم؟

چائے بڑی کڑوی تھی۔ اکرم کا دم رستوران کی کلو نج اور دھوئیں سے گھٹنے لگا۔ وہ جلدی سے چائے پی کے شواجی پارک کی طرف پیدل چل کھڑا ہوا۔ آج وہ سمندر سے باتیں کرے گا۔ یہ لوگ اُسے سمجھ نہیں سکتے۔

بہت دیر تک وہ شواجی پارک کے ساحل پر گھومتا رہا۔ اس کی بھویں تنی ہوئی تھیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے اور اُن سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کے دل کی بحث ختم نہیں ہوئی۔ پھر یکایک

اکرم ساحل کی ریت پر بیٹھ گیا اور مٹھیوں میں ریت بھر بھر کے گرانے لگا۔ اور سوچنے لگا۔

زندگی بار بار نہیں آتی ہے۔ صرف ایک بار آتی ہے۔ اور وقت سمندر کے کنارے ساحل پر پھیلی ہوئی اس بے کنار ریت کی طرح ہے —— تم —— اکرم —— اس میں سے ایک بار کتنی مٹھیاں بھر سکتے ہو ایک —— اور اکرم نے ریت سے ایک مٹھی بھر لی —— یا دو —— اور اکرم نے ریت سے دوسری مٹھی بھی بھر لی۔ بس ایک مٹھی یا دو مٹھی وقت! پچاس برس یا سو برس۔ مگر اس سے زیادہ نہیں . . . . پھر . . . . سوچو۔ تم اس ریت کو کھا نہیں سکتے۔ زیادہ سے زیادہ تم اس ریت کو دوسروں کی آنکھ میں جھونک سکتے ہو۔ سیٹھ بانکے لال کی طرح۔ اور بہت سے لوگ اپنی زندگی میں یہی کرتے ہیں اور وہ لوگ ظالم ہوتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اسی ریت کو دوسروں کی آنکھوں میں ڈالنے کے بجائے اپنی آنکھوں میں ڈال لیتے ہیں۔ وہ لوگ بزدل اور اذیت پسند ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت سے محل بنانے لگتے ہیں۔ اور وہ لوگ احمق ہیں۔ کچھ لوگ نہایت احتیاط سے ریت کے ایک ایک ذرے گننے لگتے ہیں۔ اور وہ اس دنیا کے کنجوس ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت کو اپنے سر پر اٹھا کر ڈال لیتے ہیں اور ہنسنے لگتے ہیں۔ اور وہ لوگ اس دنیا کے بچے ہیں اور اس دنیا کی ساری خوب صورتی اور معصومیت انہیں کے دم سے قائم ہے کچھ بھی ہو جائے۔ اکرم نے سوچا۔ میں بچہ ہی بنوں گا۔

اور وہ ساحل کی ریت سے اٹھ کر گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

رفعیہ بہت اُداس تھی۔ اس ماہ اسے کام بہت کم ملا تھا۔ وہ بھی دو چار بار رضیہ کی سفارش سے۔ اور دو ایک بار فوری ضرورت کے تحت ڈائریکٹروں نے اسے سیٹ پر بلوا لیا تھا۔ دنغما سناٹا تھا۔ وجہ وہی پُرانی تھی۔ اور وہ جانتی تھی۔ مگر اپنی عادت سے مجبور تھی۔ اپنی بہن کے ایک بچے کی پھٹی نیکر سیتے سیتے اس کے منہ سے بے اختیار اک آہ نکل گئی۔ کیوں کہ وہ بڑی بڑی اُمیدیں لے کر بمبئی آئی تھی۔ کیا ہوا اگر اس کا رنگ سانولا تھا۔ میک اَپ کے بعد فلم میں سانولا پن تو دکھائی نہیں دیتا۔ پھر اس کے چہرے کے نقوش اتنے بُرے تو نہ تھے۔ رفعیہ نے وہ نیکر جو وہ اس وقت سی رہی تھی، یہ خیال آتے ہی وہیں فرش پر چھوڑ دی۔ اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور غور سے اپنا چہرہ دیکھنے لگی وہ دن میں کئی بار جب بھی اُسے موقع ملتا تھا ایسا ہی کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل کے اندر کوئی شبہ ہے جسے وہ بار بار مٹانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ بڑے غور سے اپنے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دل ہی دل میں تجزیہ کرتے ہوئے اس نے اپنے چہرے ناک، کان، آنکھیں، ابرو، ہونٹھ، دانت، رخسار، ٹھوڑی۔ اپنے چہرے کے ایک ایک عضو کو اپنے ذہن کے پیچ کش سے کھول کر کسی مشین کے پرزوں کی طرح آئینے کی سطح پر رکھ لیا۔ اور انہیں بڑے

احتیاط سے اُلٹ پُلٹ کر ٹٹول ٹٹول کر پرکھنے لگی کہ کہاں نقص ہے۔

عورت جب اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔ تو سب کچھ بھول جاتی ہے۔ وہ وقت بھول جاتی ہے۔ ماحول بھول جاتی ہے۔ اور بھول جاتی ہے۔ کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ اس سے پہلے وہ کیا کر رہی تھی اور اس کے بعد اسے کیا کرنا ہے مرد اپنا چہرہ اپنے دل کے اندر چھپا کے رکھتا ہے۔ لیکن عورت اپنے چہرے کو آنکھ۔ رخسار اور ہونٹوں کی سطح پر باہر لے آتی ہے۔ اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے رفعیہ کو یہ احساس نہ ہوا کہ کب اس کی کھولی کا دروازہ کھلا۔ کون اندر داخل ہوا۔ اور دبے پاؤں آہستہ آہستہ آگے آتے ہوئے اس کے پیچھے کھڑا ہوا۔ اس قدر انہماک سے وہ اپنا چہرہ دیکھنے میں مصروف تھی۔

پھر کسی نے ہنس کر کہا۔ "کیوں آئینے میں اپنی صورت دیکھتی ہو۔ تم تو ذرا بھی خوب صورت نہیں ہو۔"
اک ہلکی سی حیرت کی چیخ مار کے پیچھے کو مڑی۔ یہ عشرت تھا۔ اور ایک سبز دھاریوں والی ٹی شرٹ اور نئی پتلون پہنے ہوئے۔ جوتے چمکائے ہوئے۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ بغل میں اُس نے ایک بنڈل دبا رکھا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" رفعیہ نے پوچھا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

عشرت نے مسکرا کر بنڈل کھولا۔ اس میں سے پانچ سوتی نیکریں نکالیں۔ یہ رفعیہ کی بہن کے بچوں کے لئے تھیں۔ پھر اس نے ایک قمیص اور چوڑی دار پاجامے کا کپڑا نکالا۔ یہ رفعیہ کی آماں کے لئے تھے۔ پھر اس نے بنڈل کا خالی کاغذ اُٹھا کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ رفعیہ خوش بھی ہوئی لیکن کچھ اُداس بھی۔ عشرت اس کے لئے کچھ نہیں لایا تھا۔ "اور یہ تیس روپے" عشرت نے اُسے دس دس کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ کاہے کے لئے؟" رفعیہ کے دل میں ایک ہلکی سی اُمید کی کرن آہستہ سے جاگی۔

عشرت نے کہا "تمہارے گھر میں رہتا ہوں۔ روٹی کھاتا ہوں۔ سوتا ہوں۔ تم کون سی سورت کی مہارانی

ہو کب تک خیرات بانٹتے جاؤ گی؟"

رضیہ کو ان روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے روپے لے لئے۔ ایک بار بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کا دل اندر سے جیسے بیٹھ گیا ہو۔ عشرت ایک ماہ سے یہاں رہ رہا تھا۔ اُن کے تعلقات بے تکلف دوستوں کے سے تھے۔ وہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن اُس کی عزت بھی کرتا تھا۔ اس کی قربت بھی ایک دُوری تھی۔ اور اُس کے نزدیک آنے میں بھی ایک فاصلہ تھا۔ ایک خوش گوار جھجک جو کبھی کبھی رضیہ کو بہت اچھی معلوم ہوتی کبھی کبھی کھل جاتی کئی بار باتوں اور بحثوں کے دوران میں رضیہ نے محسوس کیا۔ جیسے عشرت اُسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے اُس کا دھیان اس کی باتوں میں نہیں ہے۔ اُس کی نگاہ رضیہ کے جسم پر پھسلتی ہوئی جا رہی ہے۔ رضیہ کو اپنے چہرے پر شبہ تھا۔ اپنے جسم پر شبہ نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ ایک بہت ہی دل کش موہنی۔ اداؤں والے تناسب جسم کی مالک ہے۔ جو چلتے چلتے اکثر لوگوں کو پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے کے لئے مجبور کر دیتا تھا۔ مگر کیا؟ ایک بار بھی تو ایک ماہ میں عشرت نے کوئی چھچھوری حرکت نہیں کی۔ اور وہ نگاہ تو اتنی معصوم ایسی جھجکتی ہوئی تھی کہ اُس کا کچھ بھی مطلب ہو سکتی تھی۔ اچھا بھی بُرا بھی۔ شاید عشرت مجھے پسند نہیں کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتی کیوں تھی کہ عشرت اسے پسند کرے۔ جانے کیوں چاہتی تھی۔ اسے تو ان باتوں سے شدید نفرت تھی۔ پھر وہ کیوں چاہتی تھی کہ عشرت اور کوئی نہیں۔ لیکن عشرت ضرور چاہے۔ ایک بار ان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ کہاں دیکھنا چاہتی ہے۔ لعنت بھیجو جی۔ اُجاڑ۔ ان مردوں پر۔ بڑے بخشے ہوئے ہوتے ہیں۔ عشرت نے کہا "اب۔ تم یہ آئینہ چھوڑو۔ اور جلدی سے ساڑی بدل کے میرے ساتھ باہر چلی چلو۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی چلیں گے" عشرت نے بڑی فراخ دلی سے اس طرح بازو پھیلا کے کہا جیسے آج ساری

زمین اور آسمان اس کا ہو۔
"یہی ساڑی ٹھیک ہے" رفیعہ نے ذرا مشکوک لہجے میں اپنی ساڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اوں ہوں! نہیں چلے گی مادام"
عشرت کھڑکی پر جا کے کھڑا ہو کے باہر دیکھنے لگا۔ رفیعہ ساڑی بدلنے لگی۔
عشرت نے کھڑکی سے مڑے بغیر کہا "اب گھوم کے دیکھ لوں"
"نہیں! نہیں" رفیعہ ایک کونے میں سے چلائی "ابھی نہیں۔ میں ساڑی تبدیل کر رہی ہوں"
"اوکے" عشرت ہنسنے لگا۔

بائی کھلہ سٹینڈ پر عشرت نے زور سے سیٹی بجائی اور ایک خالی ٹیکسی چکر لگا کے بڑے زناٹے سے ان کے قریب آ کے فٹ پاتھ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ رفیعہ نے حیرت سے کہا "ٹیکسی میں؟"
عشرت نے ٹیکسی کا دروازہ اس کے لئے کھول کر اور بڑے احترام سے جھک کر کہا "ملکۂ عالم کے لئے"
رفیعہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اس کے قریب عشرت آ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی کا دروازہ زور سے بند ہو گیا۔
"کہاں چلیں گے؟" عشرت نے پوچھا۔
"تم تم کہو" رفیعہ کو اپنی آواز بڑی اجنبی معلوم ہوئی۔ عشرت نے چند لمحوں کے لئے سوچا۔ پھر اس نے مسکرا کے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "سیٹھ کو لابے چلو"
ٹیکسی ڈرائیور نے مسکرا کے اپنی ٹوپی ٹیڑھی کی، اور ٹیکسی کی رفتار یکایک تیز کر دی۔ اور رفیعہ ایک دھچکے سے عشرت کی گود میں جا پڑی اور عشرت کے تر سے ہوئے نتھنوں میں کسی پُر اسرار خوشبو کی مہک تیر گئی۔ رفیعہ نے جلدی سے اپنے آپ کو عشرت سے الگ کیا۔ اور اپنی سیٹ پر احتیاط سے بیٹھ گئی۔ مگر وہ چند

لمحوں کا لمس بہت دیر تک کسی ساز کے مدھم میٹھے سروں کی طرح اس کے دل و دماغ میں لرزتا رہا۔
کولابے میں سوزین لیڈیز شوز کی دوکان پر عشرت نے ٹیکسی کو رکا اور رفیعہ کو لے کر اندر چلا گیا اندر جاتے ہی ایک باٹی چھریری اینگلوانڈین لڑکی سے کہنے لگا... " وہ شوکیس میں جو سبز رنگ کی اونچی ایڑی کی سینڈل ہے۔ وہ لے آؤ"
وہ لے آئی۔
عشرت نے رفیعہ سے کہا " ٹرائی کرو "
سینڈل ذرا بڑی تھی۔
سوزین بولی "میں آپ کے سائز کا سینڈل لاتی ہوں "
رفیعہ نے وہ سینڈل پہن لی۔
" اب چلو " عشرت نے رفیعہ سے کہا۔
رفیعہ اپنی سبز ساڑی کو سنبھالتے ہوئے دوکان کے اندر بچھے ہوئے غالیچے پر چلنے لگی۔ چلتے چلتے خود بخود اس کی کمر کا خم واضح ہوتا گیا۔ سینہ اُبھر آیا۔ چال میں ایک تمکنت اور ادا پیدا ہوگئی عشرت نے تالی بجاکے کہا " فرسٹ کلاس "
سوزین بولی " اسے باندھ دوں؟ "
عشرت نے کہا " اِسے نہیں۔ اُنہیں " عشرت نے رفیعہ کے گھسے ہوئے پرانے چپلوں کی طرف اشارہ کیا۔
سوزین نے مسکرا کر انہیں ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ عشرت نے وہ ڈبہ اُٹھالیا۔ بل ادا کر دیا۔ اور رفیعہ کے ساتھ آکے باہر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی والے سے کہنے لگا " سیٹھ انڈیا گیٹ چلو "
انڈیا گیٹ پہنچ کر عشرت اور رفیعہ دونوں ٹیکسی سے اُترے۔ عشرت کی بغل میں پرانی چپلوں والا

ڈبّہ تھا۔ سمندر کے کنارے کنارے ایک اونچی دیوار تھی۔ عشرت نے بازو گھما کے زور سے وہ ڈبّہ سمندر میں پھینک دیا۔ رفیعہ چلّاتی رہ گئی۔

"کیا کرتے ہو۔ کیا کرتے ہو۔ میری چپّل!"

عشرت نے کہا۔" مادام۔ یہ پُرانے تپّڑ تمہیں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اب ذرا اس اونچی ایڑی والے سبز رنگ کے سینڈل میں اپنی سبز ساڑی کو جُھلاتے ہوئے چلو۔ دیکھو تمہاری خوب صورتی کا ہر خم کیسے جھلکتا ہے تمہارے جسم کا جغرافیہ اس ساڑی کے باوجود کیسے چھلک چھلک کر باہر آجاتا ہے۔ مادام تم عورت نہیں ہو خوبصورتی کی ایٹلس ہو!"

رفیعہ کی آنکھیں یکایک مسرت سے چمکنے لگیں۔ حیرت۔ مسرت اک نامعلوم سی تھرتھری۔ بولی "یہ آج تمہیں کیا ہوا ہے؟"

عشرت نے کہا۔" کچھ نہیں آج ہوا چلتی ہے۔ گل مہر کے پھول جھولتے ہیں۔ سمندر قہقہے لگاتا ہے بولو اب کہاں چلوگی؟"

رفیعہ نے کہا۔" میں تو کھٹی میٹھی چاٹ کھاؤں گی۔"

چوپاٹی پر انہوں نے کھٹی میٹھی چاٹ کھائی۔ وہاں سے کولابے واپس جا کے انہوں نے سالز برگ میں آئس کریم کھائی۔ سالز برگ سے وہ لبرٹی کے سامنے گئے۔ جہاں رفیعہ اور عشرت نے سنگترے کے پھلوں کا رس پیا۔ یہاں ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ رس والے کے سٹینڈ کے نیچے کھڑے کھڑے عشرت لبرٹی کی بوقلموں روشنیوں کی جھلکیاں رفیعہ کے چہرے پر گزرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ارغوانی۔ شہابی۔ گلابی۔ نیلم۔ یاقوت۔ فیروزہ۔ پکھراج کتنے ہی خوب صورت جواہرات کے سے رنگ رفیعہ کے چہرے پر سے گزرتے جا رہے تھے۔ اور وہ اس وقت کتنی خوش تھی۔ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی سانس تیز تیز لیتی رہی۔ بچّوں کی طرح خوش معصوم اور پُر اعتماد ....

دھیرے دھیرے بارش ہو رہی تھی۔

بارش روشنیاں۔ دھند۔ لوگوں کی گفتگو کسی دوسری دنیا سے آئی ہوئی رفیعہ کا جسم تنا ہوا جب، جوان اور کسی پُراسرار اجنبی پر اسرار خوشبو میں بسا ہوا عشرت نے اپنی آنکھیں بند کر کے رس کا گھونٹ پیا۔ آہستہ آہستہ، جیسے وہ اس کی مٹھاس کے ایک ایک قطرے سے حظ اٹھا رہا ہو۔

یکایک بارش تیز ہو گئی۔ اور دونوں ٹیکسی میں جا پہنچے ٹیکسی چلنے لگی بارش کے تیز تیز زور دار گونج سے کانچ کی کھڑکیوں سے ٹکرا کر بجنے لگے۔ باہر طوفان بڑھ رہا تھا۔ لیکن اندر کتنی خاموشی تھی۔ کتنا سکون تھا۔ وہ اور رفیعہ کل پھر غریب ہو گی۔ اُداسی۔ وہ جانکاہ محنت۔ لہو کا کھیل۔ احساس کا دھوکا اور وہ فریب جو یہ سماج محنت کو ہمیشہ دیتا ہے۔ مگر آج۔ یہ اس وقت کا لمحہ کس قدر معطر، کشید کی ہوئی خوب صورتی اور مسرت کا ہے۔

رفیعہ نے سوچا۔ ہائے یہ لمحہ کتنی صدیوں کے بعد آتا ہے۔ ہائے میں کیسے اس کا دامن پکڑ کے اس کے پاؤں سے لپٹ جاؤں۔ تاکہ یہ لمحہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ میرے لمحے۔ میرے اپنے لمحے میرے اپنے پیارے لمحے آ۔ میرے سینے سے لگ جا۔ میں تجھے اپنی چھاتی سے لگا کے لوری سناؤں گی اور تو میری گود میں۔ میرے سارے ادھورے سپنوں۔ میرے سارے سنہرے خوابوں کو دیکھتا ہوا ــــ سو جائے گا۔ میرے ننھے لمحے.... سو جا.... سو جا....!

معلوم نہیں وقت سو گیا۔ کہ رفیعہ کے احساس سو گئے۔ اس کے سارے شبہے سو گئے۔ وہ بھٹکی ہوئی راہیں اور ہمتیں۔ وہ خوف اور ڈر اور بے گانگی کے موہوم سے سائے سمٹ کر سو گئے اور اس نے ایک ایسی آہ بھری۔ ایسی اطمینان کی۔ اعتماد اور بھروسے۔ مسرت اور خوشی سے لبریز آہ، جو اپنی اداس جلد کے اندر سارے جہاں کی طرب ناک فرحتیں چھپائے ہوئے تھی۔ کوئی مرد اس طرح سے آہ نہیں بھر سکتا عورت بھی کبھی کبھی۔ ایک بار زندگی میں یا دو بار یا تین بار۔ لیکن بار بار نہیں۔ یہ آہ جو آہ نہیں ہوتی زندگی

کی گہری گمبھیر واہ ہوتی ہے۔

رفیعہ جب ٹیکسی سے اُتری تو ایسے لڑکھڑا رہی تھی جیسے اس نے خوشی کی شراب پی ہو عشرت نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ اب وہ میرین ڈرائیو کے آخری سرے پر کھڑے تھے۔ اور بندے کے اُس کنارے کی طرف جا رہے تھے جو سمندر کے بیچ میں چلا جاتا ہے۔ اب بارش رُک گئی تھی اور چاروں طرف دُھند چھا گئی تھی۔ اور وہ دونوں خاموشی سے پتھروں کے پشتے پر بیٹھ کر سمندر کی بے قرار لہروں کو پتھروں سے ٹکرا کر واپس جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ رفیعہ اوپر سے خاموش تھی۔ لیکن اس کا دل ایک عجیب تڑپ اور بے قراری سے بھر گیا۔ بے قراری جو بولتی نہیں ہے۔ لیکن دل میں ایک خنجر کی طرح چبھی رہتی ہے۔ عشرت رفیعہ کو ایک پُرانی غزل سُنانے لگا۔

غزل سُن کر بھی رفیعہ خاموش رہی۔ سمندر کی لہروں کی طرف تکتی رہی۔

کچھ عرصے کے بعد رفیعہ نے کہا۔

"عشرت!"

عشرت رفیعہ کی طرف دیکھنے لگا۔

رفیعہ نے کہا: "مجھے بھوک لگی ہے"

عشرت نے کہا: "یہاں چنوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا"

"چنے ہی لے آؤ"

ہلکی ہلکی سردی میں گرم گرم کُھلے۔ بھُر بھُرے بھُنے ہوئے چنوں کی خستہ روی۔ وہ ہونٹوں کے اندر سے کڑک کڑک کی دھیمی دھیمی آواز۔

رفیعہ کا جی چنوں کے لئے للچا اُٹھا عشرت چنے لینے چلا گیا وہ دیر تک عشرت کو دھند میں غائب ہوتے

ہوسے دیکھتی رہی۔ اے خدا! یہ منظر کس قدر حسین ہے۔ وہ تو اس لمحہ کے قابل کبھی نہ تھی وہ تو اس لائق نہ تھی کہ کبھی ایسی خوب صورتی کے نازک نقوش چھو سکتی۔ یہ گہری پر اسرار دھند جو دنیا کی بدصورتیوں کو اک مہربان ماں کی طرح ڈھک دیتی ہے۔ اور خوب صورتیوں کو ابھار دیتی ہے۔ جو ملتی ہوئی چیزوں کو اپنے لبادے میں آرام سے سُلادیتی ہے۔ اور ساکت چیزوں کو چلنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ رفعیہ نے گھوم کر اُدھر دیکھا بدھر عشرت غائب ہوا تھا۔ میرین ڈرائیو کی بلڈنگیں سطح سے اوپر اُٹھ گئی تھیں۔ اور دھند میں لپٹے ہوئے جہازوں کی طرح اپنے روشن کانچ کی کھڑکیاں کھولے ہوئے تیر رہی تھیں۔ اور ان بلڈنگوں سے پرے ایروس تھیٹر کی آخری گرجا نما منزل کسی بادبانی جہاز کے لمبے مستول کی طرح دھند میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور ٹیک ذیڈ کے مٹی سے گھر چھوٹے چھوٹے ڈونگوں کی طرح اپنے لنگر سے اکھڑ کر دھند میں بہے جا رہے تھے!

پھر رفعیہ نے دھند میں آتے ہوئے عشرت کا چہرہ دیکھا۔ اور وہ لمحہ اور وہ چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی روح پر مرتسم ہو گیا۔ وہ چہرہ وہ کبھی بھول نہیں سکتی۔ دھند میں لپٹا ہوا۔ خاموش خوب صورت۔ آگے بڑھتا ہوا چہرہ۔ وہ چہرہ جیسے اُس کی طرف نہیں آرہا تھا اُس سے بھی پرے کسی پھیلی ہوئی لامتناہی دنیا کی طرف تک رہا تھا۔ کیسا خاموش سُتا ہوا۔ اپنے آپ میں کھویا ہوا۔ دُور کسی دنیا کی آواز سنتا ہوا۔ وہ چہرہ آرہا تھا۔ اور یکایک رفعیہ کا دل خوف سے لرز گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ یہ چہرہ کہیں دھند میں غائب ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں کے اوپر سے تیرتا ہوا۔ ان بلڈنگوں، دھندلکوں، روشنیوں پر تیرتا ہوا دھند کے اجنبی پُراسرار سیاہ و سفید راستوں پر چلا جائے گا۔ جو زندگی اور موت کے بلاوے ہیں۔

مگر نہیں وہ چہرہ قریب آتا گیا۔ قریب آتا گیا۔ بالکل اس کے قریب آکے ٹک گیا اور اس وقت رفعیہ کے سارے احساس اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے تھے اور نہ وہ کچھ سُن سکتی تھی اور نہ دیکھ سکتی

تھی، نہ محسوس کر سکتی تھی۔ صرف یہ ایک چہرہ تھا۔ ایک وہ تھی اور کچھ نہ تھا۔ تاریک سمندر تھا۔ تاریک زمین تھی۔ تاریک دھند تھی۔ اور وہ چہرہ تھا۔ روشنی کے مینار کی طرح طوفان میں بلند اور مضبوط اور جامد۔ رفیعہ نے بے قرار ہو کر عشرت کی بانہہ پکڑ لی۔ عشرت نے چنوں کی پڑیا اُسے دیتے ہوئے کہا "بڑی بھوکی ہو!"

بھوکی تو وہ ہے۔ مگر عشرت کیا تم میری اس بھوک کو سمجھ سکتے ہو۔

عشرت نے سمندر کی لہروں میں چنے کا ایک دانہ پھینکتے ہوئے کہا "رفعیہ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج مجھے جوشی جی کی پکچر میں ایک چھوٹا سا رول ملا ہے۔ بہت چھوٹا سا ہے۔ مگر رول ہے۔ اور یہ وہی جوشی جی ہیں جنہوں نے مجھے فلم ٹسٹ میں فیل کر دیا تھا۔ آج انہوں نے مجھے ایک سو روپے ایڈوانس میں دیئے۔ اب ہم ——— اب ہماری حالت وہ نہیں رہے گی" یہ ہم ——— ہمارے لوگ کون ہیں۔ رفعیہ کا دل کانپنے لگا۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر چپ رہی۔

عشرت ہولے ہولے کہنے لگا۔ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو "اس ماہ میں نے تین سو کمائے ہیں۔ اگلے ماہ چار پانسو کما لوں گا۔ پھر ہم یہاں بھنڈی بازار کی اس گندی کھولی میں تھوڑی رہیں گے؟ کوئی عمدہ چھوٹا سا فلیٹ لیں گے۔ ایک کمرہ تمہارا ہوگا۔ ایک میرا۔ ایک اماں اور بچوں کے لئے۔ ایک سو روپے ہر ماہ اپنی اُمی کو بھیجا کروں گا۔ پھر ہم ...."

پھر وہی ہم ؟ ——— رفعیہ نے گویا اندر سے اپنے کان بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اس ہم کو مت سُنو۔ اس ہم کے قریب مت جاؤ۔ اس ہم کو اندر مت آنے دو۔ دیکھو تم کیسے کانپ رہی ہو۔ یہ ہم کوئی نہیں ہے۔ یہ کہیں نہیں ہے۔ یہ ہم تو بالکل اجنبی ہے۔ یہ ہم جو شام کی ہواؤں میں آیا ہے اور محبت کی میٹھی آواز بن کے آیا ہے۔ اس ہم سے بچ نکلو۔ رفعیہ۔ اپنی روح کی ساری کھڑکیاں روشن دان بند کر لو۔ اور اس ہم کو کبھی مت آنے دو۔

"پھر ہم ہر روز یہاں سیر کے لئے آئیں گے۔ اور کیسے خوش خوش گھوما کریں گے ہم" عشرت نے رفیعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "سنو رفیعہ تم اور ہم"______ پھر وہی ہم؟ یکایک رفیعہ نے کان ہی نہیں آنکھیں بھی بند کرلیں۔ اور اپنی روح کا سارا زور اس ہم کو نہ سننے میں لگا دیا۔ پھر اُسے معلوم بھی نہ ہوا، کہ وہ کیا سُن رہی ہے۔ عشرت کیا کہہ رہا ہے۔ اُسے صرف اتنا معلوم ہوا کہ آنکھیں بند کرنے کے باوجود آنسو بالکل بے اختیار ہوکر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ وہ سِسک رہی ہے۔ اور رو رہی ہے۔ اور وہ "ہم" اس کی ساری کوششوں کے باوجود روشنی کی ایک لکیر کی طرح سارے بند دروازوں اور کھڑکیوں اور روشندانوں سے گزرتا ہوا اس کی روح کے کونے کونے کو منور کر رہا ہے!

رفیعہ بے قرار ہوکر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

دُور کہیں کسی بلڈنگ میں کانچ کی کوئی روشن کھڑکی کھلی اور موسیقی دھند کے بہاؤ پر بہتی ہوئی اس کنارے آگئی، جہاں عشرت اور رفیعہ کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے تکتے ہوئے دھیرے سے عشرت نے رفیعہ کو کھینچ کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ رفیعہ کا سارا جسم کانپا۔ اور پھر کانپ کر یک بارگی عشرت کی باہوں میں پگھل گیا۔

اس آغوش کے باہر غریبی تھی اور بے کاری۔ اور زندگی کے سارے تلخ مسائل۔ رفیعہ نے سوچا لیکن اندر، اس آغوش کے اندر چند لمحوں کی عافیت ہے۔ اور موسیقی کا شکوہ اس کی عظمت اور سطوت۔ خوب صورتی کا بہاؤ جس کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اس آغوش سے باہر جائے گی۔ پھر اسی گھٹن جبس ناانصافی اور ناسپاسی کا مقابلہ کرے گی۔ مگر ان چند لمحوں کے لئے۔ تو وہ اس لازوال موسیقی سے اپنی روح کو قوت اور طاقت سے معمور کرسکتی ہے!....

موسیقی ایشیائی رات کے پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی۔ موسیقی پُراسرار دھند کی لہروں پر ڈولتی ہوئی۔ موسیقی کسی دریائی کشتی کے مغرور بادبان کی طرح اپنا سینہ پھیلائے دھند میں بہتی جا رہی تھی۔

دھند بہتی گئی۔ بہتی گئی۔ یکایک رفیعہ نے محسوس کیا۔ وہ اور عشرت دونوں اکیلے کھڑے ہیں۔ محبت کے ایک جزیرے میں۔ اور چاروں طرف وقت بہہ رہا ہے !!!

روشنی سٹوڈیو اندھیری میں جوشی جی کے سیٹ پر بڑے زور کی بحث چل رہی تھی بحث کرنے والے تھے۔ جوشی اور اکرم اور سننے والے تھے۔ جوشی جی کے اسسٹنٹ، کیمرہ مین، راج لتا اور شمشاد۔ چند ناچنے والی لڑکیاں۔ جن میں رضیہ بھی شامل تھی۔ سیٹ بہت بڑا تھا۔ تصویر گو سماجی تھی۔ لیکن سیٹ فینٹسی یعنی سپنا سی تھا۔ راج لتا ہیرو کے فراق میں روتے روتے سو جاتی ہے۔ اور خواب میں ایک منظر دیکھتی ہے۔ جو اس سیٹ میں دکھایا گیا تھا۔

لیکن جوشی اور اکرم کی بحث اس سیٹ یا اس سیٹ میں لئے جانے والے شاٹ سے متعلق نہ تھی۔ جب سے اکرم نے عنبر خوشس کی ہدایت کاری پر لات ماری تھی۔ اس کی بے روزگاری بڑھتی جارہی تھی۔ اور اب تو اس کے خوب صورت چہرے پر بھی نمایاں ہو چلی تھی۔ اکرم نے پریشان ہوکے گھونٹ لگانے شروع کر دئے تھے۔ جوشی جی نے اکرم پر ترس کھا کے (اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ترس انتقام کا دوسرا چہرہ ہے) اُسے ناچ کا ایک منظر گیت میں باندھنے کے لئے دیا تھا۔ آج اکرم وہ گیت لے کے آیا تھا در اصل اکرم کوئی اور ہی گیت اور ناچ کا کوئی دوسرا ہی منظر لے کے آیا تھا۔ اور اس لئے بھی جوشی جی نے اس کا گیت نامنظور کر دیا تھا۔ ویسے اگر وہ گیت اُنہیں دل سے پسند بھی ہوتا۔ پھر بھی وہ اُسے نامنظور

کردیتے۔ انہیں دراصل اکرم سے کوئی گیت لکھوانا نہیں تھا۔ صرف اُسے ذلیل کرنا مقصود تھا۔ اس وقت بحث کا رخ تیزی کی طرف تھا۔

جوشی جی نے سامنے پڑی ہوئی تپائی پر اتنے زور کا مکا مارا کہ تپائی اُلٹ گئی۔ لال بھبوکا ہو کے بولے۔ "نہیں اکرم بھائی۔ نہیں چلے گا۔ یہ گیت مجھے اپنے ڈانس میں نہیں چاہئے۔ کچھ اس طرح کا گیت لکھو۔ رات جوان ہے۔ آسمان پر چاند ہے۔ میرے پاس آجاؤ"

اکرم نے کہا "مگر ہر ڈانس کے بول تقریباً یہی ہوتے ہیں۔ رات جوان ہے۔ آسمان پر چاند ہے۔ میرے پاس آجاؤ۔ تمہارے اسی سیٹ کے ناچ کے بول بھی تقریباً یہی ہیں۔ کیا ناچ اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ تمہارا ناچ یہ بھی تو کرسکتا ہے۔

دھوپ چمکیلی ہے۔ گیہوں کی بالیاں سرسراتی ہیں۔ آؤ کام کرو۔

یا

بل ٹیلا رہی ہے۔ چمنی سے دھواں نکل رہا ہے۔ سوت کے گولے انسان کے ہاتھوں کے منتظر ہیں۔

یا

برف نے سارے راستے بند کردیئے ہیں۔ گھروں سے کوئی باہر نکل نہیں سکتا آؤ برف ہٹائیں۔

تم نے (RED SHOES) میں جوتوں کا ڈانس دیکھا تھا؟ اور اُخبار کا ڈانس کتنا دلکش اور دلچسپ تھا ہم لوگ کتابوں کا ناچ مثال کے طور پر کیوں نہیں دے سکتے؟"

جوشی جی نے اکرم سے کہا "اے بھائی میرے۔ تم اپنا فلسفہ یہاں مت لاؤ۔ اپنے کو کچھ اور نہیں چاہئے۔ اپن کوئی تجربہ کرنا نہیں مانگتا۔ کوئی خطرہ مول لینا نہیں مانگتا۔ اپن تو یہ ڈانس بھی گھوم پھر کے

بس یہی دے گا۔ رات جوان ہے۔ آسمان پر چاند ہے۔ میرے پاس آجاؤ۔ ہم تمہاری طرح ناکام ڈائرکٹر ہونا نہیں مانگتا۔ اپنے کو کوئی اور ناچ نہیں چاہیئے۔ کوئی اور گیت نہیں چاہیئے۔ کوئی اور خیال نہیں چاہیئے تم کو پیسہ منگتا ہو تو اسی خیال کو گھما کر دوسرے بول میں باندھ کے لاؤ۔ بھوکا مرنا منگتا تو انڈسٹری سے باہر جاؤ۔"

"مگر ملک اور قوم . . ."

"ایسی کی تیسی ملک اور قوم کی۔ سب سے پہلے اپنی جیب گرم کرو۔ دیکھو بھائی۔ ہمارا فنانسر پروڈیوسر بالکڑیا سیٹھ یہی کرتا ہے۔ اس کا ڈسٹری بیوٹر لالہ بھگت لال یہی کرتا ہے۔ اس کا اگز بٹر جور گھرڈے یہی کرتا ہے۔ اور پھر اکھا (سارا) آڈئنس (حاضرین) یہی منگتا ہے!"

"تم لوگوں کی یہ بات میں نہیں مانتا۔ کہ لوگ ہمیشہ اسی طرح کی شاعری کو پسند کرتے ہیں بے شک محبت کی شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں۔" اکرم نے کہا۔ "اور یہ ایک بڑی خوب صورت چیز ہے۔ انسانی محبت، سماج کی بہترین قدروں میں سے ہے۔ لیکن آپ محبت کے ساتھ ساتھ مسائلِ حاضرہ کی چاشنی بھی دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فیض کی شاعری۔"

"کون ہیج؟" راج لتا کے کان کھڑے ہوئے۔ کیوں کہ ہیروئنوں میں وہی انٹل کچوئل سمجھی جاتی تھی۔ شمشاد بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ اس نے بھی لقمہ دیا "ہمیں تو کم ذات کی غزلیں بہت پسند ہیں۔ اس دن تو نے سنائی تھی نا!" شمشاد راج لتا کی طرف دیکھنے لگی۔

راج لتا نے اُسے ٹوک کے کہا۔ "اری کم ذات نہیں ہم زاد۔ تجھے دس بار بتایا ہے۔"

"ہاں ہم زاد، ہم زاد" شمشاد نے دیہاتیوں کی طرح اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا سا تتلاتے ہوئے کہا۔ وہ نہایت ہی خفیف سا۔ بالکل بچوں کی طرح کبھی کبھی ذرا سا تتلاتی تھی۔ اور لوگوں کو اس کا یہ تتلانا اس قدر پسند تھا کہ اُس کی ہر تصویر کے مکالموں میں اس کا جگہ جگہ خیال رکھا جاتا تھا۔

ادب اور آرٹ پر جب انڈسٹری کی دو مہذب ہیروئنیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں تو اکرم خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اُسے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے فائل بغل میں دبایا اور چپکے سے سیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جوشی جی نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور بولے "آئے ہیں علی گڑھ سے انڈسٹری کی حالت ٹھیک کرنے۔ اپنی پتلون کی حالت تو ٹھیک کر نہیں سکتے۔"

اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔

"ایکسٹرا ڈانس گرلز آن دی سیٹ!" جوشی زور سے انگریزی میں چلایا۔ اور رفیعہ۔ رضیہ اور ولایت بیگم اور دوسری لڑکیاں جلدی سے سیٹ کی طرف بھاگیں۔ بابو لال انھیں ہدایات دینے لگا۔

جوشی جی نے بابو لال سے کہا "لڑکیاں اِس شاٹ میں زور سے کولھے مٹکا سکتی ہیں۔ لانگ شاٹ ہے۔ سنسر لانگ شاٹ پر اعتراض نہیں کرے گا۔"

پھر جوشی جی نے مُڑ کر شمشاد اور راج لتا سے کہا "دلبرو، تم بھی میک اَپ کر لو۔ اگلا شاٹ آپ کا ہے۔" راج لتا اور شمشاد میک اَپ روم میں جا بیٹھیں۔ شمشاد نے راج لتا سے کہا "مجھے بے چارے اکرم پر بڑا ترس آتا ہے۔" راج لتا بولی "تو جانی۔ بُلا لانا اُسے اپنے پاس۔ ویسے دیکھنے میں خاصا خوب صورت ہے۔"

شمشاد ہنس کر میک اَپ کرنے لگی۔

اُن کے میک اَپ روم سے دو کمرے پرے ایکسٹرا ہیروئنوں کا میک اَپ روم تھا۔ وہاں ایک غُل غپاڑہ برپا تھا۔ جیسے ان لوگوں کے میک اَپ رُوم میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ شمشاد نے یہ شور سُن کے راج سے کہا "جانی یہ کھُلا ہوا دروازہ تو بند کر دے۔ یہ لوفر لوگ اس قدر شور مچاتے ہیں۔"

راج دروازے کی جانب مُڑی۔ یکایک سامنے سے اُس نے عشرت کو ایکسٹرا میک اَپ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ سبز رنگ کی دھاری دار ٹی شرٹ اور بھوری اونی پتلون میں وہ بہت۔

بج رہا تھا۔ راج لتا یکایک دروازے پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پھر سانس اندر کھینچ کے بولی "ہائے شمشاد بالکل ایلین لاڈ ہے"۔

"کہاں ؟" شمشاد ڈریسنگ ٹیبل سے بھاگی بھاگی دروازے پر آئی۔ عشرت ان دونوں کی طرف پیٹھ کئے ایکسٹرا میک اپ روم کی طرف جا رہا تھا۔ دروازے پر جاکے وہ رُکا۔ اور ذرا سا گھوم کے اُس نے راج لتا کی طرف دیکھا۔ راج لتا اور شمشاد دونوں جلدی سے دروازے کی اوٹ میں ہوگئیں۔ راج لتا نے شمشاد کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کے کہا "دیکھو! کیسے دل دھک دھک کر رہا ہے"۔

شمشاد نے کہا "سچ مچ۔ بالکل ایلین لاڈ ہے"۔

راج لتا نے کہا "اور بے چارہ ایکسٹرا میں کام کرتا ہے۔ ہائے ری کم بختی"۔

شمشاد نے معنی خیز نگاہوں سے راج لتا کی طرف دیکھ کر پوچھا "کس کی کم بختی آئی ہے ؟"

مگر راج لتا نے کوئی جواب نہ دیا پنسل لے کر اپنے ابرو درست کرنے لگی۔

شام کے پانچ بجے کے قریب رضیہ کا آخری شاٹ ختم ہوگیا۔ عشرت کا صرف ایک شاٹ باقی تھا۔ رضیہ نے عشرت سے کہا "میں کینٹین میں چل کے بیٹھتی ہوں"۔

عشرت نے کہا "ہاں تم چلو۔ میں ابھی آتا ہوں"۔

اس کے کوئی بیس منٹ کے بعد عشرت کا شاٹ بھی ختم ہوگیا۔ اور جوشی جی نے تمام ایکسٹرا لوگوں کو چھٹی دیدی اب صرف دو کلوز اپ باقی تھے۔ ایک شمشاد کا۔ ایک راج لتا کا....

راج لتا نے کہا "میرے سر میں درد ہو رہا ہے"۔

جوشی جی نے کہا "بس ایک ہی تو شاٹ ہے"۔

راج لتا جلدی سے بولی "کل دے لینا۔ اس وقت مجھے جانے دو، سر پھٹا جارہا ہے۔"

یہ کہہ کر اور جوشی جی کی مزید گفتگو سُنے بغیر راج لتا جلدی سے سیٹ سے باہر نکل آئی۔ کینٹین راستے میں پڑتا تھا۔ لیکن کینٹین سے پہلے سٹیج سے باہر ایک کھلی جگہ میں راج کی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ راج جلدی سے میک اپ اپنا اُتارے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کے آگے بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد عشرت میک اپ روم سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے باہر نکلا اور کینٹین کی طرف چلا۔ راستے میں اس کے کانوں میں آواز آئی "کہاں جائیں گے؟"

عشرت نے پلٹ کے دیکھا۔ راج لتا اپنی گاڑی میں بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جی؟" عشرت نے پوچھا۔ اس کے کانوں کو اعتبار نہ آرہا تھا۔

"آپ ــــــ آپ کہاں جارہے ہیں؟" راج لتا نے پوچھا "میں آپ کو چھوڑ دوں۔"

عشرت کے منہ سے بے اختیار نکلا "میں بھنڈی بازار میں رہتا ہوں۔"

"آیئے بیٹھیے۔ میں آپ کو وہاں چھوڑ دوں گی۔" راج نے اپنی گاڑی کو سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ مگر بس۔ ایک۔ صرف ایک لمحے کے لئے۔ عشرت ہچکچایا۔ پھر وہ گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔ راج نے گاڑی سٹارٹ کردی۔ گاڑی دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی کینٹین کے سامنے سے گزر گئی۔ "ارے وہ دیکھ تیرا عشرت" رضیہ نے رفیہ کو زور سے ٹھوکا دیا۔ دونوں ایک بنچ پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ رفیہ کے ہاتھ سے پیالی گرگئی۔ اور فرش پر جھن سے ٹوٹ گئی۔ مگر رفیہ کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ بھاگ کر دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ اب کار آگے جا چکی تھی۔ اور راج اور عشرت کا رُخ بھی وہ دیکھ سکتی تھی۔ دو مُسکراتے ہوئے رُخ دو دھاری تلوار کی طرح اس کے سینے میں چل گئے۔

آہستہ آہستہ راج کی گاڑی سٹوڈیو کے دفتر کے سامنے سے چکر کھا کے بڑے گیٹ کی طرف مڑی اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ رفیہ نے رضیہ کا ہاتھ زور سے پکڑ رکھا تھا۔

رضیہ چلائی "اری کیا کرتی ہے۔ بھتنی! ناخن گاڑ دئے میری کلائی میں "

گاڑی اندھیری سے نکلی۔ سٹیشن کے گیٹ سے گزری بمبئی کی جانب مڑی۔ وِلے پارلے گیا سانتا کروز گیا۔ کھار گیا۔ لیکن گاڑی بھنڈی بازار جانے کے لئے باندرہ کی طرف نہ مڑی۔ پالی ہیل کی جانب گھوم گئی۔ جہاں راج نتا کا بنگلہ تھا۔

رضیہ رفعیہ کو پکچر میں لے گئی۔ لیکن کبھی کبھی انسان آنکھیں ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا کان ہوتے ہوئے بھی نہیں سُن سکتا۔ تصویریں رفعیہ کی تپلیوں سے پھسل کر بہتی چلی جا رہی تھیں۔ اس کے دماغ کی تہوں میں نہیں پہنچ رہی تھیں۔ اداکار گفتگو کر رہے تھے۔ مگر اُن کا ایک لفظ بھی رفعیہ کے کان میں نہ پہنچتا تھا۔ اس کے کانوں میں تو کوئی سمندر کی طرح گرج رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ایک گاڑی کو دیکھ رہی تھیں۔ جو دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس قدر اس کے قریب آ جاتی کہ اُسے محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اس گاڑی کے نیچے آ کے دب جائے گی۔

رفعیہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"تصویر نہیں دیکھے گی؟" رضیہ ہمدردی سے بولی۔

رفعیہ نے کہا "میں ابھی باتھ روم سے آئی "

لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ رضیہ جانتی تھی کہ وہ واپس نہیں آ سکے گی۔ تو بھی اس نے اسے جانے دیا۔ کبھی ایسا لمحہ آتا ہے کہ ہمدردی کا ہر لفظ زائد اور بے کار ہوتا ہے رضیہ نے سوچا۔ جانے دو

خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

بچے نکال کر رفیعہ سیدھی گھر گئی۔ مگر عشرت ابھی تک نہ آیا تھا۔ رفیعہ کھانا تیار کرنے لگی۔ کھانا تیار ہو گیا مگر عشرت پھر بھی نہ آیا۔ رفیعہ نے بچوں اور امی کو کھانا کھلا دیا۔

امی نے پوچھا "اور تو ــــــــ؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے"

"عشرت کہاں ہے؟" امی نے پوچھا۔

"اس کی شوٹنگ ہے" رفیعہ نے جھوٹ کہہ دیا۔

اماں غور سے رفیعہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

نو بج گئے۔ عشرت نہیں آیا۔

یکایک رفیعہ بے قرار ہو کے اپنی جگہ سے اُٹھی۔ امی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "کہاں جاتی ہے؟" اس نے لرزتی ہوئی دردناک آواز میں پوچھا۔ "جہنم میں!" رفیعہ اپنی اماں کا ہاتھ چھڑا کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کتنی ہی پُر پیچ گلیاں تھیں۔ کتنے ہی اندھیرے راستے تھے۔ کتنے ہی روشن بازار تھے، کتنی ہی بسیں۔ ٹرامیں۔ وہ کہاں گئی۔ کدھر گھومی۔ کہاں ٹرام میں بیٹھی۔ کہاں بس میں۔ اسے اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ کسے تلاش کر رہی تھی۔ کہاں گھوم رہی تھی۔ کس سے بھاگ کے کہاں جا رہی تھی۔ تمام فاصلے، تمام مجبوریاں۔ ساری حدیں اس کے لئے مر گئی تھیں۔ صرف اس کے دل کے دروازے پر کوئی زور زور سے ہتھوڑے مار رہا تھا۔ ٹھک! ٹھک! ٹھک! کیا جہنم میں شیطان انسان کے دل کو اسی طرح کھلا کرتا ہے؟

راج لتا عشرت کو ساتھ لے کر باندرہ سے ایوان فرّیز میں گئی۔ ایوانز سے وہ دونوں نغانز میں گئے۔ نغانز سے گاڑی تاج کے پیچھے ڈیاس اینڈ سنز کی پورچ میں جا رکی۔ وہاں سے گاڑی جو واپس ہوئی۔ تو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تیار شدہ سوٹ۔ نائی لان کی مردانہ جرابیں۔ جیکب گارڈنز کی ٹائیاں۔ سیگ فین کی ہیٹ بررگ کے جوتے۔ کیمبری رومال اور پیرس گاؤن پڑے تھے۔ گاڑی پھر وہاں سے باندرہ کی طرف ہولی۔ اور پالی ہیل پر چلی گئی۔

جب عشرت غسل خانے میں نہانے کے لئے گیا تو اجمینو نے اپنی بہن سے پوچھا۔

"یہ کیا؟"

"شٹ اپ!" راج لتا گرج کے بولی۔

اجمینو نے پیترا بدل کے فوراً فوجی سلوٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "آل رائٹ مادام! ـــــــ مگر ایک چپل اس خاکسار کے لئے بھی لے آئی ہوتیں۔ رشتے میں بھائی ہوتا ہوں۔"

"یو شٹ اپ!" راج لتا پھر چلّا کے بولی۔

"بہت اچھا مادام!" اجمینو نے کہا۔ "میں اپنے کمرے میں چلتا ہوں۔ مگر اس وقت کی بھنگ کے نشے کی ٹوٹ ہو رہی ہے۔" راج نے اُسے بٹوے سے دس روپے نکال کے دئے۔ اجمینو نوٹ کو انگلیوں میں حقارت سے گھماتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک راج وہیں اپنے کمرے کے باہر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بڑی صاف ستھری مہکی ہوئی رات تھی۔ آسمان تاروں سے مزین۔ زمین روشنیوں سے منور۔ راج پورچ کی سیڑھیوں سے اُتر کر اٹھلاتی ہوئی بنگلے کے باہر آگئی، جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی

آج وہ رات کے وقت شنکر کو اپنے شوہر ڈرائیور کو نہیں لے جا رہی تھی۔ اس وقت اس نے گولڈ بروکیڈ کا فراک پہن رکھا تھا اور بالوں میں پھولوں کے بجائے سفید کوارٹز کے جواہرات کی دینی لگا رکھی تھی۔ اور وہ اس وقت گاڑی کے مڈگارڈ سے لگی ہوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ اور عشرت کا انتظار کر رہی تھی جو ابھی اندر اپنے کمرے سے باہر نہ آیا تھا۔ اس وقت راج لتا نے ان پہلی ہوئی حیران پتلیوں کو مڑ کے نہ دیکھا۔ جو بنگلے کے باہر گاڑی کے قریب گل مہر کے ایک پیڑ کے نیچے سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

"خوب صورت ہے بے حد خوب صورت ہے" رفیعہ نے درخت کے نیچے سے راج لتا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل سے کہا۔ پھر یکایک وہ زور سے ایک سانس اندر کھینچ کے رہ گئی۔ عشرت پورچ سے گزرتا ہوا لمبے لمبے مردانہ ڈگ بھرتا ہوا بنگلے سے باہر آ رہا تھا۔ مگر یہ وہ عشرت نہ تھا۔ ایک میلی غیر استری شدہ پتلون اور ٹی شرٹ میں ملبوس۔ اس وقت اس نے ڈریس سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور اس کی سفید قمیص پر سیاہ بو عجیب بہار دے رہی تھی۔ عشرت کی آنکھوں میں ایک مغرور چمک تھی۔ اور جب وہ راج کے سامنے آکے رکا۔ تو اس کا مسکراتا ہوا، اور کھلتا ہوا گورا رنگ مرکری کی بتی کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگا بالکل بے اختیار ہو کر رفیعہ نے زور سے سانس اندر کھینچ لیا۔ جیسے کہیں بہت دور اس کے دل کی گہری تہوں تک کوئی خنجر اُتر گیا ہو۔

راج نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن گل مہر کے درخت کے آس پاس اندھیرا تھا۔ اور وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ شاید یہ رات کی سسکی تھی۔ یہ رات بھی شاید عشرت کے حسن سے مسحور ہو گئی تھی۔

"لاڈو!" راج لتا نے بڑے پیار سے عشرت کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور پھر وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لئے مڑی۔ اور اس کی گھیر دار گولڈ براکیڈ کی فراک نرم دائروں کی شکل میں گھوم گئی۔ ناچ حلقے۔ موسیقی۔ بہار۔ ترنم۔ راج کے جسم کا ہر لوچ اور ہر خم عشرت کے دل میں جادو جگا گیا۔

"تاج میں چلیں گے" راج بہت دھیمے سے آہستہ سے بولی۔ جیسے وہ نہیں کوئی بوسہ بول رہا ہو۔

رات اور رقص۔ سمندر اور ساحل ———

رفعیہ اور گل مہر ———

مگر گل مہر کے پھول بہت دُور تھے۔ اوپر شاخوں میں تاروں کی طرح اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے۔ اور اُن سے بہت دُور نیچے گل مہر کے تنے سے لگی رفعیہ سسکیاں لے رہی تھی۔ مگر درخت کا تنہ سخت ہوتا ہے۔ اس کی چھال بھی بڑی سخت اور کھردری ہوتی ہے۔ اور اس میں کہیں نرمی اور لوچ، اور وہ درد کو سمجھنے کی قوت نہیں ہوتی۔ جو رگوں میں لہو کے دوڑنے سے آتی ہے۔ تنے کی رگوں میں تو پانی چلتا ہے۔ اور پانی لہو کا درد کیسے سمجھ سکتا ہے۔

کھولی میں بہت اندھیرا تھا۔ اماں جاگ رہی تھیں۔ بوڑھی اماں ہوئے ہوئے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بستر ٹٹول رہی تھیں۔ مگر بستر خالی تھا۔ اماں کو معلوم تھا۔ صرف چند فُٹ پرے۔ رفعیہ سو رہی تھی۔ سو نہیں رہی تھی، جاگ رہی تھی۔ اماں کو معلوم تھا۔ اس کی کچی تیکیے میں سر دیئے رو رہی ہے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رفعیہ کے پاس چلی جائے۔ اس کے سر پر اپنا جھریوں والا ہاتھ پھیرے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کتنے ہی سالوں سے اماں نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی اس کا خاوند مر گیا اور وہ کچھ نہیں کر سکی۔ اس کی بڑی بیٹی کا خاوند مر گیا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ اس کی بیٹی مر گئی اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ چھوٹے چھوٹے پانچ بچے رہ گئے اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ کیوں کہ اسے کچھ کرنا سکھایا ہی نہ گیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ عورتیں بیاہنے کے لئے بستر پر لیٹ جانے کے لئے اور بچے پیدا کر کے اُن کی پرورش کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اُن کے خاندان میں ہمیشہ ایسا ہوتا آیا تھا اور ان کے آس پاس کے خاندانوں میں ہزاروں سالوں سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اس لئے جب بھی کوئی مصیبت آتی تو عورت دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اُٹھا دینے کے سوا اور کیا کر سکتی ہے۔ اور اماں کی تو زندگی کا اب ہر ایک لمحہ مجسم دُعا تھا۔ دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھے ہوئے کس باقاعدگی سے

۔ وہ نماز ادا کرتی تھیں۔ کس خضوع وخشوع سے ہر روز دعا مانگتی تھیں "میری رفیہ ٹھکانے سے لگ جائے۔ یہ چھوٹا سا کنبہ کسی طرح سنور جائے۔ اے خدا ! اے خدا ! اے خدا۔۔۔۔"

لیکن آج اندھیرا بہت تھا۔ اور اس اندھیرے میں رضیہ آہستہ آہستہ بہت ہی آہستہ جیسے اپنے سینے کا سارا سوز اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے سسک رہی تھی۔ اور اماں کا دل اپنے بستر پر لیٹے لیٹے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ مگر یہ دل ٹکڑے کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ خون کا سوتا رگوں میں خشک کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ دھیمے دھیمے چلنے والا سانس ایک بارگی آکے ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔ وہ کب تک اپنی بچی کی ہر مصیبت دیکھتی رہے گی۔ اے خدا۔۔۔ تم اس قدر دور کیوں ہو۔ اتنے دور ہم سے کیوں ہو، آسمانوں میں رہنے والے آؤ نا۔ اس کھولی میں اتر آؤ۔ اس کا اندھیرا دیکھو۔ اس کی غریبی دیکھو۔ اس کی آہوں میں سانس لو۔ میرے رب۔ میرے مولا۔ میری بچی اس طرح سسک رہی ہے۔ اور تم سے کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا اے خدا کیا ؟

یکایک اماں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ توبہ۔ توبہ۔ میں کس کی شان میں یہ گستاخی کر رہی ہوں۔ میرے مولا۔ مجھے معاف کر دے۔ میرے گناہ بخش دے۔ یہ میں کیا بک رہی ہوں۔ سچ سچ ان مصیبتوں نے میری عقل مار دی ہے۔۔۔۔

مگر رضیہ کو اس بحث سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ خدا اور گناہ۔ دعا اور جزا کے سہارو ں سے الگ ایک کونے میں میٹھی سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان روتی جاتی تھی۔ آج چاروں طرف مکمل اندھیرا تھا۔ اور کہیں روشنی نہ تھی۔ انسان کے دل میں ایک شہر ہوتا ہے۔ اس کی گلیاں اور بازار ہوتے ہیں۔ جہاں یادوں اور مرادوں کا ایک ہجوم رہتا ہے۔ اس کی دوکانوں میں ہزاروں طرح کی تمنائیں بکتی ہیں۔ خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ اس کے کارخانوں میں محنت سانس لیتی ہے۔ اور اس کے باغوں میں کبھی کبھی چاند چمکتا ہے۔ اور پھول ہنستے ہیں اور آہستہ خرام جوڑے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے

خاموش نگاہوں سے محبت کا پیام دیتے ہیں۔

دل کا شہر بھی انسان کے شہر کی طرح بستا ہے۔ محنت کرتا ہے۔ کام کرتا ہے، ہنستا ہے اور روتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے دِن آتے ہیں۔ جب ہر لمحہ عید ہوتا ہے۔ ہر یاد اک نیا جوڑا پہن کر نکلتی ہے۔ ہر تمنا بنی سنوری ہتھیلیوں میں حنا کی منقش تصویریں سجائے۔ ہر اُمنگ ننھے ننھے بچوں کی طرح خوشی سے ہنستی ہوئی، کلکاریاں مارتی ہوئی ہر آرزو جوان اور بلند مستقبل کی خوشبو سے مہکتی ہوئی دل کی گلیوں اور بازاروں میں نکل آتی ہے۔ اور خوشیوں کے میلے میں اور مسرتوں کے اژدہام میں کھو جاتی ہے۔

مگر آج اس شہر میں کیسا سناٹا ہے؟ آج دل کی پُر پیچ گلیوں اور بازاروں اور سڑکوں پر اندھیرا ہے۔ آج کہیں پر روشنی نہیں ہے۔ آج کوئی مراد نہیں چلتی۔ کوئی آرزو نہیں بجتی۔ کوئی اُمنگ نہیں ہنستی۔ آج سارے دریچے بند ہیں، اور سارے دروازے مقفل ہیں، اور سارے بازار خالی ہیں صرف کہیں کہیں ہر موڑ پر چند بوڑھی یادیں گزرے ہوئے ایام کا سیاہ لبادہ اوڑھے ہولے ہولے ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہی ہیں۔

آج سارا شہر خالی ہے۔ آج سڑکوں پر روشنی نہیں۔ باغوں میں چاند نہیں، پیڑوں میں پھول نہیں۔ آج وہ بینچ بھی خالی ہے جہاں رضیہ اور عشرت بیٹھا کرتے تھے۔ یکایک رضیہ کو ایسا محسوس ہوا، جیسے آج کے بعد یہ بینچ ہمیشہ خالی رہے گا۔

انسان کا دل بھی ایک عجیب شے ہے۔ وہ کسی یاد کو تو ایک خوشبو میں بدل دیتا ہے۔ جو زندگی بھر مہکتی رہتی ہے۔ کبھی ایک کانٹے میں جو زندگی بھر چبھتا رہتا ہے۔ اور کبھی ایک تصویر میں جو زندگی بھر ایک ہی چوکھٹے میں جڑی، ایک ہی دیوار پر ٹنگی ایک ہی زاویے سے دکھائی دیتی چلی جاتی ہے۔ یکایک رضیہ کو محسوس ہوا جیسے آج کے بعد وہ اُس باغ میں کبھی نہیں جائے گی۔ جہاں وہ عشرت کے ساتھ گھومنے جایا کرتی تھی۔ اس بینچ پر نہیں بیٹھ سکے گی۔ جہاں عشرت کے ہاتھ خود بخود اس کی کمر کے

گرد آجایا کرتے تھے ــــــــــ

نہیں وہ پیچ آج کے بعد ہمیشہ خالی رہے گا۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوا۔ لیکن جب اس نے اس تصویر کو چوکھٹے میں جڑ کے وہاں سامنے کی دیوار میں گویا لگا دیا۔ تو اُسے اطمینان سا محسوس ہوا۔ اس کی سسکیاں اور ہچکیاں بند ہوگئیں۔ اس کی پلکیں بھاری ہوتی گئیں۔ اور آخروہ مدھم مدھم سانسوں کے درمیان نیند کے جھونے میں بہتی ہوئی کھو گئی۔ اور چونکہ وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ اس لئے صبح بہت دیر تک سوتی رہی۔

صبح ہوگئی۔ سورج نکل آیا۔ بازاروں میں ٹرامیں اور بسیں اور راہ چلتے لوگوں کا شور بڑھ گیا مگر رفیعہ بڑے آرام سے سوتی رہی۔ اس کی اماں نے بھی اُسے نہیں جگایا۔ اس نے اپنی بیٹی کے رخساروں پر رات کے آنسوؤں کے خشک نشان دیکھے۔ اور اُسے سوئے رہنے دیا۔ اور خود ہی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گھر کا سارا کام کاج کرتی رہی۔ برتن صاف کرکے۔ گھڑے میں پانی بھر کے۔ چوکا پونچھ کے کھانا پکا کے اماں جب فارغ ہوئیں تو انہوں نے دیکھا رفیعہ ابھی تک بے سُدھ فرش پر سورہی تھی۔ کھڑکی سے جب روشنی رفیعہ کے چہرے تک آنے لگی تو اماں نے آہستہ سے کھڑکی کے قریب جا کے اس کے پٹ بند کر دیئے۔ اور واپس آکر بچوں کے لئے کھانا نکالنے لگیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اماں نے اُٹھ کے دروازہ کھولا اور حیرت سے اُن کی گگھی سی بندھ گئی۔ اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے عشرت کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔ یہ عشرت تھا۔ مگر شاید کوئی اور ہی عشرت تھا۔ اتنے اچھے لباس پہنے ہوئے اِس طرح وہ صاف ستھرا خوشبوؤں میں لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔ کہ اماں تو دروازے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عشرت نے مسکرا کے کہا " اماں مجھے اندر نہیں آنے دو گی؟"

اماں دروازہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑی ہوگئیں۔ لیکن اب بھی ایک لفظ اُن کے منہ سے نہیں نکل سکا۔ عشرت اندر آگیا۔ اس نے ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر آگے بڑھ کر سوتی ہوئی رفیعہ

کی طرف دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر جھک کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ رضیہ کا سینہ ذرا سا کھلا تھا۔ ہونٹ بھی ذرا سے نکلے تھے۔ آنکھیں بھی۔ مگر وہ نیند میں مستغرق تھی۔ عشرت کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

عشرت نے کہا " رضیہ "

رضیہ سوتی رہی۔

پھر عشرت نے رضیہ کو ایک ٹھوکا دیا۔ رضیہ ہڑبڑا کے جاگی۔ اور اپنے سامنے عشرت کو اس قدر قریب دیکھ کر حیران اور پریشان ہو گئی اور گھبرا سی گئی۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے دو ایک بار اپنی آنکھیں مل کر عشرت کی طرف دیکھا۔ اُسے چھوا۔ جب جا کے اُسے یقین آیا اور جب یقین آیا تو بے اختیار اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔

عشرت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے رضیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا " پگلی۔ تو کیا سمجھتی تھی میں نہیں آؤں گا "

رضیہ نے اس کے نئے سوٹ کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ اس کے چمکتے ہوئے جوتوں پر پڑی۔ خوبصورت ٹائی پر آسمانی رنگ کی دھاری دار قمیص پر۔ اس کے سونے کے بٹنوں پر۔ وہ چپ رہی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

عشرت نے رضیہ کی خاموشی کے کھچاؤ کو محسوس کیا۔ بولا " تم نے نہیں پوچھا۔ تم رات کہاں رہے ؟"

رضیہ بولی " پوچھنے کی ضرورت ہے کیا ؟" یکایک اس کے لہجے میں تلخی سی آگئی۔

عشرت خاموش ہو گیا۔ وہ نگاہیں جھکا کر رضیہ کے دوپٹے کو اپنی انگلیوں پر لپیٹنے اور کھولنے لگا۔

رضیہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

عشرت آہستہ آہستہ بولا " بات یہ ہے رضیہ۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے "

" میں جانتی ہوں۔ کوئی نئی بات بتاؤ "

عشرت پھر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک پھر اس کے دوپٹے کے کنارے سے کھیلتا رہا۔ پھر کہنے لگا "میں بے وفا نہیں ہوں۔"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔" رضیہ بولی۔

عشرت نے کہا "مان لو۔ رضیہ میں۔ بے وفا نہیں ہوں۔ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں۔ اپنی اور تمہاری بہتری کے لئے کر رہا ہوں۔ یہ صرف ایک طریقہ ہے اچھے دنوں کو لانے کے لئے تمہیں تو معلوم ہے یہ فلم انڈسٹری کیسی ہے۔ یہاں جب تک کوئی کسی کی سفارش نہ کرے کام نہیں چلتا۔ تم خود ہی اپنے آپ کو دیکھ لو۔ راج کو دیکھو۔ شمشاد کو دیکھو۔ رنجنا کو دیکھو۔ اوشا کو دیکھو۔ کسی بھی ہیرو یا ہیروئن کو لے لو کسی نہ کسی کے کندھے پر سوار ہو کے آگے بڑھے ہیں۔"

"تم کس کا کندھا پکڑ رہے ہو۔" رضیہ نے پوچھا۔

عشرت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بولا "دنیا اسی طرح کی ہے۔ میرا مطلب ہے۔ ایک زینے کی طرح۔ جب آدمی ایک زینہ چڑھتا ہے تو پچھلا زینہ چھوڑ دیتا ہے۔ میرے لئے راج ایک زینے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے ہیرو کا چانس دلوانے کا وعدہ کیا ہے۔ جوں ہی میں ہیرو بنا۔ اور تم جانتی ہو۔ راج اس انڈسٹری کی مشہور ترین ہیروئینوں میں سے ہے۔ وہ مجھے چانس دلوا سکتی ہے جوں ہی میں ہیرو بنا میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"ایک زینے کی طرح؟" رضیہ نے پوچھا۔

عشرت نے رضیہ کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "میں صرف تم سے پیار کرتا ہوں۔ صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ کیا تم سمجھتی ہو مجھے تمہارے دکھ کا علم نہیں ہے۔ وہ دکھ تو مجھے بھی ہے۔ تم سے جدائی۔ یہ عارضی جدائی ہی ہوگی۔ تم سے جدا ہو کر مجھے تکلیف نہ ہوگی؟ مگر ڈارلنگ اپنے مستقبل کے لئے۔ ان بچوں کے مستقبل کے لئے مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ میں جب ہیرو

بن جاؤں گا تو ایک سا ندار بنگلہ خریدوں گا۔ دو عمدہ گاڑیاں ہوں گی۔ ایک میرے لئے۔ ایک تمہارے لئے۔ پھر میں اپنی امّی اور اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی یہاں بلا لوں گا۔ پھر تمہارے لئے فلم میں کام کرنا ضروری نہ ہو گا۔ بلکہ میں تمہیں کام کرنے بھی نہ دوں گا۔ یہ ذلیل محنت!"

"محنت کبھی ذلیل نہیں ہوتی۔ اگر عزت سے کی جائے" رفیعہ غصّے میں آ کے بولی "تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اگر چاہوں، تو یہ کھولی تبدیل نہیں کر سکتی؟ ایک بنگلہ نہ سہی، ایک فلیٹ تو لے سکتی ہوں۔ نئی گاڑی نہ سہی۔ سیکنڈ ہینڈ گاڑی تو خرید سکتی ہوں۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ ہار نبی روڈ پر مادام سلاجی کے کانچ کے دریچوں میں سلور بروکیڈ کے فراک دیکھ کر میری روح بے قرار نہیں ہو جاتی؟ کیا تم سمجھتے ہو، میں عورت نہیں ہوں۔ میرا جی خوب صورت ساڑیوں، خوش نما بلاؤزوں اور نئے نئے زیوروں کے پہننے کے لئے نہیں للچاتا۔ کیا میں نہیں چاہتی کہ میرا بھی اچھا گھر ہو۔ خوب صورت پردے ہوں۔ رات کی مدھم مدھم روشنی میں ریڈیو گرام ایک کونے میں بجتا ہو۔ میری بہن کے بچّے اچھے خوب صورت کپڑے پہنے اس کے گرد جمع ہو کے بچّوں کا پروگرام سنتے ہوں۔ کیا تم سمجھتے ہو میرے دل میں یہ تصویریں نہیں۔ سب ہیں لیکن میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ اُن تصویروں کو خریدنے میں مجھے جو کچھ بیچنا پڑے گا۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ میں اُن تصویروں کو پھاڑ ڈالوں۔ میں خالی دیواروں میں رہوں گی۔ ایک اندھیری کھولی میں۔ فلم والے اگر مجھے کام نہیں دیں گے تو میں کسی گھر میں جھاڑو دوں گی، برتن صاف کروں گی۔ کسی کے بچّے کی آیا بن جاؤں گی۔ پتھر سڑک پر کوٹنے لگوں گی! سمجھے؟ کل تک تمہارا بھی یہی خیال تھا۔ آج تم کیسے بدل گئے ——————؟"

"غریبی رفیعہ!" عشرت نے کہا "غریبی بہت کچھ کرا دیتی ہے۔"

"میں نہیں مانتی کہ غریبی میں آدمی اپنی عزت بھی کھو دیتا ہے۔ یہ ہمارے آس پڑوس کی سیکڑوں عورتیں کام کرتی ہیں، چاول کوٹتی ہیں، بازار میں سبزی بیچتی ہیں، کارخانوں میں کام کرنے جاتی ہیں۔ غریب آدمی

پر بدکاری کا الزام نہ لگاؤ۔ اپنی کمزوری دوسروں سے منسوب نہ کرو۔ میں ہر روز اِن غریب عورتوں کو دیکھتی ہوں۔ ان میں سے کئی ایک بے حد حسین ہیں۔ تمہاری کئی ہیروئینوں سے بھی زیادہ حسین ہیں۔ اُن کے پاس نہ ریڈیوگرام ہے، نہ کار ہے۔ نہ فلیٹ ہے۔ نہ سونے کے زیورات ہیں۔ مگر ان کا دل تو فاحشہ بننے کو نہیں چاہتا۔ میں کیوں انہیں بازار میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھتی۔ کبھی کبھی اُن کے ہاں فاقے بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کا بچہ دوا نہ ملنے سے مر بھی جاتا ہے۔ پھر؟ وہ روتی ہیں۔ دو دن ہائے وائے کرتی ہیں۔ پھر جی مضبوط کر کے کارخانے میں کام کرنے چلی جاتی ہیں۔ کیوں اُنہوں نے اپنے آپ کو نہیں بیچا۔ جیسے تم نے آج اپنے آپ کو بیچ دیا ہے۔ تمہارا خیال ہے۔ اس گیبرڈین کے سوٹ میں ریشمی ٹائی اور چمکتے ہوئے جوتوں میں تم بہت حسین معلوم ہو رہے ہو؟ میں تمہیں بتاؤں تم طوائف معلوم ہوتے ہو۔ ایک مرد طوائف !!!"

عشرت ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے کسی نے اُسے گولی ماری ہو۔ پھر یکایک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رضیہ سے منہ پھیر کے کہا "تم دیوانی ہو گئی ہو۔ تم دیوانی ہو گئی ہو"

پھر وہ اماں کی طرف مڑا۔ اور اُنہیں ایک سو کا نوٹ دیتے ہوئے بولا "اماں یہ تو پگلی ہے۔ آپ تو مجھے جانتی ہیں۔ میں ——— میں۔ یہ سو کا نوٹ تو رکھئے۔ میں ہر ماہ کبھی نہ کبھی اِدھر آیا کروں گا۔ پوچھ لیا کروں گا۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو آپ رضیہ سے نہیں مجھ سے کہہ دیا کیجئے۔ میں خود خیال رکھوں گا۔ میں ہر ماہ آپ کے لئے ——— میرا مطلب ہے ——— آپ کا خرچہ یہاں پہنچا دیا کروں گا"

رضیہ نے گرج کر اماں کے ہاتھوں سے وہ سو کا نوٹ چھین لیا۔ اور اس کے سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے بولی "یہ تم میری محبت کی قیمت چکانے آئے ہو"

رفیعہ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

عشرت نے کھسیانہ ہو کے کہا "تم ــــــ تم ــ ــ ـ سمجھتی نہیں ہو"

"جاؤ۔ چلے جاؤ۔ عشرت آج کے بعد کبھی اپنی صورت نہ دکھانا"

اور جب عشرت چلا گیا تو یکایک رفیعہ کے دل کی ساری دیواریں ڈھے گئیں۔ اور وہ منہ پھیر کے ایک کونے میں موڑ کے اپنے ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کے کہنے لگی "نہ جاؤ عشرت، کہیں نہ جاؤ یہ کھولی تمہاری ہے، میں تمہاری ہوں۔ میری ساری زندگی تمہاری ہے۔ آجاؤ عشرت۔ میری زندگی کے جوتے بنا کے اپنے پاؤں میں پہن لو۔ مگر یہاں سے نہ جاؤ۔ اُس گندی غلیظ بدبودار دنیا میں ــــ"

رفیعہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

پہلے پندرہ روز راج لتا بالکل دیوانوں کی طرح رہی۔ یہ دن کچھ اس طرح کے تھے جیسے جذبات کی چڑھتی ہوئی آندھی ہو، یا مون سون کی موسلادھار بارش ہو، یا سمندر میں لہریں تھپیڑے لیتی ہوں۔ اور اپنی اچھال میں کشتی کو کبھی بہت اوپر اور کبھی بہت نیچے ڈولاتی ہوئی لے جائیں۔ اُن پہلے پندرہ دنوں میں راج لتا۔ کیوں۔ کب۔ کہاں اور کیسے کے تمام سوالوں کو جو ہر فرد کی زندگی میں آتے ہیں۔ بالکل بھول چکی تھی وہ ایک لمحے کے لئے بھی عشرت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔ ان پندرہ دنوں میں وہ اپنے بنگلے سے باہر نہیں نکلی۔ اور اگر کہا جائے کہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تو زیادہ صحیح ہوگا۔ کبھی کبھی تو وہ صبح کی چائے ناشتہ، دوپہر کا کھانا شام کی چائے اور رات کا کھانا بھی وہیں منگا لیتی تھی۔ کبھی کبھی خود سٹوو جلا کے عشرت کے لئے مُرغ بھونتی تھی۔ راج لتا بہت اچھا کھانا بنا سکتی تھی۔ کیوں کہ جس گھر سے وہ آئی تھی۔ وہاں اُسے خود کھانا تیار کرنا پڑتا تھا۔ بیرہ تو وہ بعد میں ہوئی۔ پہلے تو وہ شنکر کی بیوی تھی۔ شنکر جو اب اس کے گراج میں رہتا تھا۔ مگر اب راج کو جیسے کسی کی پرواہ نہ تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں کہ اس سے پہلے معاشقے نہ ہوئے ہوں۔ راج کو تو اب اُن کی تعداد بھی یاد نہ تھی۔ مگر یہ چیز الگ تھی۔ یہ جذبہ ہی کچھ اور تھا۔

بس یہ شے اصل ہے۔ راج نے سوچا عشرت کے بغیر تو وہ زندہ کیسے رہ سکے گی۔ سٹوڈیو شوٹنگ کرنے کیسے جائے گی۔ شروع کے پندرہ دنوں میں اس نے ایسا ہی کیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی بلکہ شوٹنگ پر بھی نہیں گئی۔ بہت سے پروڈیوسر آئے اور واپس چلے گئے کسی کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ان دنوں میں وہ عشرت کے سوا کسی کی صورت بھی دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ ایسی مرمٹی تھی اس پر۔

گھر میں سب لوگ پریشان تھے یوں تو راج کی بے راہ روی سے سب آگاہ تھے۔ بلکہ ایک طرح سے اس بے راہ روی کی ترغیب دینے والے بھی وہی تھے۔ راج کے ماں باپ بہت غریب تھے، راج بہت حسین تھی۔ شنکر اُن دنوں دولت مند تھا۔ کیا ہوا اگر وہ ادھیڑ عمر سے اوپر کا تھا۔ اُنہوں نے پانچ ہزار روپے لے کر راج کو شنکر سے بیاہ دیا۔ لیکن جب شنکر غریب ہو گیا اور منافع والے سماج میں یہ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کون امیر کب غریب ہو جائے گا اور کون غریب کب امیر ہو جائے گا۔ زندگی کی دوڑ ایک مسلسل غیر یقینی دوڑ ہوتی ہے۔ راج اپنے بڈھے خاوند سے جھگڑ کے اپنے ماں باپ کے پاس چلی آئی۔ اس کے بھائی اجمینو کو بچپن ہی سے بُری عادتیں پڑ چکی تھیں۔ وہ راج کو گھیر گھار کے پھسلا کے سبز باغ دکھا کے بمبئی لے آیا۔ راج کی شوخیاں۔ اس کی شریر ادائیں۔ اس کا بے مثل حُسن پروڈیوسروں کو بہت پسند آیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی۔ اوّل درجے کی ہیروئن بن گئی۔ اب کوئی دشواری نہ تھی۔ راج نے اپنے شوہر شنکر کو اپنے پاس بلا لیا۔ خاوند چاہے بڈھا ہی ہو دھوکے کی ایک عمدہ ٹٹی ہوتا ہے۔ اور پھر چچا رامیشور تھے۔ ان کی بیوی گنیشی تھی۔ موہی دُلاری تھیں۔ ان کی بیٹی رام پیاری تھی۔ رام پیاری کا شوہر اجیت سنگھ تھا۔ یہ سب لوگ راج کے ٹکڑوں پر پل رہے تھے۔ اور اس طرح پلنے کے سوا۔ اور کسی دوسرے طریقے سے پلنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ کام کرنا تو ایک غیر شریفانہ فعل ہے جسے آدمی اس سماج میں انتہائی مجبوری کے تحت سرانجام دیتا ہے۔ اُن میں سے ہر شخص گھر میں ایک چھوٹا سا فرعون تھا۔ ہر شخص خودی کا ایک بوجھل

پشتارہ باندھے اپنے کھوکھلے پن کو چھپانے کی کوشش میں غلطاں تھا۔ ہر شخص کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی طرح سے راج کا منظورِ نظر بن جائے۔ اس چھوٹے سے نظامِ شمسی کا مرکز راج تھی، اور یہ سب سیارے اس کے گرد گھوما کرتے تھے۔ اس لئے یہاں عزتِ نفس کا سوال نہ تھا۔ وہ تو کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ سوال تھا کہ کہیں اگر یہ معاملہ بڑھ گیا تو پھر کیا ہوگا۔ اگر کہیں عشرت اور راج نے شادی کرلی تو ہمارا کیا بنے گا۔ گو سوال پر اس طریقے سے کبھی بحث نہ ہوئی تھی۔ یہ سوال تو دل میں اندر ہی اندر رہتا تھا مگر تھا ہی۔ بنیادی مرکزی سوال "میرا حلوہ مانڈہ کیسے سلامت رہے"! اگر راج ان پندرہ دنوں میں کسی طرح سے اُنہیں اس بات کا یقین دلا دیتی تو وہ کاہے کو اتنے پریشان ہوتے۔ مگر راج کو اتنا سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔

ایک پرانی سپورٹس کار پورچ میں آکے رُکی۔ اور مرزا راحت حسین فلم "جوڑ توڑ" کے ڈائرکٹر اُس میں سے اُتر کے برآمدے کی جانب بڑھتے ہوئے دکھائی دئے۔ اجمینو نے بھاگ کے انہیں راستے ہی میں لینا چاہا۔ مگر جب تک وہ اندر ڈرائنگ روم میں چلے آئے تھے۔ مرزا راحت حسین بڑے رنگیلے اور شوخ مزاج ڈائرکٹر تھے۔ منہ میں ہر وقت پان رکھتے تھے اور پیک گھولتے رہتے تھے۔ اس لئے جب کبھی گفتگو کرتے تھے۔ تو دورانِ گفتگو میں ہمیشہ بلبلے چھوڑتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وُہ کہیں پانی کی کسی نچلی سطح سے بول رہے ہیں۔

بولے "آج اداس ہے؟" (راج کہاں ہے؟)

اجمینو نے۔ دست بستہ عرض کی "حضور کیا بتاؤں۔ بہن کو ایک سو تین بخار ہے"

"میں اُسے ایکھ شیتا اوں" (میں اسے دیکھ سکتا ہوں)

یہ کہہ کر مرزا آگے بڑھے۔ بیڈ روم اُن کا۔ دیکھا بھالا ہوا تھا، مگر اجمینو نے آگے بڑھ کے راستہ روک لیا۔ بڑی سماجت سے بولا "وہ اس وقت سو رہی ہیں۔ ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔ ڈاکٹر نے

ملاقات سے منع بھی کیا ہے" مرزا بہت چکرائے۔ بولے "آج اُس کی شوشنگ ہے۔ شٹ لگا ہوا ہے" (سیٹ لگا ہوا ہے)

اکھینو چہرے پر اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے بولا "کیا کیا جائے مرزا جی۔ آج تو شوٹنگ کینسل کرنا پڑے گی"

مرزا جی نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کہیں اُگال دان نظر نہ آیا اور پیک اب مُنہ کے اندر لبالب بھر چکی تھی۔ عنقریب تھا کہ وہ پیک کو کہیں بھی پھینک دیتے۔ اکھینو نے اُگالدان فوراً سامنے لا کے رکھ دیا۔ مرزا جی پیک تھوک کے رومال سے منہ کو پیک سے اور ماتھے کو پسینے سے صاف کرتے ہوئے بولے "ایک ہزار کا نقصان ہو جائے گا مسٹر اکھینو تم تو جانتے ہو۔ احمد بھائی بوہرا میرا پروڈیوسر کس قدر کنجوس ہے۔ اس کا تو ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ بڑے جوڑ توڑ سے میں نے فلم جوڑ توڑ کی ہدایت کاری حاصل کی تھی۔ وہ سب چوپٹ ہو رہی ہے۔ اکھینو بھائی کسی طریقے سے راج کو سیٹ پر لے آؤ"

"یہ تو ناممکن ہے"

"وہسکی کی ایک بوتل دوں گا"

"میں تو آدھی بوتل میں ہی راضی ہو جاتا" اکھینو بولا "مگر وہ اس بیماری میں کیسے آسکتی ہے"

مرزا جی نے دوسرا پان کلّے میں رکھا اور چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اکھینو نے مسکرا کے کہا۔ مرزا جی آج کوئی ہزل نہیں سنائیے گا؟"

مرزا جی گندی اور عریاں غزلیں کہنے میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ اس بات میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ کتنی ہی مشکل سے مشکل زمین نکال کے لائیے وہ اس میں عریاں غزل کہہ دیں گے۔ کوئی فلمی پرائیویٹ پارٹی ان کی شمولیت کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھی۔ شوقین مزاج لوگ جو جنسیات کے ماہر سمجھے جاتے تھے وہ امساک کی گولیاں، طِلا، عریاں پوسٹ کارڈ اور کوک شاستر کے علاوہ ایک دو

مرزاجی کے تبرکات بھی اُن کی بیاض سے نقل کر کے اپنے پاس رکھتے تھے۔

مرزاجی مسکراتے ہوئے بولے "پھر سناؤں گا۔ یہ موقع نہیں ہے۔ احمد بھائی بوہرہ میرا انتظار کر رہا ہوگا"

مرزاجی نے اپنی کھلی آستینوں پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ اپنے شفاف پائجامے پر سے ایک خیالی مکھی اُڑائی اور بڑی ادا سے جھومتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اُن کے جانے کے بعد امبینو نے سانس لیا۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجی۔ امبینو نے بھاگ کے ٹیلیفون کا رسیور اُٹھایا۔

"راج لتا ہے ؟"

"آپ کون بول رہے ہیں ؟"

"میں سیٹھ چھیدی لال ہوں"

"نمستے سیٹھ جی۔ نمستے۔ کہئے"

"نمستے تم رہنے دو۔ یہ بتاؤ۔ اب راج لتا کی طبیعت کیسی ہے"

"بدستور بیمار ہیں"

"تو اچھی کیوں نہیں ہوئیں۔ پانچ دن سے میرا سیٹ لگا پڑا ہے۔ بھیدی جنگلے کا۔ کیا بات ہے۔ میں اپنا ڈاکٹر بھیج دوں"

"نہیں سیٹھ جی۔ آپ کیوں تکلیف کریں گے۔ ڈاکٹر تو یہاں موجود ہے۔ اس کا علاج بھی ہو رہا ہے"

"عجیب مصیبت ہے۔ راج لتا کا اس سیٹ میں کام ہے۔ اور پانچ دن سے سیٹ لگا ہوا ہے۔ کل تک انتظار کروں"

"کیا بتاؤں سیٹھ جی۔ اچھا ہونے کو تو وہ کل بھی اچھی ہو سکتی ہیں۔ اور نہ ہوں تو ایک ماہ تک ٹھیک نہ ہوں"

"ڈیم !" سیٹھ چھیدی لال نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

امبینو نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا " یہ آج تیسرا ٹیلیفون ہے چچا " اور ان کی

بیوی گنیشی اس کے قریب کھڑے ہوئے خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر چچا دامودر بولے "اس طرح سے تو ہم بدنام ہو جائیں گے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" انجمینو اُن کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"سب پروڈیوسر ناراض ہو جائیں گے۔"

"بے شک!"

"پھر کوئی راج کو کام نہیں دے گا۔"

"بہت ممکن ہے۔"

"ہم سب کو بھوکا مرنا پڑے گا۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

چچا نے چلا کے کہا "تم دروازہ کیوں نہیں توڑ دیتے۔ سالی دن بھر اندر بیٹھی ہوئی کیا کرتی رہتی ہے۔"

انجمینو نے بڑے اطمینان سے کہا "دروازہ سامنے موجود ہے۔ توڑ دیجئے۔"

چچا دامودر غصے میں آگے بڑھے۔ انجمینو نے انہیں نہیں روکا۔ چچا کو بہت غصہ آیا۔ راج پر نہیں۔ بلکہ انجمینو پر۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ دروازہ نہیں توڑے گا، اور وہ جانتے تھے کہ انجمینو جانتا ہے کہ چچا دامودر دروازہ توڑنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ پھر بھی اس نے انہیں نہیں روکا۔ "کمینہ!" چچا دروازے پر کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے۔ پھر پلٹ آئے۔ اور چپکے سے ایک صوفے میں دھنس گئے۔ چچی گنیشی اُن کے قریب گئیں اور بڑی محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں "اتنے زیادہ پریشان نہ ہو۔ تمہاری افیم کا وقت ہو رہا ہے۔ چلو۔ چل کے چسکی لگا لو۔"

چچا اپنی بیوی کے کہنے سننے پر افیم گھولنے کے لئے چلے گئے اور ان کے جانے کا انداز بھی تھا کہ اگر میری افیم کا وقت نہ ہو گیا ہوتا تو میں یقیناً دروازہ توڑ دیتا۔

اُن کے جانے کے بعد ابھینو تبلا کے کمرے کے دروازے کی جانب مڑا۔ وہاں جا کر اس نے دو بار ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے راج بولی "کون ہے؟"

ابھینو نے کہا "میں ہوں۔ وہ مرزا جی آئے تھے"

"آنے دو"

"سیٹھ چھیدی لال کا بھی ٹیلیفون آیا تھا"

"سب کو دفع کرو"

"کر دیا" ابھینو ذرا فخر سے بولا۔

تھوڑی دیر خاموش رہی اور ابھینو نے کہا "بہن نوٹ لگ رہی ہے۔ میں نذر پیش کروں"

"بکواس مت کرو" راج اندر سے چلائی۔

ابھینو خاموشی سے مسکراتا ہوا دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دروازے کے نیچے سے دس دس کے دو نوٹ سرکائے۔ ابھینو نے نوٹ اٹھا لئے۔ اور اپنے کمرے کی طرف جانے ہی والا تھا کہ پورچ میں ایک گاڑی کے رکنے کی آواز آئی، اور میڈم تیزی سے اپنی اونچی ایڑی کے جوتوں سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئی اندر آگئیں۔ ابھینو نے لپک کے انہیں راستے ہی میں جا لیا۔

ابھینو نے کہا "ارے آپ بھی خوب وقت پر آئیں۔ ایک نئی غزل لکھی ہے"

"غزل سننے کا یہ وقت نہیں ہے" میڈم غرائیں۔

"تو چلئے ایک دو بازی فلاشں کی ہو جائے"

"پتوں کی تو صورت بھی میں اس وقت دیکھنا نہیں چاہتی۔ مجھے تم کسی طرح سے راج کی صورت دکھا دو"

"بس یہی ناممکن ہے"

"ارے یہ کیسے ناممکن ہے۔ کل میرا سیٹ ہے، اور وہ اس میں کام کر رہی ہے"

"وہ تو بچاری بیار ہیں ۔"

"کیا بیاری ہے اُسے ؟" میڈم نے ڈپٹ کے پوچھا۔

الجھینو نے مسکرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیسے کوئی راز کی بات کہنے والا ہو۔ میڈم اس کے قریب آئی۔ الجھینو خاموش گم مارہ گیا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے میڈم نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اپنے قریب بٹھا لیا بٹوے میں سے دس کا ایک نوٹ نکالا۔ بولی "اب بتاؤ۔ راج کو کیا بیماری ہے ؟"

"عشرت !"

میڈم نے کہا "آہ ! مجھے شمشاد نے بتایا تھا لیکن میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ اسے اوّل درجے کی ہیروئن اور ایک ایکسٹرا لونڈے سے ۔ کیا انڈسٹری کے سارے ہیرو مر گئے تھے ۔ آدمی بُرا کام کرے تو کم از کم سلیقے سے تو کرے ۔"

"جی ہاں " الجھینو نے سر ہلا کے کہا " یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ اعتراض بُرے کام پر نہیں ہے۔ سلیقے پر ہے۔ اور سلیقہ بڑی چیز ہے۔ میڈم ایک نظم میں نے لکھی ہے۔ سلیقہ !"

"ناں بھائی ۔ اس وقت نظم مجھ سے نہیں سُنی جائے گی۔ تم کسی طرح سے راج لتا کو کل میرے سیٹ پر لے آؤ ۔"

"یہ ناممکن ہے " الجھینو نے آہ بھر کے کہا۔

میڈم نے سو کا نوٹ جیب سے نکال کے اُسے دیا۔

" اب ممکن ہے ؟"

الجھینو کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے سو کا نوٹ جلدی سے جیب میں رکھ کے کہا " دیکھئے کوشش کرتا ہوں وہ ایک گُر مجھے بھی یاد ہیں ۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم بہت کچھ کرسکتے ہو۔" میڈم نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے آہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا کہ بھینو اپنی ساری چالاکی کے باوجود ساری سخی بھی بھول گیا۔ میڈم جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے معلوم تھا۔ اُس کی آنکھیں کس حد تک کس کی طرف بے خطر ہو کر کب تک دیکھ سکتی ہیں۔ اب وہ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں رات کو پھر تمہیں فون کروں گی۔"

میڈم کے چلے جانے کے بعد بھینو پھر راج کے کمرے کے دروازے پر جاکے دستک دینے لگا اندر سے راج پھر چلائی۔

"کون ہے؟"

"میڈم آئی تھیں۔"

"نکال دیا ہوتا۔"

"نکال دیا۔"

"کیا کہتی تھی۔"

"کل شوٹنگ ہے۔"

"لعنت بھیجو۔"

"مزدور بھیجو۔" بھینو نے تائید کرتے ہوئے کہا "مگر مجھ سے میں روپے لے گئی تھی جو تم نے دئے تھے کہنے لگی میں اتفاق سے پرس بھول گئی گاڑی میں پٹرول ڈلوانا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد دروازے کے نیچے سے کسی نے دس دس کے دو نوٹ پھر سرکا دئے۔ بھینو نے بیس روپے اپنی جیب میں رکھ کر اپنی بھری ہوئی جیب کو اطمینان سے تھپتھپایا۔ پھر اُس نے چھنگیشی کے پاس جاکے اُسے بیس کے نوٹ دیئے اور لوٹا۔

"یہ لو اور گھر کا خرچ چلاؤ۔"

"اور میرے لئے" بچا نے بیتاب ہو کے پوچھا۔ وہ دو روز سے اپنی رنڈی کے ہاں نہیں گیا تھا۔

"صبر کرو۔ یہ مصیبت ٹل جانے دو۔" انجینو نے بڑی سرد مہری سے کہا۔

اور پھر وہاں سے اٹھ کر موسی ولاری کی بیٹی رام پیاری کے شوہر اجیت سنگھ کے پاس گیا۔ اور اس سے سرگوشی میں کہنے لگا۔ "آج وسکی کا بندوبست کرو دو لڑکیاں بھی بلالو۔ جوہو چلیں گے۔"

فرط مسرت سے اجیت سنگھ نے اُسے گلے سے لگالیا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر گیا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔

اندر کمرے میں عشرت نے ایک جماہی لے کر کہا "ڈارلنگ۔ اب تو اس کمرے میں دم گھٹنے لگا۔"

"کھڑکی کھول دوں؟" راج نے بڑے پیار سے اُس سے پوچھا۔

عشرت بولا "سر میں شدید درد ہے۔"

راج بولی "سر دبا دوں پیارے؟"

عشرت نے کہا "نہیں پیاری۔ یہ بات ہے کہ اب باہر گھومنے کو جی چاہتا ہے۔"

"اُکتا گئے؟"

عشرت نے کہا "تم تو میری جان ہو۔ مگر تازی ہوا، کھلا آسمان . . . . کیا خیال ہے۔ یہیں اس کمرے میں

اسے ہوئے کتنے دن ہوئے ہوں گے "

س ایک لمحہ" راج نے اس کے رخسار سے اپنے رخسار لگاتے ہوئے کہا۔

عشرت اُٹھ کھڑا ہوا۔ بولا "باہر جائیں گے"

راج اس کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

عشرت نے کہا "آج میں بہت اُداس ہوں۔ امّی یاد آرہی ہیں اور میرے چھوٹے بھائی بہن"

جتنے روپے کہو انہیں بھیج دوں؟"

وہ تو میں جانتا ہوں۔ ڈارلنگ۔ مگر یہ بھی تو سوچو۔ مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہیئے۔ میں خود کما کے تمہیں کھلانا چاہتا ہوں۔ اپنی راج کو۔۔۔"

راج بولی "میں تمہیں اک دم ہیرو کا چانس دلوا دوں گی"

"یہ چانس جب تک ہم اس کمرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ کیسے ہاتھ آئے گا"

رج لاجواب ہوگئی۔ کچھ سوچ کے بولی "اچھا۔۔۔ میں کل ہی تمہارے لئے ایک شاندار پارٹی کا بندوبست کرتی ہوں۔ انڈسٹری کے تمام بڑے بڑے ہدایت کاروں اور پروڈیوسروں اور دوسرے لوگوں کو بلاتی ہوں۔ سب کا تم سے تعارف کراؤں گی۔ وہاں باتوں ہی باتوں میں تم دیکھ لینا تمہیں کسی نہ کسی پکچر کا چانس دلوا دوں گی۔ یہ کیا مشکل ہے"

"تو اٹھو دروازہ کھولو"

"اُف ہوں! جی نہیں چاہتا" راج اک ادا سے بولی۔

"اُٹھو ناں!" عشرت نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

اس نے اُٹھ کے بڑی بے دلی سے دروازہ کھولا۔ عشرت لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا۔ ایک ماہ کی قید بامشقت کے بعد آج باہر آیا تھا۔ دنیا اُسے نئی نئی معلوم ہو رہی تھی۔

راج باہر آگئی۔" ایمی نوتے دوڑ کے چچا سے کہا۔

"راج باہر آگئی!" چچا نے بھاگ کے گنیشی سے کہا۔

گنیشی دوڑتی ہوئی۔ موسی دلاری کے ہاں پہنچی۔ "راج باہر آگئی ہے!"

موسی دلاری بھاگتی ہوئی اپنی بیٹی کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں اس کا داماد اس کی بیٹی کو پیٹ رہا تھا۔ راج کے باہر آنے کی خبر سن کر اس نے مارے خوشی کے اپنی پٹتی ہوئی بیوی کو گلے سے لگا لیا اور اب سب دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف چلے۔

راج ٹیلیفون کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں یہ خبر ٹیلیفون پر سٹوڈیو سے سٹوڈیو اور ایک فلم کے دفتر سے دوسرے فلم کے دفتر میں چکر لگانے لگی۔ "راج باہر آگئی۔"

"راج باہر آگئی۔"

"راج باہر آگئی۔"

"راج باہر آگئی۔"

فلم کے دفتروں سے یہ خبر فلمی رسالوں اور پرچوں تک پہنچی۔ فلم آکاش وانی کے ایڈیٹر نے خوشی سے اپنے اسسٹنٹ، پیکر اور چپراسی سے۔ جو ایک ہی شخص تھا۔ اور جو وہ خود ہی تھا۔ چلا کے کہا۔

"راج باہر آگئی۔"

ہیروشیما پر بم گرنے کی خبر ایسی سنسنی خیز نہ تھی جیسی راج کے باہر آجانے کی خبر تھی۔ دوسرے دن راج کی تصویر تمام فلمی پرچوں اور رسالوں میں پہلے صفحے پر تھی اور ہر پروڈیوسر یہ سوچ رہا تھا——

"سال۔ ڈیڑھ سال پہلے پچاس ہزار لیتی تھی۔ اب تو کسی حالت میں ستر ہزار سے کم نہ مانگے گی!"

راج کے بغیچے کی بیلوں اور درختوں کی شاخوں میں رنگا رنگ بجلی کے قمقمے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ راج نے آج کی رات پارٹی کی خوشی میں اپنے خاندان کے تمام افراد چچا ماموں وغیرہ کر رام پیاری کے شوہر اجیت سنگھ تک کو گراج اور گراج سے ملحق نوکر خانے میں دھکیل دیا تھا۔ اور اب پورا محل فلم کی نامور اور معزز ہستیوں کی خرمستیوں سے گونج رہا تھا۔

راج کا شوہر شنکر اور جی گینشی اور خاندان کے دوسرے افراد ایک عجیب حیرت سے بنگلے میں آتے جاتے لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شنکر کے چہرے پہ کوئی سوال نہ تھا اور کوئی جواب نہ تھا۔ آج خواب سارے جواب پا لئے تھے اور اس کی آنکھیں اب ایسے موڑ کو تک رہی تھیں۔ جس کے آگے کوئی رستہ نہیں نکلتا۔

اور بج چکے تھے۔ اور پارٹی اب شباب پر آئی تھی۔

باہر پورچ کے ایک طرف سیڑھیوں پر وہسکی کے دو گلاس رکھے بچن دت میوزک ڈائریکٹر ولایت بیگ کی میں ہاتھ ڈالے کہہ رہا تھا۔ "یہ سالے پنجابی اور مراٹھے اور گجراتی ہندی ہماری بی ڈر کیا دھا ہو گئی بلتے ہیں۔ سنو، سنو۔ اندر سے شور و غل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کتنے بدتہذیب ہیں یہ لوگ۔ لبا گر

یہ پارٹی ہمارے کلکتے میں ہوتی، ہمارے بنگال میں ہوتی، تم سمجھتی ہو۔۔ "

"جی فرمایئے" ولایت بیگم نے کہا۔

"نہیں۔نہیں۔مگر یہ سمجھنے کی بات ہے۔پیتے ہم بھی ہیں۔پیتے یہ لوگ بھی ہیں۔مگر اپنے پینے میں فرق ہے۔ہمارے کلچر میں جو ایک خاص طرح کی تہذیب۔ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ۔ایک خاص طرح کا ایک خاص طرح کی نفاست۔۔۔۔ ایں! میں کیا کہہ رہا تھا؟" بجن دت نے ولایت بیگم سے پوچھا۔

"نفاست" ولایت بیگم نے جمائی لے کے دُہرا دیا۔

بجن دت کی آنکھیں خوابیدہ ہو گئیں۔بولا "میں دنیا کا سب سے بڑا موسیقار ہو سکتا تھا۔مگر میری محبت نے مجھے تباہ کر دیا"

"آپ کو کسی سے محبت ہے؟" ولایت نے پوچھا۔

بجن دت نے ولایت کی کمر کو زور سے پکڑ لیا غصے میں بولا "محبت کے بغیر موسیقی ناممکن رہتی ہے محبت زندگی کا نغمہ ہے، مہاکوی ٹیگور نے کہا ہے ولایت جس لڑکی سے میں محبت کرتا تھا۔اس کی آنکھیں اگر تم دیکھو۔چھوڑو۔۔۔ کوئی اور بات کرو" بجن دت نے مایوسی سے سر ہلا کے کہا۔

"وہسکی دوں؟" ولایت نے کہا۔

"یس، یس! وہسکی۔میرے ہاتھ سے پیو" بجن دت ولایت کو وہسکی پلانے لگا۔

ایک گھونٹ پی کر بجن دت نے کہا "میں بے حد ناخوش ہوں، دکھی ہوں، مصیبت میں ہوں۔ولایت تم کسی طرح سے میری مدد کرو، میں اُس لڑکی کو بھولنا چاہتا ہوں"

ولایت مسکرا کے بولی "میں بھی کسی کو بھولنا چاہتی ہوں"

"آہ!" بجن دت نے ولایت کی کمر کو زور سے کس کر کہا "میں بھی ناخوش، تم بھی ناخوش تو چلو ہم دونوں جوہو چلیں۔میں تمہارے کندھے پر سر رکھ کر رو دوں گا۔تم میرے کندھے پر سر رکھ کر

رونا۔ فائن "

بجن دت وہسکی پینے لگا۔ اتنے میں ایک عظیم فن کار قسم کا ہیرو جس کا نام بھدر کمار تھا [illegible]
منہ بسورے رکھتا تھا۔ بجن دت سے آکے پوچھنے لگا "بجن دت آرٹ کسے کہتے ہیں؛ رنجنا سے [illegible]
شرط لگ چکی ہے " بجن دت نے بھدر کمار کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ مشہور ہیروئن رنجنا کو دیکھ کے کہا "آرٹ
آرٹ ایک سانپ ہے "

"سانپ!" رنجنا زور سے چیخی۔

برآمدے میں بہت سی کھڑی ہوئی لڑکیاں چلائیں "سانپ! سانپ" بہت سے
لوگ اِدھر اُدھر بھاگے۔ اک بھگدڑ سی مچ گئی۔ شراب کے بہت سے جام ٹوٹ گئے بہت سی لڑکیاں
ڈر کے مارے مردوں کے سینے سے لگ گئیں۔ سانپ نے واقعی پارٹی میں جان ڈال دی تھی بڑی
مشکل سے بھدر کمار نے معاملے کو ٹھنڈا کیا۔ اس نے کہا "بھئی یہاں تو آرٹ کے بارے میں گفت گو
ہو رہی تھی "

"آرٹ؟" شمشاد چہک کے بولی "سب سے اچھا آرٹ سلک جھینامل سندھی کی دوکان میں ملتا ہے،
جواب نہیں ہے وہاں کے آرٹ کا "

بھدر کمار منہ موڑ کر اکرم سے باتیں کرنے لگا "آپ آج کل کون سی تصویر کی ہدایت کاری میں
مصروف ہیں "

"فی الحال تو کوئی نہیں "

"تو پھر کسی تصویر کی کہانی.... گیت.... مکالمے....؟"

"ابھی تک تو خالی ہوں "

"اوہ!" بھدر کمار نے چونک کر کہا۔ پھر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں

آکر کہنے لگا۔
"آپ شمع کے معمے حل کرتے ہیں؟"
"نہیں"
"آپ کے پاس موٹر ہے؟"
"نہیں"
"آپ کو شارک سکن کا سوٹ پسند ہے؟"
"ہاں۔ مگر ــــــــ"
مگر بھدر کمار پوچھتا جا رہا تھا۔
"آپ سینما کے باہر اپنا نام دیکھنا پسند کرتے ہیں؟"
"ہاں۔ مگر ــــــــ"
"آپ ایک گھر چاہتے ہیں، ایک خوب صورت باغ۔ گھر میں پیاری بیوی۔ بیوی کے پیارے سے بچے؟"
"ہاں۔ مگر۔ دیکھیے" اکرم کچھ کہنا چاہتا تھا۔
بھدر کمار نے کہا "میں کیا دیکھوں۔ آپ دیکھیے۔ مسٹر اکرم آپ دیکھیے۔ اگر آپ اس سماج میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو آپ اپنے آپ کو بیچ ڈالیے۔ مکمل طور پر بیچ ڈالیے۔ اپنے لیے کچھ نہ رکھیے۔ کہیں پر ضمیر کا کوئی ٹکڑا۔ روح کا کوئی ذرہ۔ خیال کا کوئی حصہ باقی نہ رہنے پائے"
اکرم نے کہا "میں نے تھوڑی سی تاریخ پڑھی ہے بیچ ڈالنے والوں کا انجام بھی جانتا ہوں"
"دولتوں کے بُرے انجام سے ڈر کر آپ اتنی لمبی چوڑی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں"
اکرم نے کہا "میں کچھ چیزوں اور رشتوں کو بدلنا چاہتا ہوں"
بھدر کمار نے کہا "بُری عادت ہے"

بعدر کمار اکرم کو چھوڑ کر رنجنا کی طرف چلا گیا جس سے بے کار میں لپٹنے کی کوشش ایک عرصے سے جوشی جی کر رہے تھے۔ بعدر کمار کے سامنے کس ڈائریکٹر کی چل سکتی تھی۔ بعدر کمار کو آتے دیکھ کر جوشی الگ ہو گیا۔ بعدر کمار نے اُسی طرف مسکرا کے کہا: "سوری!"

"جی سرکار!" جوشی مسرت سے چلایا۔ اور راج لتا کو ڈھونڈنے لگا۔

راج لتا عشرت کا تعارف سیٹھ بانکیلال سے کرا رہی تھی۔ شروع شروع میں معاملہ صاف نہ تھا۔ لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ پارٹی کس تقریب میں دی جا رہی ہے۔ لیکن جب راج نے مختلف پروڈیوسروں کی ٹولیوں میں جا جا کے اپنے محبوب کا تعارف کرانا اور ان سے رول مانگنا شروع کیا۔ باتوں ہی باتوں میں ہنس ہنس کر کبھی ادا سے۔ کبھی شوخ اترا ہٹ سے۔ کبھی اک عجیب اپنائیت سے جو اپنائیت کے باوجود نہایت غلیظ معلوم ہوتی تھی۔ تو سب پر یہ راز کھل گیا۔ کہ یہ وہسکی کے جام کیوں لنڈھائے جا رہے ہیں۔

"جی ہاں۔ ضرور کوئی کرے۔ رول ہم دیں" سیٹھ چھیدی لال بولے "ایسے ادیتے ہم نہیں ہیں!" مزاجی کا پان اُن کے منہ میں پیک گھول رہا تھا۔

"مگر اس لونڈے میں ہے کیا؟" رنجنا نے بڑی نخوت سے بعدر کمار سے پوچھا۔ "بالکل زنخا معلوم ہوتا ہے یہ عشرت!"

بعدر کمار نے کہا: "سُنتے ہیں، ایلن لاڈ سے اس کی صورت ملتی ہے۔"

"چھی!" رنجنا بولی۔ اتنے میں اُسے راج لتا آتے ہوئے دکھائی دی۔ فوراً لپٹ کے اس سے لپٹ گئی۔ بولی "ہائے ری کتنی خوش قسمت ہے تو۔ میری تو عشرت کو دیکھتے ہی جان نکل گئی، ہوشیار رہنا کسی دن جیت کے لے جاؤں گی۔"

راج لتا بے حد خوش ہوئی۔ اس نے رنجنا کو چوم لیا۔ دونوں سہیلیاں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

پھر راج نے بھندر کمار سے پوچھا۔
"پارٹی پسند آئی ؟"
"میڈم!" بھندر کمار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے مغربی انداز میں جھکا "یہ گریٹیسٹ شاندار سٹ عظیم اشانسٹ پارٹی ہے جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی ہے ۔"
جوشی جی ابھیمنو کو لئے ایک کمرے میں بیٹھے پی رہے تھے۔ رشتے داروں میں صرف ابھیمنو ہی، پارٹیوں میں شریک ہو سکتا تھا۔
جوشی جی کہہ رہے تھے "گنگا جلی کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ مر جاؤں گا۔ مگر اس عشرت کو کبھی پیار نہیں دوں گا ۔"
ابھیمنو نے کہا "جی ہاں کبھی مت دیجئے گا۔ مگر مجھے وسکی تو دیجئے ۔" ابھیمنو نے جام خالی کر دیا جوشی جی کہہ رہے تھے "اور وہ بھی پھر ایک مسلمان لڑکے سے !! ارے تمہاری غیرت کو کیا ہو ہے ابھیمنو ۔"
"ایک شریف ہندو گھرانے کی لڑکی ———— اور وہ ایک مسلمان سے عشق کرے۔ میں پوچھتا ہوں کوئی ہندو نہیں لاتا تھا۔ کیا انڈسٹری کے سب ہندو ہیرو مر گئے تھے ۔"
"بیئرر بیئرا!" ابھیمنو زور سے تالی بجا کے چونکا۔ جوشی جی نے کہا "کیا بات ہوئی ۔"
ابھیمنو بولا " جلدی سے وسکی دو۔ یہ میری ہندو شرافت کا تقاضا ہے ۔"
"تمہاری شرافت کہاں ہے ؟" جوشی جی نے غصے سے پوچھا۔
"میری جیب میں" ابھیمنو نے جیب سے چھ سات دس دس کے نوٹ نکالے۔ اور انہیں پھر بڑے پیار سے چوم کر جیب میں واپس ڈال دیا۔ بولا "آج میں بہت شریف ہوں۔ میری . . . ."
اکرم ادھر سے گذر رہا تھا۔ ابھیمنو کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے جلدی سے اکرم کو کمرے میں بلا لیا۔

جوشی منع بھی کرتا رہا۔

اجمینو نے کہا " اکرم بھیا۔ ایک مشکل آن پڑی ہے۔ حل کر دیجئے "

" فرمائیے !"

جوشی نے اکرم کے آنکھ مار کے کہا " یہ پئے ہوئے ہے "

اجمینو نے شعلہ بار نگاہوں سے جوشی کی طرف دیکھا اور کہا " جی ہاں۔ میں ہر روز بھنگ پیتا ہوں۔ آج وسکی پی رہا ہوں " " فرمائیے بات کیا ہے۔ مجھے جلدی گھر جانا ہے " اکرم نے کہا

" اتنی جلدی " اجمینو نے پوچھا " ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پولیس آئے گی۔ پھر تھوڑا سا ہنگامہ ہوگا۔ اس کے بعد ہم سب لوگ یہاں سے نکالے جانے کے بعد جوہو پر چلیں گے۔ راج نے جوہو کا ایک پورا ہوٹل آج کی رات کے لئے بُک کر لیا ہے۔ آپ نہیں جائیں گے "

" نہیں "

" کم از کم پولیس کو تو آنے دیجئے۔ ہم میں سے ایک تو ایسا ہونا چاہئے جو پولیس سے لکنت کے بغیر بات کر سکے "

اکرم نے پریشان ہو کے کہا " آپ بات بتائیے۔ نہیں تو میں . . . " اجمینو نے اُسے آستین سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

" بڑا سادہ سوال ہے۔ یہ جوشی جی کہتے ہیں کہ راج ایک ہندو لڑکی ہے۔ اُسے عشرت سے محبت نہیں کرنا چاہئے۔ اگر عشرت ایک ہندو لڑکا ہوتا۔ تو انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ جوشی جی ہندو مسلمانوں کی آپس کی شادیوں کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر اگر یہی عشرت ہندو ہوتا اور راج مسلمان ہوتی تو انہیں اس شادی پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہیں نہ محبت پر اعتراض ہے۔ نہ مذہب پر۔ پھر کس بات پر اعتراض ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ؟"

اکرم جوشی جی کا منہ دیکھنے لگا۔

جوشی جی کھسیانی ہنسی ہنس کر بولے "میں تو اکرم تم جانتے ہو، اس قسم کی فرقہ واریت سے کتنا دور ہوں۔ یہ کم بخت ابھینو اس وقت پی کر بہک گیا ہے۔"

اکرم نے ابھینو سے پوچھا "کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ محبت ہے؟ عشرت اور راج کے درمیان محبت ہے؟"

ابھینو نے کہا "کیا تمہیں یقین ہے کہ اگر عشرت نہ ہوتا تو یہ محبت ہوتی۔ عشرت نہ ہوتا جوشی جی ہوتے تو یہ محبت ہوتی، راج نہ ہوتی۔ شمشاد ہوتی تو یہ محبت ہوتی۔"

ابھینو نے کہا "مگر اکرم بھیا، میں اس سوال کو حل کر کے چھوڑوں گا۔" ابھینو کی بھویں سکڑ گئیں، اس نے بڑی سنجیدگی سے ایک گلاس وہسکی کا اپنے سامنے رکھ کے کہا "یہ ایک ہندو لڑکا ہے۔" پھر اُس نے ایک دوسرا گلاس اُٹھایا۔ اور کہا "یہ ایک ہندو لڑکی ہے۔ کیا یہ دونوں مل سکتے ہیں؟ ملا کے دیکھیں؟" ابھینو نے ایک گلاس کی وہسکی دوسرے میں ڈال دی۔ "مل گئی۔" ابھینو تالی بجا کے بولا "اچھا۔ اب یہ گلاس اُٹھاؤ۔ یہ مسلمان لڑکا ہے۔ یہ اُٹھاؤ۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔ دونوں کو ملاؤ۔ آہا۔ پھر مل گئے۔"

ابھینو نے پھر دو گلاسوں کی وہسکی اپنے گلاس میں انڈیل لی۔ چار چھوٹے ملا کے ایک بڑا پیگ اس کے سامنے تھا۔ ایک پیگ۔ پھر اس نے ایک گلاس میں وہسکی ڈالی "یہ ہندو لڑکا ہے۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔ آہا۔ دونوں مل گئے۔" وہ دونوں چھوٹے بھی اس نے اپنے پیگ میں ڈال دیئے۔ اب اس نے ایک اور گلاس اُٹھایا "یہ مسلمان لڑکا ہے۔ یہ ہندو لڑکی ہے۔ جوشی جی کہتے ہیں۔ یہ نہیں ملیں گے۔ آئیے دیکھیں، ایں۔ یہ تو مل گئے۔ ایک ہی رنگ، ایک ہی ذائقہ وہی بو باس۔ وہی زندگی کی تلخی، وہی اس کا خمار۔"

جوشی جی نے کھسیانے ہو کے کہا "ارے بُدھو۔ اب سب گلاسوں میں تو وہسکی ہے۔"

انجینو بولا "یہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ہم سب میں وہسکی ہے۔ ہم سب اسی آگ اور پانی سے بنے ہیں۔ نام عشرت ہوا تو کیا، اور جوشی ہوا تو کیا۔"

اس کے بعد انجینو بہت بڑا پیگ غٹاغٹ پینے لگا۔

جوشی جی نے اکرم سے کہا "آج مرے گا یہ۔"

اکرم کوئی جواب دیئے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

بڑے ہال میں سے تالیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ فلمی ریکارڈوں کی دُھن پر رضیہ، رضیہ اور ولایت بیگم ناچ رہی تھیں۔ راج لتا نے خاص طور پر ان لوگوں کو پیسے دے کر ناچنے کے لئے بلوایا تھا۔ رضیہ نہ آتی مگر اماں سخت بیمار تھیں اور اُسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اُسے معلوم تھا۔ وہاں پر عشرت ہوگا۔ مگر اماں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کے تقاضے تھے بہن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خوب صورت نگاہوں کی اداسی رضیہ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ پندرہ دن سے کہیں کام نہ ملا تھا جب راج لتا نے تیس روپے ایڈوانس کے بھیج دیئے تو رضیہ سے انکار نہ ہو سکا۔

ناچ سے پہلے رضیہ پارٹی میں بالکل شریک نہیں ہوئی۔ رضیہ اور ولایت بیگم دونوں شریک تھیں۔ مگر رضیہ خاموشی سے میک اپ کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کسی کو اس کی آمد کا پتہ نہ تھا۔ کسی کو پروا بھی نہ تھی۔ عشرت کو بھی معلوم نہ تھا۔ راج نے بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ایک ایکسٹرا لڑکی!

رضیہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ نگاہیں اُٹھا کے کسی طرف نہیں دیکھے گی۔ وہ دیواروں کو دیکھے گی۔ چھت کو دیکھے گی۔ اور فرش کو دیکھے گی۔ اور ہوا کو دیکھے گی، مگر کسی کے چہرے کو

اور کسی کی آنکھوں کو اور کسی کے ہونٹوں کو اور کسی کے بالوں کو اور کسی کی مسکراہٹ کو کبھی نہیں دیکھے گی اگر کسی طرح سے وہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے کہا تم صرف اس جگہ اندھی ہوجانا جہاں وہ بیٹھا ہو مجھے روپوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں اپنے پاؤں سے ناچوں گی اور اپنی کمر سے۔ کولھے سے۔ بازوؤں۔ گردن اور شانے سے اور ہونٹوں کی ہر جنبش سے ناچوں گی، مگر آنکھوں سے آج نہیں ناچ سکوں گی۔ کیوں کہ آنکھیں روح میں جھانک کر دیکھ سکتی ہیں۔ اور اگر اس نے کہیں دیکھ لیا تو۔ اگر اس نے میری شکست دیکھ لی۔ تو وہ کیسے مسکرائے گا۔ آنکھوں! کیا تم اندھی نہیں ہو سکتیں چند لمحوں کے لئے، لوگ کہتے ہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے سوا اور سب کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن ایک محبت ایسی بھی تو ہوتی ہے جس میں انسان اپنے محبوب کے سوا اور سب کچھ دیکھتا ہے آج میں ویسی ہی آنکھیں چاہتی ہوں۔ رضیہ نے اُسے ٹھوکا دیا" چل کم بخت۔ کیا سوچ رہی ہے وہ لوگ ہال میں روشنی گل کئے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ناچ شروع ہونے والا ہے!

ہال میں اندھیرا تھا جب رفیعہ، رضیہ اور ولایت بیگم اندر آئیں۔ روشنی ہوئے ہو۔ جیسے رات کی سانس کسی کو دیکھ کر تیز ہو جائے۔ پھر کہیں سے پائل کی جھنک سنائی دی۔ جیسے کوئی تار ٹوٹ کر رہ گیا۔ پھر روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ گھومتا ہوا ولایت بیگم سے رضیہ، رضیہ سے رفیعہ پر رکا۔ ایک لمحے کے لئے۔ ایک لمحے کے لئے رفیعہ کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ ایک ... کسی نے زور سے سانس اندر کھینچی۔ پیشتر اس کے کہ رفیعہ سمجھ سکتی کہ کون ہے۔ ہال میں لائٹ ہوگئی اور ناچ زور سے شروع ہو گیا۔ رفیعہ کی نگاہ سب سے پہلے جس پر پڑی وہ عشرت تھا۔ مسکراہٹ جیلی کی طرح اس کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی تھی۔ راج نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا تھا: جب رفیعہ ناچتی رہی عشرت پتھر کی طرح بت بنا ہوا بیٹھا رہا۔ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ رفیعہ ۲ کے قریب سے ناچتی ہوئی گزری، اور قریب سے گزری اور قریب سے گزری۔

یکایک عشرت بڑے زور سے چلایا "روشنی گل کردو"

یکایک ہال کی روشنیاں گل ہوگئیں۔

لائٹ مین نے جس کے ہاتھ میں روشنی کا انتظام تھا۔ عشرت کی تحکمانہ آواز سے گھبرا کر ہال کی روشنی گل کردی تھی۔ چند لمحوں کے لئے ہال میں ہنگامہ سا ہوگیا۔

"روشنی کھول دو۔ کیا ہوا۔ روشنی۔ روشنی"

راج لتا چلائی "روشنی کردو"

ہال کی روشنیاں پھر چمکنے لگیں۔ راج نے پوچھا "کیا ہوا تھا ڈارلنگ؟"

عشرت نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہا۔ "کچھ نہیں۔ چکر آگیا تھا۔ روشنی چبھنے لگی تھی"

"اب؟"

"اب ٹھیک ہوں" عشرت نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میک اپ کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ رضیہ دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ ولایت بیگم اس کے پاس بیٹھی تھی۔ خاموشس۔

رضیہ روتے روتے بولی "عجیب اندھیرا سا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں اس کے گھمرے ہوئے خوب صورت بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر رہی ہوں"

ولایت بیگم نے کہا "اس خاموشی میں کبھی کبھی اس بچے کی چیخ سنتی ہوں"

"کس بچے کی؟" رضیہ نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

ولایت بیگم رضیہ کے بالکل قریب آگئی۔ اس کے گلے سے لگ کر بولی "جانتی ہو رضیہ۔ میں گیارہ سال کی تھی جب انہوں نے مجھ پر یہ ظلم توڑا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ میرے رحم میں کوئی نقص پیدا ہوگیا ہے میرے اب کبھی کوئی بچہ نہ ہوگا۔ پھر بھی ———"

ولایت بڑی سختی سے رفیعہ سے لپٹ گئی۔ بولی "پھر بھی —— کبھی کبھی مجھے اس بچّے کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی وہ میری کوکھ میں کسمسانے لگتا ہے۔ کبھی کبھی میرے بازوؤں میں ہمکنے لگتا ہے کبھی کبھی اس کے ننھے ننھے ہاتھ میری چھاتیوں پر رینگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خدا ایسا کیوں ہوتا ہے ایسا کیوں ہوتا ہے "

رفیعہ نے ولایت کو چوم کے کہا " تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ تو نہ جایا کر۔ ان مردوں کے ساتھ کبھی نہ جایا کر۔ تو کیوں جاتی ہے۔ آج اس کے ساتھ، کل اس کے ساتھ۔ عورت کو ایسا نہیں کرنا چاہئے "

ولایت ذرا سی ہنسی۔ بولی " پگلی۔ میں کوئی عورت تھوڑی ہوں۔ میں تو اب طوائف ہوں! "

کوئی پانچ بجے کے قریب صبح کو پارٹی جوہو پر ختم ہوئی۔ وہ انجینو کا کہنا ٹھیک نکلا۔ کوئی دو بجے کے قریب ہمسایوں کی شکایت پر پولیس آئی۔ تو یہاں کا غل غپاڑہ بند ہوا۔ اور سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر جوہو چلے گئے۔ اور وہاں سے کوئی پانچ بجے کے قریب محفل برخاست ہوئی۔ بہت سے لوگ جن کی اس روز شوٹنگ نہیں تھی۔ وہیں کمروں میں پڑ کے سو گئے۔ دوسرے لوگ جنہیں کام تھا گاڑیوں میں بیٹھ کر گھروں کو بھاگے۔ راج لتا کی شوٹنگ تھی لیکن شوٹنگ سے پہلے اُسے صبح صبح سنجانا کالج میں ہارن بی روڈ پر ایک ادبی سوسائٹی کا افتتاح کرنے کے لئے جانا تھا۔ اس لئے وہ عشرت کو لے کر گھر آ گئی۔ غسل کرنے کے لئے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے۔ میک اپ کرنے کے لئے تین گھنٹے تو چاہئیں۔

ڈریسنگ ٹیبل پر اس کی اور عشرت کی باتیں ہوئیں۔ راج لتا کوئی گھٹی ہوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اکثر ایک انڈرویر اور باڈی پہنے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر میک اپ کرنے لگتی۔ یہ اس کی زندگی کے سنجیدہ ترین لمحے ہوتے۔ جب وہ غور سے اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیتی۔ اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی۔

"ڈارلنگ وہ برش دینا۔" راج نے عشرت سے کہا
عشرت نے برش اُٹھا کے دیا۔
راج بولی "وہ جوشی جی نے وعدہ کرلیاہے۔ سیٹھ باٹلی والا نے بھی وعدہ کرلیاہے۔ میڈم سے بھی کہہ چکی ہوں۔ بلکہ کل تو دو سو روپے رمی میں جان بوجھ کے میں ہارگئی، کہ کسی طرح میڈم خوش ہوجائیں تم جوشی جی کی اگلی پکچر میں ہیرو کا کام کر رہے ہو۔ مزا جی نے بھی ہاں کردی ہے۔ جھیدی لال نے بھی منظور کرلیاہے۔ میں نے اس سے کہا۔ اگر وہ تمہیں ہیرو کا چانس دے تو میں اُس سے دس ہزار روپے کم لوں گی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اگلے ہفتے اپنی نئی تصویر کا اعلان کر رہا ہے۔ جس میں تم ہیرو ہیں تمہاری ہیروئن۔ ڈارلنگ وہ میچی کوٹ دینا۔ یوں وعدے تو رات کو دس بیس پروڈیوسروں نے کئے ہیں۔ مگر ان میں دو چار بھی تمہیں چانس دے دیں۔ تو دو سالوں ہی میں تم وہاں اوپر نظر آؤ گے۔" راج نے چھت کی طرف دیکھا۔ عشرت نے اُسے گلے سے لگا لیا۔
"ارے رے۔ میرا میک اپ مت خراب کرو۔ جان!"
راج ذرا ناک کر بولی "سکالج پہنچنا ہے۔ اچھا دیکھو۔ انجمنوں نے میرے لئے ایک تقریر تیار کردی ہے ذرا تم دیکھ لو اسے۔ تم تو گریجویٹ ہو۔ آئندہ میری تقریریں تم ہی لکھا کرنا۔ ٹھیک ہے نا پیارے؟"
"ہاں پیاری!"
عشرت تقریر دیکھنے لگا۔ اتنے میں راج نے اس سے بڑے پیار سے کہا: "جانی رنجنا کے ہاں نئے پیرس کا ڈرائے ہیں اور ایک بہت عمدہ بلو فلم بھی آئی ہے۔ کہہ رہی تھی بہت عمدہ بلو فلم ہے۔"
"بلو فلم کیا ہوتی ہے؟"
"تم چلو گے تو تمہیں بتائیں گے۔"

"اور کون کون ہوگا وہاں ؟"

"زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ زیادہ لوگوں میں بلو فلم نہیں دیکھی جاتی۔ بس تم اور میں۔ شمشاد اور اس کا۔ رنجنا اور اس کا۔"

"شمشاد کا اس کا کون ہے۔" شرت نے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے؟ ارے سیٹھ گووردھن داس جوہری کا لڑکا گلاب داس۔ دیکھنے میں بڑا حسین اور خوبرو ہے۔ سچ مچ گلاب معلوم ہوتا ہے۔ مگر شمشاد کو اس سے محبت نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ وہ جمی اسٹوارٹ پر مرتی ہے۔ گلاب بے چارہ ہر سال اسے ایک نئی کار اور ہزاروں کے جواہرات لے کے دیتا ہے۔ پھر بھی شمشاد خوش نہیں ہے۔ اگر دادی کا دباؤ نہ ہوتا تو وہ کب کی اُسے دھتا بتا چکی ہوتی۔ ذرا وہ سینڈل تو دینا۔"

سنجانا کالج کا ہال بالکل بھرا ہوا تھا۔ ادبی مجلس کا افتتاح تھا۔ لیکن سائنس کے طلبار نے بھی چھٹی منائی تھی۔ اور سب کے سب ہال میں جمع تھے۔ بلکہ بہت سے لڑکے تو ہال کے باہر کھڑے تھے۔ انہیں ہال میں کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملی تھی۔ پرنسپل صاحب جن کی مونچھیں ہر روز گری رہتی تھیں۔ وہ بھی آج اپنی مونچھوں کو بل دے کے آئے تھے۔ پروفیسروں کی عینکوں کے شیشے غیر معمولی طور پر صاف تھے۔ اور پتلونوں پر بھی استری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لڑکے تو خیر بہترین لباس پہن کے آئے ہی تھے ٹی شرٹ اور نائی لان کے شرٹ جن سے اندر کا جسم کا حصہ صاف نظر آتا ہے۔ ٹخنوں سے اوپر تنگ مہری

کی پتلونیں۔ کچھ عرصے کے بعد لڑکے کے نائی لان کی شفاف پتلونیں بھی پہننے لگیں گے پھر مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ راج لتا نے سوچا۔

راج لتا عشرت اور انجینو کو ساتھ لے کے آئی تھی۔ مگر یہ چونکہ لڑکوں کا کالج تھا۔ اس لئے کسی نے اِن دو طفیلیوں کی طرف توجہ نہ کی۔ عشرت بہت عمدہ لباس پہن کے آیا تھا۔ مگر لڑکوں نے اُسے ایک نظر دیکھا۔ بیرا سمجھ گئے۔ پھر انہوں نے اُسے واقعی نظر انداز کر دیا۔ جیسے وہ ہال میں بیٹھا نہ ہو۔

راج لتا کی تقریر بہت عمدہ تھی۔ انجینو نے جگہ جگہ۔ ادبی فقرے اور اقوال جوڑ کر جوڑ کو دئے تھے۔ اُن پر راج کو بے حد داد ملی۔ آخر میں جب اس نے اپنی تقریر اس شعر پر ختم کی۔

جو بے نشان چلے تھے وہ پاگئے منزل

ہمیں تو راہ کے نام و نشاں نے لوٹ لیا

حاضرین متواتر دو منٹ تک تالیاں پیٹتے رہے۔ راج لتا کی تقریر کا موضوع تھا "اخلاق اور ادب" صاحب صدر جو خود کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اخلاق اور ادب پر اس سے بہتر تقریر آج تک نہیں کی گئی۔

تقریر کرنے کے بعد راج کو لڑکوں نے گھیر لیا۔ آٹو گراف کے لئے۔ اصل میں کالج میں بلانے کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ تقریر اور دعوت تو ایک بہانہ ہوتا ہے۔ اصل چیز تو یہ لمحہ ہوتا ہے جب ملک کی مایۂ ناز ہیروئن آپ کے سامنے بالکل سامنے چند انچوں کے فاصلے پر کھڑی آپ کی آٹو گراف بک پر دستخط کر رہی ہوتی ہے۔ تم جنت میں پہنچ جاتے ہو۔

راج کو کئی لڑکوں نے گھیر رکھا تھا

سٹیج کے ایک کونے میں انجینو اور عشرت بے وقوفوں کی طرح بیٹھے کبھی انگلیاں چٹخاتے۔ کبھی پاؤں کھجانے لگتے۔ عشرت کو بار بار پسینہ آرہا تھا حالانکہ سر کے اوپر پنکھا چل رہا تھا۔

تاریخ کے پروفیسر نے جغرافیے کے پروفیسر سے کہا " ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ ملک کے بڑے بڑے فلسفیوں، سیاست دانوں، عالموں اور ادیبوں کو بلاتے تھے، اور ان کی باتیں سنتے تھے۔ آج اگر فزکس سوسائٹی کے لئے چندہ اکٹھا کرنا ہو تو بھی کسی فلم اسٹار کو بلایا جاتا ہے۔ مجھے فلم والوں سے کوئی عناد نہیں ہے۔ مگر یہ لڑکی پروفیسر نے راج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ ادب یا سائنس یا تاریخ یا جغرافیہ کس کے بارے میں کیا جانتی ہے۔ یہ غالباً صرف چیک بک یا آٹوگراف بک پر دستخط کر سکتی ہے "

جغرافیے کے پروفیسر نے ہنس کر کہا " مائی ڈیر ٹل گاڈ ٹکر۔ آج کل تاریخ کا زمانہ نہیں رہا۔ آج کل کے نئے لونڈے تاریخ کے بجائے جغرافیے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اب اس ہیروئن کا جغرافیہ دیکھو! " پروفیسر ٹل گاڈ ٹکر ہنسنے لگا۔ اور جغرافیے کے پروفیسر کو کھینچ کر ہال سے باہر لے گیا۔

کئی ہفتے گزر گئے۔ مگر عشرت کو بیرو کا چانس نہ ملا۔ راج لتا نے بے حد کوشش کی۔ مگر اُسے کہیں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔ سیٹھ چھیدی لال نے تو تو سویر کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ "چھیدی ڈاکو" جس میں عشرت اور راج لتا دونوں کا کام تھا۔ مگر بعد میں ڈسٹری بیوٹروں کے کہنے پر اُسے اس تصویر کے بنانے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ کیوں کہ ڈسٹری بیوٹر ان دنوں مارکیٹ کے اندازے کے مُطابق سرمائے کی کمی کے باعث اور اس پر سُود در سُود کی زیادتی کے باعث زیادہ تصویریں بنانے کے حق میں نہیں تھے اور ان تصویروں میں تو وہ بالکل ہی کسی نئے چہرے کو لے کر کسی نئے فلم کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ چھیدی لال نے سب کچھ راج لتا کو اچھی طرح سمجھایا۔ "اگر نئے چہرے نہیں آئیں گے تو نئے لوگوں کو چانس کیسے ملے گا؟ ایک روز میں بھی تو نیا چہرہ تھی!" راج لتا نے پوچھا۔

لڑکیوں کی بات اور ہے۔" چھیدی لال نے مسکرا کر کہا۔ "اُن کے لئے زیادہ گنجائش ہے۔"

سیٹھ باکڑیا نے کہا "آج کل مندہ چل رہا ہے۔ ارے جب سے جنگ بند ہوئی ہے مندہ چل رہا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں راج فلموں کا حال کتنا بُرا ہے۔ جو فلم بناتے ہیں۔ ڈبوں سے باہر نکلتے ہی فیل ہو جاتی ہے۔ باکس آفس نے تو ہمارے ہوش گم کر دئے۔ کچھ معلوم نہیں۔ عام لوگ کیا چاہتے

ہیں۔ یہ سالے چونی والے"

کسی زمانے میں کم سے کم ٹکٹ چار آنے کا ہوا کرتا تھا۔ اور عوام اُسی میں جا کے بیٹھا کرتے تھے مزدور کاری گر۔ چھوٹے چھوٹے دوکان دار۔ کلرک۔ طالب علم سب چونی میں فلم دیکھتے تھے مگر جیوں جیوں گرانی بڑھتی گئی۔ فلم دیکھنے کے بھی دام بڑھتے گئے۔ اب بھی چونی کا ٹکٹ دس آنے میں خریدا جاتا تھا۔ لوگ اب اس کلاس میں بیٹھنے کے لئے چار آنے کے بجائے دس آنے دیتے تھے۔ مگر اُن سے روپیہ بٹورنے والے حضرات اب تک اُنہیں "سالے چونی والے" کہہ کر پکارتے تھے۔

"ریس کورس کو دیکھو۔ یہ سالے گھوڑوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اس سال میرا ایک گھوڑا بھی نہیں جیتا" سیٹھ بانکڑیا راج کو بتانے لگے۔

"مگر میں تو عشرت ـــــ!"

بانکڑیا نے راج کی بات کاٹ کے کہا" اور سٹاک ایکسچینج کو لو۔ چالیس سال سے سٹاک ایکسچینج کا دھندا کر رہا ہوں۔ ایسا بُرا زمانہ کبھی نہیں دیکھا۔ دو لاکھ تو کل ہی ہار گیا۔ ایک دن میں"

"مگر میں تو سیٹھ جی آپ سے سٹاک ایکسچینج نہیں، عشرت کی بات کرنے آئی تھی۔ دونوں کا آپس میں کیا تعلق؟"

"بہت گہرا تعلق ہے۔ تم نہیں جانتیں" سیٹھ چہک کے بولے۔

"سٹاک ایکسچینج ہمارے سماج کا پروڈیوسر ہے۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ تو سب کچھ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ یہ گُر تم نہیں جانتیں"

راج سٹ پٹا گئی۔ بولی "آپ عشرت کو ہیرو کا چانس دے رہے ہیں۔ کہ نہیں۔ صاف صاف بتائیے نا؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں" بانکڑیا نے راج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہا " اور اس کی ہتھیلی کی طرف غور سے دیکھ کے بولا "بہت لکی ہو۔ تم بہت لکی ہو"

راج نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

باٹلی والا نے مسکرا کے کہا "اگر زمانہ اچھا ہوتا۔ تو ضرور میں عشرت کو چانس دیتا۔ مگر اب تو میں نے سوچ لیا ہے۔ کہ اپن کو رِسک لینا ہی نہیں۔ سال میں چار پکچر بناؤ۔ جیادہ نہ بناؤ۔ مگر بڑی اسٹار کاسٹ والی پکچر بناؤ۔ پکچر بننے سے پہلے۔ ڈسٹری بیوٹر کو بیچ دو۔ نہ کھٹ کھٹ نہ پٹ پٹ "

راج اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھونا" باٹلی والا سیٹھ نے کہا "میڈم ابھی آتی ہوں گی"

راج جواب دیئے بغیر سیٹھ کی کیبن سے نکل گئی۔

جوشی راج محل میں شوٹنگ کر رہا تھا۔ وہ راج لتا کو۔ ساؤنڈ ریکارڈنگ کے کمرے میں لے گیا۔ اور انجینیر سے کہنے لگا۔ کہ وہ پندرہ بیس منٹ کے لئے باہر چلا جائے۔ اُسے راج لتا سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہے۔ جوشی راج لتا کو بہت دیر تک اونچ نیچ سمجھاتا رہا۔

"تم احمق ہو۔ بے وقوف ہو۔ پاگل گدھی ہو" جوشی نے راج سے کہا "آخر تم کیوں عشرت کو ہیرو کا چانس دلوانا چاہتی ہو"

"کیوں کہ میں اُسے چاہتی ہوں"

"بس یہی تمہاری حماقت ہے کہ تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اسے چاہتی ہو۔ دراصل نہ تم اُسے چاہتی ہو۔ نہ وہ تمہیں چاہتا ہے"

"وہ؟ ——— وہ میرے لئے جان بھی دے سکتا ہے" راج لتا نے اپنے پرس کو زور سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو۔ پیاری۔ کبھی تم ہماری بھی پیاری تھیں۔ اس لئے کم از کم اس لفظ کے برتنے کا حق تو مجھے دیدو" جوشی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ راج ذرا سا مسکرائی اور غور سے اس کی باتیں سننے لگی۔ جوشی کہہ رہا تھا "تم عورت ہو۔ بہت سی باتیں نہیں سمجھتی ہو۔ عشرت کو میں کل ہیرو کا چانس

دے سکتا ہوں۔ دلا سکتا ہوں مگر ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ صرف تمہارے بھلے کی خاطر۔ میں جانتا ہوں۔ تم اسے کتنا چاہتی ہو۔ مگر جس دن تم نے اسے ہیرو کا چانس دلوایا۔ وہ تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے گا آخر دوسری ہیروئنوں کے بھی تو عاشق ہیں۔ وہ بھی خوب صورت ہیں۔ بانکے ہیں۔ بھلے ہیں۔ نوجوان ہیں وہ لڑکیاں کیوں انہیں سنبھال کے رکھتی ہیں۔ کیوں انہیں کسی فلم میں ہیرو کا بلکہ ہیرو سے کم درجے کا رول بھی نہیں دلواتیں ؟"

راج لتا جوشی جی کا منہ دیکھنے لگی۔ واقعی یہ بات بڑی عجیب تھی۔ اُسے رنجنا اور اس کا دوست سنتوشں کمار یاد آیا۔

جوشی جی نے راج کا چہرہ دیکھا۔ اور اپنی آواز نیچی کر کے بولا "ڈارلنگ تمہارے بھلے کے لئے کہتا ہوں اگر عشرت کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہو تو اُسے کسی فلم میں چانس مت لینے دو۔ ورنہ ایک ہی تصویر میں کام کرنے کے بعد وہ تمہارے کام کا نہیں رہے گا۔ تمہارے ہاتھ سے جائے گا۔ دیکھ نو بھتر کمار کو سب سے پہلے آشا نے کام دلوایا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔

گل محمد کو رانی بالا نے کام دلوایا تھا۔ آج گل محمد نے ارشاد سے شادی رچالی ہے۔ اور رانی بالا۔ منہ تاکتی رہ گئی۔ اگر تم عشرت کو اپنے ہاتھ سے کھونا چاہتی ہو۔ تو کل اُسے میرے پاس بھیجو۔ میں اُسے کام دے دوں گا۔" جوشی جی نے چٹکی بجائی

راج سوچنے لگی۔ بات تو ٹھیک کہتا ہے۔

جوشی جی نے کہا "ڈارلنگ۔ تم نے ہمیں چھوڑ دیا۔ مگر ہم اب بھی تمہارے بھلے کے لئے سوچتے ہیں۔ تم عشرت کو اس طرف لاؤ ہی نہیں۔ اُسے ناچ پارٹی۔ اچھے کپڑے۔ ہاؤ ہو میں ایسا گم کر دو کہ صبح سے شام تک اسے فلم کا دھیان تک بھی نہ آئے۔ وہ فلم میں آیا۔ اور تمہارے ہاتھ سے گیا۔ کیوں ؟"

راج نے سوچتے ہوئے کہا "بات تو تم ٹھیک کہتے ہو"

جوشی جی نے خوش ہو کر اُسے گلے سے لگا لیا اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اس کا پیار لینے کی کوشش کرنے لگے۔ چند لمحوں کے لئے تو راج نے اُن کے لمس کو برداشت کیا۔ پھر اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولی

"اچھا اب یہ کتوں کی طرح کیا بچ بچ لگا رکھی ہے۔ چھوڑ دو مجھے"

اُس نے اپنے آپ کو جوشی جی کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اور ریکارڈنگ روم سے باہر نکل گئی۔ باہر انجینیر دیوار سے لگا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ راج کو دیکھ کر مسکرایا۔ راج جلدی سے اپنی ساڑی سنبھالتی ہوئی تیزی سے گزر گئی۔

"سالی!" انجینیر نے سگریٹ پھینک کر اُسے اپنے پاؤں تلے دباتے ہوئے کہا۔

ایک سال گزر گیا۔ عشرت کو کہیں ہیرو کا چانس نہیں ملا۔ یہ سال عام لوگوں کے لئے بڑی مصیبتوں کا سال تھا۔ بہت سے سٹوڈیو میں لائٹ مینوں اور دوسرے مزدوروں کو تنخواہ ملے چھ چھ ماہ ہو گئے تھے چمبور میں ایک سٹوڈیو بند ہونے والا تھا بہت کم تصویریں بن رہی تھیں۔ ایکسٹرا لوگ تو بے کار رہتے ہی تھے۔ اَب اس کا اثر دوسرے درجے کے اداکاروں پر بھی پڑ رہا تھا۔ جو کریکٹر رول کیا کرتے تھے اُن میں سے بہت سے لوگوں کی گاڑیاں گروی ہو کے کالبادیوی روڈ کے سیٹھوں کے پاس پہنچ چکی تھیں یہی لوگ تھے جو انڈسٹری میں روپیہ بھی لگاتے تھے۔ جب اُن لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو سرمائے کی شرح سود بھی بڑھا دی۔ پہلے تیس چالیس فی صدی پر روپیہ مل جاتا تھا۔ اب پچھتّر فی صدی پر ملنے لگا۔ ایک لاکھ روپے پر پچھتّر ہزار سود دو۔ تو تصویر بناؤ۔ اب ایسے میں کیسی تصویر بنے گی اور کیا تیار ہو گی۔ ایک

ایماندار پروڈیوسر بھی بے ایمانی پر تل گئے۔ تصویریں شروع ہوتی تھیں اور آدھی یا ایک چوتھائی بن کے رہ جاتی تھیں۔ پروڈیوسر بیچ میں روپیہ کھا جاتے تھے۔ ایک لاکھ پر کچھتر ہزار سود کون دے گا؟

جوشی جی نے سیٹھ کرتر چند سے ایک لاکھ روپیہ سود پر لے کر اپنی بیوی کے نام پر ایک مکان بنا لیا تھا۔ میں ہزار فلم میں بھی لگایا تھا۔ دو ریلیں تیار ہو کے ڈبے میں پڑی تھیں۔ آگے کے لئے کام بند تھا۔ جوشی جی بانٹو کا سیٹھی کی تصویر مکمل کر رہے تھے۔ اب سیٹھ کرتر چند آگے بڑھے۔ مزید رقم دے تو اس کی بچی بن سکتی تھی۔ ورنہ عیش کرے جس طرح جوشی جی عیش کر رہے تھے۔

گرمرت اُدیر کے چالیس پچاس یا سو آدمی مزے میں تھے بمبئی کی فلم انڈسٹری میں کوئی پچیس ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ اُن ایک سو کو چھوڑ کے باقی سب کی حالت بدتر سے بدتر ہوتی جا رہی تھی راج کی بانہوں کے باہر اندھیرا تھا عشرت نے اُن خوب صورت بانہوں کے آسرے کو غنیمت جانا۔ عیش و عشرت نے اُسے کاہل اور سست الوجود بنا دیا تھا۔ وہ پہلے سے دُگنا موٹا اور بھاری ہو گیا تھا۔ اُس کا پیٹ تھوڑا سا آگے نکل آیا تھا۔ اس کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وہ شرمیلا پن نہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طرح کی طمانیت چھا گئی تھی۔ جیسے پلے ہوئے سُور کے چہرے پر ہوتی ہے۔ اب اُسے گندہ مذاق پسند آتا تھا۔ اب اُسے بھنگ یا وہسکی یا چرس سے نشہ نہ آتا تھا۔ وہ راج کے بھائی اُجینو کے ساتھ اُن تمام مراحل سے گزر کر مارفیا کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جب تک وہ مارفیا کا انجکشن نہ لے اسے نشہ نہیں ہوتا تھا۔

اجینو اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ وہ کہنے لگا "بھائی مجھے تو اب اس مارفیا سے بھی نشہ کم ہونے لگا ہے۔ میں تو اب سنکھیا چاٹنا شروع کروں گا۔"

"سنکھیا؟" عشرت حیرت سے بولا "سنکھیا سے تو آدمی مر جاتا ہے۔"

"ایک رتی سے شروع کروں گا۔" اجینو بولا "اور پھر خوراک بڑھاتے بڑھاتے بڑھاتے بڑھائے جاؤں گا۔

سنکھیا سب نشوں کا بادشاہ ہے۔ اور سچ پوچھو تو نشے کی معراج وہ مقام ہے جہاں آدمی سانپوں سے ڈسوانا شروع کرتا ہے۔"

"سانپوں سے!" عشرت کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں "تم مذاق کرتے ہو۔"

"مذاق نہیں ہے۔ ذرا اکم زہریلے سانپوں سے میں نے کئی سادھوؤں اور فقیروں کو ڈسواتے دیکھا ہے۔ انہیں صرف سانپ کے زہر سے نشہ ہوتا ہے۔ بس اس نشے کا جواب نہیں ہے۔ نشوں میں یہ عرفان کی آخری منزل ہے۔" "سانپ کا زہر!" عشرت کانپ اٹھا "نہیں اپنے لئے تو بس مارفیا کافی ہے۔ چھ سات گھنٹے ایسا جما ہوا نشہ ہوتا ہے کہ چنڈو کیا چیز ہے۔"

"اپن کو تو اب اس سے بھی نشہ نہیں ہوتا۔" ایمبینو ٹھنی بگھار کے بولا۔

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عشرت دوڑا دوڑا باہر گیا۔

شمشاد ٹیلی فون کر رہی تھی۔

عشرت نے کہا "راج تو کہیں باہر گئی ہے۔"

شمشاد بولی "کل عید ہے۔ ہمارے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ راج کی اور آپ کی۔ آئیں گے ناں؟"

عشرت نے کہا "ضرور آئیں گے۔ آپ بلائیں اور ہم نہ آئیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔"

شمشاد ہنسی۔ بولی "راج سے کہہ دیجئے گا۔ اسے میں دوبارہ ٹیلی فون کروں گی۔ اور ہاں دیکھئے،" وہ ٹیلی فون پر اپنی آواز نیچی کرتے ہوئے بولی "ایمبینو میاں کو نہ لائیے گا۔ میں نے بس بہت کم لوگوں کو بلایا ہے۔"

"جی بہت اچھا۔" عشرت نے ریسیور رکھ دیا۔

شمشاد خود تو اس قدر چالاک نہ تھی۔ لیکن اس کی دادی اماں بہت ہوشیار تھیں۔ وہ راج لتا ایسی نٹ کھٹ لڑکی کی حرکتوں کو پسند نہ کرتی تھی۔ وہ مفت لال پارک کے بڑے معزز علاقے میں ایک خوب صورت فلیٹ میں رہتی تھی۔ اس کے ہاں ہمیشہ عید کی دعوت ہوتی تھی مگر کبھی ایسا ہنگامہ نہ ہوسکتا تھا۔ جو راج کی دعوت میں ہوتا تھا۔ اس نے اس دعوت میں صرف دس جوڑے بلائے تھے کوئی آدمی اکیلا نہیں آیا تھا۔ اور کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ نہیں آیا تھا شمشاد کی دادی اس کا خاص خیال رکھتی تھی۔ کہ کسی ایسے آدمی کو نہ بلایا جائے۔ جو غلطی سے اس موقع پر اپنی بیوی کو لے کے چلا آئے راج کے ہاں یہ بھی ہوجاتا تھا۔ جس سے دعوت کی گرماگرمی میں خاوند سے ایسی حرکتیں ہوجاتی تھیں جس کا خمیازہ اُسے بعد میں بیوی کے سامنے بھگتنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں سے بے چاری بیویوں کو دُور ہی رکھنا چاہیئے۔

دادی اماں بہت سمجھ دار تھیں۔ اُنہوں نے ریاستوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ محفل کے آداب جانتی تھیں آج کل کی لونڈیاں! سب گڈمڈ کر دیتی ہیں۔

اس دعوت میں فلم کے لوگ زیادہ تھے۔ مگر تین جوہری بھی تھے۔ ان کے ساتھ تین سی کلاس کی ہیروئنیں بھی تھیں۔ راج لتا کے لئے یہ اُن لوگوں سے اس طرح ملنا واقعی ایک اچنبھا رہا۔ ویسے وہ ان لڑکیوں سے واقف تھی۔ مگر راج سے پہلی بار یوں ملنا ہوا۔ کیوں کہ بظاہر یہ لڑکیاں اپنے آپ کو بہت لئے دیئے رہتی تھیں۔ ان کی آمدنی یعنی فلموں سے آمدنی بھی زیادہ نہ تھی۔ اس لئے راج سمجھ نہیں سکتی تھی۔ کہ ان لڑکیوں کا بیش قیمت لباس قیمتی زیورات اور ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آتی

ہے؛ پیاری راج کتنی جلدی تم اپنے ماضی کو بھول گئی ہو۔ تلخ باتیں کون یاد رکھتا ہے۔ ایک دن یہ لڑکیاں بھی بامِ شہرت پر پہنچ کر بھول جائیں گی۔ آج یہ لوگ جدوجہد کر رہی ہیں۔ اور وہی ہتھیار استعمال کر رہی ہیں۔ جو کبھی تم نے کئے تھے۔ کتنا صدیوں پُرانا راستہ یہ ہے۔ کتنا آسان بھی ہے۔ ایک خوب صورت منچلی اداؤں والی عورت کے لئے!

دعوت میں کسی طرح کا ہنگامہ بھی نہ ہوا۔ شراب کا دور بھی نہ چلا۔ جوہری لوگ اور دوسرے لوگ بھی شمشاد کے لئے تحفے لائے تھے۔ شمشاد کا دوست گلاب داس خود ایک جوہری کا لڑکا تھا۔ ظاہر ہے، کہ اس کے تحفے سب سے عمدہ تھے۔ مگر دوسرے جوہریوں کے تحفے بھی۔ کوئی کم شاندار نہ تھے کوئی رعب کرنے کے لئے۔ کوئی وقار قائم کرنے کے لئے۔ کوئی مستقبل کی طرف نگاہ رکھتے ہوئے شمشاد کے لئے عمدہ سے عمدہ تحفے لائے تھے۔ اصلی ہیروں کے زیورات۔ ان لوگوں کا تاج اور گرین میں اکاؤنٹ چلتا تھا لندن، شکاگو اور نیو یارک میں ان لوگوں کے دفتر تھے۔ یہ لوگ بمبئی کے اصلی مالک تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گھڑیوں پر کوٹ اور قمیص کے بٹنوں پر اتنے ہیرے لگے ہوئے تھے کہ ان کی قیمت اس دعوت میں شریک ہونے والی تمام ہیروئنوں کے مجموعی بنک بیلنس سے زیادہ ہوگی۔ وہ صوفے پر اس طرح بیٹھے تھے۔ جیسے وہ اس صوفے کے مالک ہوں۔ جب وہ چائے پیتے تھے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پر احسان کر رہے ہیں۔ جب وہ لوگ کسی کی طرف دیکھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اُس کے بھی مالک ہیں۔ جس کی طرف وہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کے جسم کی ہر ادا کہتی تھی: ہم مالک ہیں۔ ہم مالک ہیں!

ان لوگوں کی بہت اچھی بیویاں تھیں۔ جن کے ساتھ بہت پیاری پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بچے تھے۔ خوب صورت پیارے بچے جو انگریزی اسکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ یہ لوگ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان لوگوں کو اُن کے گھروں میں اپنی پیاری بھولی بھالی ہوئی بیویوں کے ساتھ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ لوگ کبھی ایسی دعوتوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہاتھ پر

چندن لگائے ہوئے اس قدر پوتر۔ بالکل گنگا جل کی طرح شفاف اور نکھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ لوگ جو بیسویں صدی کے خدا تھے۔ مقدس تھے۔ اور ہر سوسائٹی میں پوجے جاتے تھے۔ یہ لوگ یہاں کیوں بیٹھے تھے جن کے پاس سب کچھ موجود تھا۔ پھر یہ زندگی سے کیا چاہتے تھے۔

سب کچھ کے بعد کچھ اور اس کے بعد کچھ اور ——— دیوتاؤ! کیا تمہاری ہوس کبھی نہیں مٹے گی؟ کیا تم کسی کو انسان نہیں بننے دو گے۔

ہندو دیو مالا میں کتنے ہی۔ ایسے دیوتا تھے۔ جن کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔ تو پھر آج کل کے لوگ کیوں نہ اپنا پرائیویٹ حرم رکھیں۔ گھر سے دور۔ گھر سے باہر۔ ایک صاف ستھرا فلیٹ۔ ایک سجی سجائی باندی۔ اُن کے حکم کے منتظر۔ کالبا دیوی روڈ۔ اور حمام اسٹریٹ کے خداؤں کے ہاں یہ فیشن میں داخل تھا۔ ایک بیوی اور ایک داشتہ۔ بہت سے بڈھے سیٹھ جو کسی قسم کے جنسی تعلقات نہ رکھ سکتے تھے۔ وہ بھی ایک داشتہ پالتے تھے ———

فیشن! ———

شمشاد کی دادی بہت خوش تھی۔ اَب کی پچھلی عید سے زیادہ تحفے آئے تھے۔ زیور بھی چالیس ہزار کے ہوں گے۔ اکیلے سیٹھ جسونت لال پارکھ نے پندرہ ہزار کے زیور دئے تھے۔ حالانکہ پچھلے سال اس نے صرف سات ہزار کا ایک ہار دیا تھا۔ جسونت لال پارکھ کی طرف شمشاد کی دادی نے غور سے دیکھا مگر سیٹھ جسونت لال پارکھ بڑے آرام سے چائے پی رہے تھے جیسے کچھ ہوا نہیں۔ مجھے اس سیٹھ کو کسی دن ٹیلی فون کرنا پڑے گا۔ دادی اماں نے دل میں سوچا۔ میری بے بی بڑی بے وقوف ہے اسے کچھ آتا جاتا نہیں بس دیکھو اس وقت بھی کیا مزے سے گلاب داس سے باتیں کر رہی ہے۔ ارے گلاب داس تو خالی ایک جوہری کا لڑکا ہے۔ مگر جسونت لال پارکھ تو کمرشیل ایسوسی ایشن کے سکریٹری ہیں۔ بڑی احمق ہے۔ ایک دفعہ بھی تو مڑ کے نہیں دیکھتی سیٹھ پارکھ کی طرف۔ بس گلاب کو دیکھ کر ہی مسکرائے جاتی ہے۔ اندھی!

دعوت بخیر و خوبی ختم ہوئی۔ سب لوگ چلے گئے۔ شمشاد نے راج اور عشرت کو روک لیا۔ دادی اماں اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شمشاد نے وسکی کی بوتل کھولی۔

اس سجے ہوئے فلیٹ میں بڑا سکون ہے۔ رنگ مدھم ہیں۔ پردے نظر نواز ہیں۔ تصویریں آرٹ کے بہترین نمونے ہیں۔ کتابوں میں عمدہ مصنفوں کی کتابیں بھی ہوئی ہیں۔ گلاب داس خوش ذوق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ عشرت نے سوچا۔ راج تنا کے گھر میں۔ کتنی انارکی ہے۔ کپڑے ہیں تو شوخ۔ تصویریں ہیں تو ننگی۔ رنگ ہیں تو چیختے ہوئے۔ اس کم بخت راج کو کبھی عقل نہیں آئے گی ———

رات! ———

یہ رات کتنی صاف ستھری اور مکلف ہے۔ گویا ابھی ابھی لانڈری سے دُھل کے آئی ہے۔ اس کے سیاہ لبادے سے کیسی ہلکی ہلکی خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں۔ شمشاد نے صرف ایک ہلکی سی روشنی رہنے دی پھر اس پر بھی سلک کا ایک رومال ڈال دیا۔ اب روشنی کتنی آہستہ سے چھنتی ہوئی آرہی تھی عشرت کو گویا نیند سی آنے لگی۔

شمشاد نے ریڈیوگرام پر مغربی ناچ کی ایک سست رفتار گت چھیڑ دی۔ شمشاد اور عشرت راج اور گلاب ہوتے ہوئے ڈانس کرنے لگے۔ کتنی خاموشی ہے۔ شمشاد کی آنکھوں میں کتنی بلاغت ہے۔ سنگیت ناچنے کو نہیں ایک دوسرے کے جسم میں پگھل جانے کو کہہ رہی ہے۔

پھر گیت ختم ہوگیا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔

شمشاد راج کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ باہر کمرے میں صرف عشرت اور گلاب داس رہ گئے۔ دونوں ہوتے ہوئے وسکی پیتے رہے۔ گلاب داس کے چہرے پر ایک عجیب طنز یہ مسکراہٹ تھی۔ عشرت کی آنکھیں نشے سے سُرخ تھیں۔ دونوں ہوتے ہوئے خاموشی سے وسکی پیتے رہے۔ لیے لوں میں کچھ کہنا بے کار ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد شمشاد اپنی خواب گاہ سے باہر آئی۔ مگر راج اس کے ساتھ باہر نہیں آئی شمشاد اُن دونوں کے سامنے آکے بیٹھ گئی۔ اس کا گلاس خالی تھا۔ عشرت نے اس کے لئے گلاس بنایا۔ شمشاد نے ایک گھونٹ پی کے کہا " اندر راج آپ کو بلاتی ہے" عشرت گلاس ہاتھ میں تھامے اُٹھا۔ اور شمشاد کی خواب گاہ میں چلا گیا۔ اس نے سوچا، اب میرے فرائض سرانجام دینے کا وقت آگیا ہے فرض فرض ہے ــــــــــــ

راج ایک بیڈ پر نیم دراز حالت میں بیٹھی اپنی جامنی رنگ کی ساڑی کے مُطلا پلّو سے کھیل رہی تھی عشرت اس کے قریب آکے بیٹھ گیا۔ راج نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اُس کے ہاتھ میں یاقوت کی ایک خوبصورت انگوٹھی چمک رہی تھی۔ جو عشرت نے اس سے پہلے نہ دیکھی تھی۔

"یہ انگوٹھی؟" عشرت نے پوچھا۔

"شمشاد نے مجھے دی ہے۔ دی نہیں ہے۔ مجھ سے بدل لی ہے۔ میں نے اُس کی انگوٹھی۔ اور اس نے میری انگوٹھی پہن لی ہے۔ آج سے ہم دونوں بہنیں بن گئی ہیں پہلے ہم دوست تھیں، مگر آج سے بہنیں ہیں"

"مبارک ہو!"

کچھ عرصے تک خاموشی رہی۔ راج پھر اپنی ساڑی کے پلّو سے کھیلنے لگی۔ آخر بولی "شمشاد بہن چاہتی ہے"

"کیا مطلب؟" عشرت کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"بس آج کی آج تم اس کے پاس رہ جاؤ"

"تمہارا مطلب ہے" عشرت نے بڑی حیرت سے پوچھا "جس طرح تم نے انگوٹھیاں بدل لی ہیں اُسی طرح ...."

"ہاں" راج نے مسکرا کے کہا "میں گلاب داس کے ساتھ جاؤں گی، تم یہاں رہو گے"

"مگر میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ تم ـــــ یہ ـــــ کیسے؟" غصّے کے مارے عشرت کے منہ سے کچھ اور نہ نکلا۔

ڈارلنگ ایک رات میں کیا ہوتا ہے" راج نے اپنے پلّو سے کھیلتے ہوئے کہا۔

یہ سچ ہے۔ کہ عشرت نے راج سے شادی نہ کی تھی۔ پھر بھی وہ اسی طرح رہتا تھا۔ جیسا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہو۔ وہ اسی طرح اس کا وفادار تھا۔ دل سے اور روح سے۔ اور حالات سے بھی۔ کسی طرح سے بھی اس نے کسی دوسرے طریقے سے نہ سوچا تھا۔ وہ چاہتا تو اِدھر اُدھر جا سکتا تھا۔ جیسے کہ اس کے ماحول میں دوسرے لوگ کرتے تھے۔ اور اُسے ہرگز بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اس قدر پٹ کر بس کر اس گندگی کا ایک حصّہ بن کر بھی وہ اس طرف نہ گیا تھا۔ وہ کمزور تھا، بُرا تھا، لالچی تھا یہ بھی سچ ہے کہ وہ راج سے دلی محبت نہ کرتا تھا۔ وہ خود ہیرو بن کر اس سے نجات پانا چاہتا تھا۔ مگر کچھ عرصے سے اس نے ہیرو بننے کا خواب بھی دیکھنا بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ اپنی قسمت پر قانع تھا۔ راج پر قانع، شراب پر قانع، اچھے لباس پر قانع اور مارفیے کے انجکشن پر قانع۔

پھر بھی وہ بدکار نہ تھا۔ اس وقت جب راج نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی تو کہیں کسی کونے میں کڑتی ہوئی ہرافت کے دو آنسو اس کی آنکھوں میں کھسک آئے۔

راج نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کے کہا: "دیکھو میں ذرا سی بات کے لئے اپنی بہن کو کیسے انکار کر سکتی ہوں"

عشرت اس قدر احمق تو نہ تھا۔ کہ کچھ نہ سمجھ سکتا۔ ایک چیرتے ہوئے لمحے نے اس کے اردگرد کے خول کو بیچ میں سے شق کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے حقیقت اس کے سامنے آگئی تھی ایک لمحے میں گویا۔ راج نے اپنے بڑھے ہوئے پالش شدہ ناخنوں سے اس کی روح کے لبادے کو تار تار کر دیا تھا۔ اور اُسے بالکل ننگا کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو اس طرح دیکھنے لگا۔

وجود سے نفرت ہوگئی۔ وہ کس لئے آیا تھا۔ کن ارمانوں اور زندوؤں کو لے کر بمبئی میں وارد ہوا تھا۔ وہ کس طرح سے جدوجہد کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر اس نے کس طرح جدوجہد کو ختم کرنے کے لئے ایک چھوٹا آرام دہ راستہ ڈھونڈھ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا کہ جدوجہد کا کوئی آرام دہ چھوٹا راستہ نہیں ہے۔ جدوجہد سخت جانکاہ طویل اور جاں گداز ہوتی ہے۔ اس میں خُون بھی تھوکنا پڑتا ہے۔ اور راستہ کبھی کبھی اتنا لمبا ہوتا ہے۔ کہ ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں آنکھیں اُسے دیکھتے ہوئے تھک جاتی ہیں۔

مگر صرف ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا۔ دوسرے لمحے میں اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ پھر یہ رات کتنی حسین ہے۔ کتنی نرم اور گداز۔ سہمی سہمی سرگوشیاں کرتی ہوئی سوجاؤ۔ سوجاؤ۔ زندگی نام ہے سوجانے کا۔ آنکھیں بند کرلینے کا۔ ہلکی ہلکی غنودگی آمیز موسیقی سننے کا جوان بانہوں کی گولائی میں اپنے آپ کو محسور کرلینے کا۔ ایک نئے جسم کی پکار سننے کا۔ ۔ ۔ ۔ آج تو سوجاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ یہ رات گزر جانے دو۔ کل سے وہ پھر جدوجہد شروع کرے گا۔ وہ راج کو اور شمشاد کو اور اسی قسم کے بے حد اونچے اور بے حد نیچے ماحول کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دے گا۔ پھر سے زندگی کا ایک نیا باب شروع کرے گا۔

مگر آج تو سوجاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ ایک رات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک ذرا سی بات تو ہے یکایک عشرت کو مارفیا کے انجکشن کی سخت ضرورت محسوس ہوئی۔

جب آدمی محبت نہیں کرتا ہے تو وہ اپنی زندگی میں ہیجان چاہتا ہے۔ راج کا خیال تھا۔ وہ عشرت سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ لیکن جب شمشاد نے اس کے سامنے یہ سوال رکھ دیا۔ تو راج کو فیصلہ کرنے میں ایک منٹ نہیں لگا۔ کسی طرح کی اُداسی۔ گھٹن وہ پریشان کن استعجاب جو اسے اس موقع پر محسوس کرنا چاہئے تھا۔ اس نے کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ اس بات پر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ دوسرے لمحے میں اس کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اور اس نے بالکل نئی نگاہوں سے

گلاب داس کی طرف دیکھا اور جنسی جذبے کی ہیجانی لہریں اس کے رگ و پے میں دوڑتی چلی گئیں۔ عشرت ٹھیک تھا۔ بہت عمدہ اور پیارا تھا۔ مگر یہ چیز بالکل نئی تھی۔ اس میں کتنا تھرل ہے! ہائے یہ تھرل!

موٹر گلاب داس اور راج کو لئے ہوئے جوہو کی پُرپیچ سڑک پر دوڑنے لگی۔

مگر جب ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ اور عشرت واپس نہ آیا تو راج کو تشویش سی محسوس ہوئی۔ اس نے شمشاد کو ٹیلی فون کیا۔

"کیا بات ہے۔ عشرت کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں بالکل ٹھیک ہے۔"

"تو پھر وہ آیا کیوں نہیں؟"

"یوں ہی۔ شمشاد ہنسی۔"

"یوں ہی کیا؟" راج نے ذرا خفا ہو کے پوچھا۔

"میں نے سوچا۔ کیوں نہ وہ ہفتے بھر کے لئے یہاں ٹھہر جائے۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

"ہفتے بھر کے لئے؟" راج ٹیلی فون پر چیخی۔

"چلاؤ نہیں بہن" شمشاد نے ٹیلی فون پر راج کو مشورہ دیا۔ عشرت کا بھی یہی خیال ہے۔

"یہی خیال ہے؟" راج نے غصے میں دوہرایا۔ "سنو شمشاد تم وہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"مگر" شمشاد بولی۔

مگر راج نے تب فون بند کر دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے کمرے میں زور سے چیخ رہی تھی۔

"بھیمو، شنکر، چچا داموور۔ تم سب کہاں مر گئے؟"

تھوڑی دیر میں خاندان کے آٹھ دس افراد، اور پانچ چھ نوکر اور نوکرانیاں راج کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ راج ایسا معلوم ہوتی تھی، جیسے غصے سے پاگل ہو رہی ہے۔

اس نے پاؤں فرش پر زور سے مار مار کر کہا۔

"جلدی سے گاڑی نکالو۔ سور کے بچّو!"

جب گاڑی ماہم کے کاز وے پر سے گزر گئی۔ تو راج نے پھر پاؤں پٹخ کر، اپنے خاندنشنگر سے کہا۔

"گاڑی تیز کیوں نہیں چلاتے ؟"

"چالان ہو جائے گا ۔"

"ہو جانے دو ۔"

"کوئی آدمی نیچے آجائے گا ۔"

"آجانے دو۔ مگر گاڑی تیز چلاؤ ۔"

یہ دو دن دادی اماں کے لئے بڑی مصیبت کے دن تھے۔ اپنی پوتی کو وہ کیسے سمجھائے کہ گلاب داس کی بات الگ ہے۔ اور اس نکمّے نکھٹو۔ نالائق۔ نوذ عشرت کو گھر میں رکھنے کی بات بالکل ہی اور ہو جاتی ہے۔ پھر بھی اس نے بار بار شمشاد کو سمجھایا۔ مگر شمشاد تو ایسے خوش تھی۔ جیسے اُسے کوئی نیا کھلونا مل گیا ہو۔ وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھی۔ اس نے راج کا ہیرو مار لیا تھا جیسے شطرنج میں کوئی وزیر یا سلطان کو مارتا ہے۔ وہ جیتی ہوئی بازی کو ہاری ہوئی بازی میں کیوں کر تبدیل کر سکتی تھی اور پھر عشرت نے رو رو کر اُسے بتایا تھا کہ کس طرح وہ اُسے چاہتا ہے۔ شروع ہی سے چاہتا تھا۔ مگر حالات نے اُسے ایسا مجبور کر دیا تھا کہ راج کے ہاں رہتے ہوئے وہ محبّت کا لفظ منہ پر نہیں لا سکتا

تھا گس طرح عشرت نے اس کے قدم چھو لئے تھے۔ جیسے وہ زہرہ کی دیوی ہو۔ اور گلاب داس کیسے اکڑ کے اس سے بات کرتا تھا۔ وہ اس کے روپے اور جواہرات کی بھوکی نہیں تھی۔ وہ مہینے میں خود ستر اسی ہزار کماتی تھی۔

گلاب داس کیسے اس پر حکم چلاتا تھا۔ جیسے شمشاد ہندوستان کی اول درجے کی ہیروئن نہ ہو۔ اس کی مقبوضہ جاگیر ہو۔ لفنگا۔ اب وہ اسے مزہ چکھا دے گی۔

لیکن راج کے آنے سے وہ ڈر بھی رہی تھی۔ بڑی تیز ہے۔ جانے کیا کیا کہے گی مجھ سے، تو بات بھی نہیں کی جائے گی۔ اور وہ تو ایک منٹ میں مجھے ہزار صلواتیں سُنا دے گی۔

اور راج کی حالت جب وہ شمشاد کے گھر پہنچی یہ تھی کہ اگر اس وقت شمشاد کی خوش قسمتی سے اس کی دادی اماں ڈرائنگ روم میں بیٹھی نہ ہوتیں۔ تو وہ شمشاد سے بات کرنے کے لئے زبان کے بجائے چپل سے کام لیتی۔ اس قدر اُسے غصہ تھا۔ اس کا لڑکا اور کوئی دوسرا لے جائے راج کی حالت اب پوری طرح سے آگ ہو چکی تھی۔ وہ عشرت کو بازو سے پکڑ کر اپنے گھر لے جائے گی۔ میں کبھی کچھ بھی کھوں گی میری چیز کو کون مجھ سے چھین سکتا ہے۔ واہ! ایک دن کے لئے اُدھار دیا۔ اور آپ مالک ہی بن بیٹھیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ اخلاق تو دنیا میں رہ ہی نہیں گیا ہے۔

راج اسی طرح جلتی بھنتی کڑھتی کوستی ہوئی جب ڈرائنگ روم میں آئی تو دادی اماں اُسے دیکھتے ہی اس کی بلائیں لینے لگیں۔ اور اُسے گلے سے لگا کے رونے لگیں۔ دادی اماں بڑی ہی ایک نمبر کی کٹنی اور زمانہ ساز تھیں۔ زمانے نے انہیں اور انہوں نے زمانے کو بہت اچھی طرح سے دیکھا تھا۔ وہ تو آدمی کو ایک نظر سے دیکھ کر بتا دیتیں کہ اس وقت اس کے دل میں کیا ہے۔ شمشاد راج کے آنے سے گھبرائی ہوئی تھی۔ راج غصے سے اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ دادی اماں کے دماغ میں یہ بات بالکل صاف واضح تھی۔ جنگ کا نقشہ انہوں نے اپنے سامنے ذہن میں بچھا لیا تھا۔ اور ایسا

وہ اس کے مطابق کام کرنے لگیں۔ کچھ بھی ہو جائے۔ عشرت کو واپس راج کے ماں جانا ہی پڑے گا کہاں عشرت ؟ کہاں گلاب داس۔ ایسا امیر سرمائے دار سیٹھ اب کہاں ملے گا۔ شمشاد کی عقل پر تو پردے پڑ گئے تھے۔ مگر دادی اماں نے دنیا اچھی طرح دیکھ رکھی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ اس دنیا میں کوئی محبت نہیں کرتا ہے۔ لوگ محبت سے کھیلتے ہیں۔ جیسے ہاکی سے۔ فٹ بال سے کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل کے بھی اصول ہوتے ہیں۔ اور اب شمشاد ان اصولوں سے انحراف کر رہی تھی۔ شمشاد کو ہوش میں لانا ہی پڑے گا۔ سچی محبت میں لاکھوں کی کمائی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آ سکتی ہے۔ عمدہ سے عمدہ فلیٹ کیسے خریدے جا سکتے ہیں۔ آدمی کو محبت نہیں کرنی چاہئے۔ محبت سے کھیلنا چاہئے محبت کا کھیل بہت عمدہ ہے۔ دل کا روگ بہت بُرا ہے۔ اور شمشاد بڑی جذباتی لڑکی تھی۔ عشرت کے آنسوؤں نے اُسے رام کر لیا تھا۔ دادی اماں جانتی تھیں۔ مگر شمشاد نہیں جانتی تھی۔ کہ عشرت کا کھیل کیا ہے۔ وہ اپنا کھیل کھیل رہا تھا۔ دادی اماں ایک ہوشیار کھلاڑی کی طرح اُسے مطعون نہیں کرتی تھیں وہ اگر عشرت کی حالت میں ہوتیں تو غالباً یہی کرتیں۔ ان کے ذہن میں عشرت کے لئے تعریف کے کئی پہلو مخفی تھے۔ مگر انہوں نے اُن دونوں میں عشرت پر بالکل کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے اس سے بات بھی نہیں کی۔ اس کا آداب بھی قبول نہیں کیا۔ بہت بُری بات تھی۔ لڑکا حسین تھا۔ خوب رُو تھا۔ مسلمان تھا۔ اچھے گھرانے کا تھا۔ مگر امیر ہوتا تو دادی اماں کو کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا۔ مگر ــــــــ!

دادی اماں نے پہلے تو راج کی بلائیں لیں۔ پھر رونے لگیں۔ پھر آنسو پونچھ کر کہنے لگیں: "یہ (شمشاد کی طرف اشارہ کر کے) یہ تو بچی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ تم دونوں۔ تم دونوں سہیلیوں کی چھ سال کی دوستی اور بہناپا کیا ایک مردوئے کے لئے قربان کیا جا سکتا ہے ؟"

"اسی بات پر مجھے بھی حیرت ہوئی اماں" راج دادی اماں کو اپنا ہم خیال پا کے بہت خوش ہوئی

اس کا لہجہ بھی بدل گیا۔" ہماری دوستی پر تو ساری فلم انڈسٹری رشک کرتی تھی۔ سگی بہنوں سے بھی زیادہ ہم میں محبت تھی۔ سدا کا ساتھ، اُٹھنا بیٹھنا کھانا پینا سب اکٹھا۔ اور اب یہ یکایک . . . " راج نے شکایت آمیز نگاہوں سے شمشاد کی طرف دیکھا۔

شمشاد کی نگاہوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولی" میں کب کہتی ہوں تمہاری سہیلی نہیں ہوں۔"

"عشرت کہاں ہے ؟" راج نے شمشاد سے ڈپٹ کے پوچھا۔

"اندر بیڈ روم میں ہے۔" شمشاد نے ذرا گھبرا کے کہا۔

" اسے رہنے دو۔" دادی اماں نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا" ہماری آپس کی گفتگو میں اُسے رازدار بنانا مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ جو فیصلہ کریں گے وہ ہم لوگ آپس میں بات چیت کر کے طے کریں گے۔ اُسے بیچ میں بولنے کا کیا حق ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" راج بولی۔

" تو تو اس کے لئے مجھے چھوڑ دے گی۔" راج نے شمشاد سے پوچھا۔

شمشاد نے کہا" یہ میں نے کب کہا ہے۔ میں نے ٹیلی فون پر یہی کہا تھا کہ ایک دن اور ایک ہفتے میں کیا فرق ہے۔ یوں پلک جھپکتے میں گزر جائے گا۔"

"مگر مجھے منظور نہیں ہے۔" راج ذرا سختی سے بولی۔

"اور مجھے بھی" دادی اماں نے کہا۔

شمشاد نے رنجیدہ ہو کے کہا " مگر میں زبان دے چکی ہوں۔"

شمشاد نے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔

"اس سور کو میرے سامنے لاؤ۔" راج غصے سے صوفے پر سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ مگر دادی اماں نے ہاتھ پکڑ کر اُسے واپس بلا لیا۔

"اس پر غصہ نہ کرو۔ یہ مردوے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ انہیں نت نئی ملتی رہے۔ یہ بہت خوش رہتے ہیں عشرت کی بات جانے دو راج۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے"

شمشاد نے سر ہلایا۔ "ہاں۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے"

"تو عشرت کو میرے حوالے کر دو۔ بس"

"مگر میں وعدہ کر چکی ہوں۔ اور پھر مجھے اس سے محبت بھی ہو گئی ہے" شمشاد بولی۔

"مگر تم تو مجھی اسٹوارٹ! ــــــــ؟" راج نے فقرہ نا تمام رہنے دیا۔

"ہاں۔ مگر ــــــــ یہ بھی چلے گا" شمشاد آنکھوں میں آنسو لا کے بولی۔

"محبت وغیرہ کچھ نہیں ہوتی اسے" دادی اماں نے راج سے کہا "بس کسی وقت مری طرح کی ضد آجاتی ہے اِسے۔ میں تو اسے خوب جانتی ہوں۔ اچھی طرح سے . . . . لے اب دونوں سہیلیاں گلے مل جاؤ مل جاؤ۔ مل جاؤ!!"

دادی اماں نے راج اور شمشاد دونوں کو پکڑ کر ایک دوسرے کے گلے سے لگا دیا۔

گلے لگتے ہی دونوں سہیلیاں خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے لگیں۔ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔ روتے روتے شمشاد نے کہا "جانیاں میں نے تیرے ساتھ بڑا دھوکہ کیا، ہائے اپنی سہیلی کے ساتھ دھوکہ کیا؟"

راج سسکتے ہوئے بولی "تُو تو میری جان ہے شمو۔ میں تو عشرت کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ مگر تیرے بغیر نہیں"

شمشاد نے ایک سگرٹ سلگا کے راج کے منہ میں رکھا۔ بولی "لے جا، لے جا۔ تو اب عشرت کو لے جا"

راج شمشاد کی بلائیں لے کے بولی "نہیں جانیاں۔ تجھے اگر اچھا لگتا ہے۔ تو تُو رکھ لے۔ میں کیا اتنی گئی گزری ہوں کہ اپنی سہیلی کے لئے ذرا سی قربانی بھی نہ دے سکوں"

"نہیں لے جا"

"نہیں رکھ لے"

"نہیں لے جا"

"نہیں رکھ لے"

برابر کی چوٹ تھی۔ دونوں ہیروئنیں اس وقت فیاضی کے موڈ میں تھیں۔ اور ایک دوسرے کی محبت جتانے کے سلسلے میں کوئی کسی سے مات کھانے کے لئے تیار نہ تھی۔ دادی اماں نے کہا "میرا فیصلہ یہ ہے ــــــ" دادی اماں یہ کہہ کر رُک گئیں۔ راج اور شمشاد سگریٹ پیتی ہوئیں۔ دادی اماں کے مُنہ کی طرف تکنے لگیں۔

دادی اماں نے کہا "میرا فیصلہ یہ ہے۔ کہ عشرت نہ راج کے پاس رہے نہ شمشاد کے پاس۔ بلکہ آٹھ ہفتے وہ رنجنا کے پاس رہے گا۔ ایک ہفتے کے بعد راج اُسے اپنے پاس بُلائے گی۔ اس طرح سے شمشاد کا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا کہ اس نے ایک ہفتے تک عشرت کو راج کے پاس نہ بھیجا۔ اور راج کی بات بھی پوری ہو جائے گی۔ کہ عشرت یہاں شمشاد کے گھر نہ رہا"

دونوں ہیروئنیں خوشی سے تالی بجا کے بولیں "واہ! واہ! کیا اچھی ترکیب ڈھونڈ نکالی ہے تم نے دادی اماں!"

راج اور شمشاد دونوں دادی اماں سے لپٹ گئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد راج نے مُنہ لٹکا کے کہا "مگر رنجنا کا اپنا دوست بھی تو ــــــ؟"

"وہ پونا گیا ہوا ہے" دادی اماں کو فلم انڈسٹری سے کافی واقفیت تھی۔

"مگر وہ مان جائے گی کیا؟" شمشاد نے شبہے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ عشرت اور رنجنا کو سنبھالنا میرا کام ہے۔ میں ابھی رنجنا کو ٹیلی فون کرتی ہوں"

تھوڑی دیر کے بعد دادی اماں نے عشرت کا سوٹ کیس بند کر کے اسے رنجنا کے ہمراہ کر دیا۔ اس سے پہلے ہی وہ راج کو کہہ چکی تھی چکے سے کہ وہ رنجنا کے آنے سے پہلے ہی شمشاد کو اپنے گھر لے جائے۔ تاکہ معاملت میں آسانی رہے۔ چنانچہ جب رنجنا عشرت کو لے کے گئی۔ اس وقت گھر میں دادی اماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ عشرت سے نہ راج ملی۔ نہ شمشاد۔ عشرت کے پاؤں تلے جتنی زمین تھی وہ سب کی سب دادی اماں نے کھسکائی تھی۔ اور اب عشرت کو سہارا لینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس نے رنجنا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رنجنا کا اپنا دوست سنتوش کمار پندرہ بیس روز کے لئے پونا گیا ہوا تھا۔ جب اُسے دادی اماں نے بتایا کہ عشرت اور راج کی آپس میں چل گئی ہے۔ تو اس نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھانا مناسب سمجھا۔ اور پھر عشرت کس قدر حسین تھا۔ کئی دفعہ پارٹیوں میں رنجنا نے راج کے ساتھ اُسے دیکھا تھا۔ یونانی دیوتا کی طرح۔ مضبوط اور گٹھا ہوا۔ اس نے کبھی رنجنا کی طرف آنکھ اُٹھا کے دیکھا بھی نہ تھا اس لئے اب ——— اب ؟ ———

رنجنا کے لبوں پر اطمینان اور انتقام کی مسکراہٹ آئی۔ اُس نے عشرت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا "آؤ" مگر جب وہ عشرت کو لے کے اپنے گھر پہنچی تو اس کی خادمہ نے اسے بتایا۔ کہ اس کے جانے کے بعد پونا سے ٹرنک کال آیا تھا۔ اس کا دوست آج رات کی گاڑی سے واپس آ رہا تھا۔ خادمہ نے ٹیلیفون کا پیغام لے لیا تھا۔

اب رنجنا کیا کرے۔ پسینہ اس کے ماتھے سے چھوٹنے لگا۔ سنتوش کمار بڑا ظالم تھا۔ وہ اس سے بہت ڈرتی تھی۔ رنجنا نے عشرت کو بتایا۔

عشرت نے کہا " آنے دو سالے کا سر پھوڑ کے رکھ دوں گا "

" نا۔نا بھیا" رنجنا بڑی بزدل تھی۔ ڈر کے بولی " مجھے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں چاہئے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر تم اب یہاں نہیں رہ سکتے "

عشرت خاموش ہو گیا۔ اب وہ کہاں جائے۔

رنجنا نے راج کو ٹیلیفون کیا "راج" رنجنا نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا " تمہارا عشرت شاید تم سے لڑ کر یہاں آگیا ہے۔ اپنا سوٹ کیس اُٹھائے ہوئے۔ مگر میں ڈارلنگ اسے اپنے پاس کیسے رکھ سکتی ہوں سنتی ہو؟"

"ہاں۔ ہاں سنتی ہوں" راج جو سارے واقعے سے واقف تھی۔ انجان بن کے بولی۔

" تو بہنا تم اسے آ کے لے جاؤ "

" ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ آج ہی تو ہماری لڑائی ہوئی ہے۔ اسے ہفتہ بھر اپنے پاس رکھو۔ میں آ کے لے جاؤں گی، اور تم بھی تو آج کل ــــــــــ "

" نہیں نہیں" رنجنا چلا کے بولی " وہ آج شام کو آنے والے ہیں۔ بہنا۔ میں باز آئی۔ تم آ کے اسے ابھی لے جاؤ "

اس وقت شمشاد اور راج دونوں راج کے گھر صوفے میں دھنسی بیٹھی تھیں۔ بلکہ نیم دراز حالت میں۔ ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھی تھیں۔ جب یہ ٹیلیفون آیا۔ راج نے بڑی بے دلی سے کہا " اسے بھیج دو "

"کہاں بھیجوں؟"

" جہاں اُس کا جی چاہے " اتنا کہہ کر راج نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ مگر پھر فوراً ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ عشرت بول رہا تھا۔

" راج میں آجاؤں " عشرت نے بڑی مشکل سے کہا۔

"نہیں۔"

"تو پھر میں کہاں جاؤں؟" عشرت نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔

"جہنم میں جاؤ!"

راج نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ یکایک اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک عرصہ ہوا عشرت سے اُکتا چکی تھی۔ وہ اُسے ذرا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں اور دماغ میں محبت تو کیا۔ ندامت کا ایک شائبہ تک نہ تھا۔

عشرت نے اپنا سوٹ کیس اُٹھایا۔ ڈرائنگ روم سے باہر برآمدے میں آیا۔ برآمدے سے پورچ میں آیا۔ پورچ سے باہر سڑک پر آیا۔ سڑک سنسان تھی تاریکی گہری تھی۔ وہ دیر تک چلتا رہا آج اس کے اِردگرد کوئی فاصلہ نہ تھا۔ کوئی منزل نہ تھی۔ اور جب راستے میں راہ گیروں نے اُسے دیکھا، تو ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئے۔ کیوں کہ آج عشرت کے پاس کوئی چہرہ بھی نہ تھا۔ آج وہ موت کی طرح چل رہا تھا۔

کتنے ہی مہینے گزر گئے۔ اکرم کو کوئی ایسا کام نہ ملا جسے وہ اپنے ضمیر کو بُری طرح مجروح کئے بغیر کرسکتا۔ یہ ضمیر، یہ جنس اُس کے لئے اس قدر تکلیف دہ کیوں ہے۔ بہت سے لوگ بلکہ اکثر و بیشتر لوگ اس کی فلم انڈسٹری میں اس طرح گھومتے تھے جیسے انہوں نے اپنڈے سائی ٹس کی طرح اپنے ضمیر کو بھی آپریشن کروا کے نکلوا دیا ہو اور کسی دوسرے طریقے سے ان کا روزمرہ کا چلن اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ خود بھی کیوں نہیں اپنے ضمیر کا آپریشن کروا لیتا۔ ایسے تو وہ بھوکا مر جائے گا۔

اور اب تک وہ بھوکا مر گیا ہوتا اگر وہ اپنی بہن کے پاس رہتا نہ ہوتا۔ رشیدہ کسی طرح اسّی روپے میں پورے گھر کو چلاتی تھی، اسے بسا اوقات حیرت ہوتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اب نفیس اور حبیب رشیدہ کے دونوں بڑے لڑکے اخبار بیچنے کا کام کرتے تھے۔ مگر زندگی گویا موت کی حدوں کو چھو کر گزرتی تھی اس زندگی کی کیسی تیز دھار ہے۔ ذرا نگاہ چوکی، قدم پھسلا۔ چند ماہ کی علالت یا چند ماہ کی بے روزگاری اور آدمی غائب۔

پریل میں آج دیوالی کی بہار تھی۔ قمقموں کی جگمگاتی قطار آسمان پر پھلجھڑیوں کی اُڑتی ہوئی ڈار، اناروں کی بہار اور اُچھلتے کودتے، پٹاخے چھوڑتے ہوئے بچوں کی چیخ و پکار قابلِ دید تھی۔ اسے دیوالی بہت پسند

تھی۔ مگر آج تو ایک موم بتی خریدنے کے لئے اس کی جیب میں پیسے نہ تھے۔ نفیس ایک عرصے سے بیمار تھا۔ کھانسی اور بخار جو جاتے ہی نہ تھے۔ ڈاکٹر نے بہت سے انجکشن اور دوائیاں تجویز کی تھیں، اور رشیدہ کئی دنوں سے اکرم سے کہہ رہی تھی۔ کبھی ایک فقرے سے، ایک اشارے سے۔ ایک علامت۔ کیوں کہ وہ بہت کم بولتی تھی، لڑ کر اپنے بھائی سے نہ کہہ سکتی تھی۔ اسے زندگی سے لڑنا تو خوب آتا تھا مگر وہ اپنے بھائی سے اس طرح نہ لڑ سکتی تھی۔ نفیس کو بہت تیز بخار تھا، اور وہ بخار میں واہی تباہی بک رہا تھا۔ ڈاکٹر کا پچھلا بل پچاس روپے کا ہو گیا تھا۔ اس لئے رشیدہ کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ڈاکٹر کو بلا لائے، اور پھر جو دوائیاں اور انجکشن اس نے لکھ کر دئے تھے وہ کہاں سے لائے گی۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب خود کسی طرح سے آجاتیں۔ مگر محض ڈاکٹر کے آجانے سے تو اس کا لڑکا اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے دوا بھی تو چاہئے۔ اکرم بھی خوب سمجھتا تھا۔ مگر بے بس تھا۔ اتنے دنوں تک وہ کوشش کرتا رہا مگر کہیں سے اسے کام نہ ملا۔ نہ کوئی رقم اُدھار ہی ملی۔ آج دیوالی کے روز سیٹھ بانکڑیا نے ازراہِ عنایت اسے کچھ رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بہت جلد کوئی اس کے ڈھنگ کی تصویر شروع کرنے والے ہیں جو اکرم بخوشی ڈائریکٹ کر سکے گا۔

اکرم بہت خوش ہوا تھا۔ سیٹھ بانکڑیا نے دیوالی کی خوشی میں سارے سٹاف کو بونس بانٹا تھا اور شام کے وقت چند خاص خاص لوگوں کو اپنے آفس میں وہسکی پینے کے لئے بلایا تھا۔ اکرم بھی انہیں خوش قسمت لوگوں میں سے تھا۔ سیٹھ بانکڑیا کا اپنا پرانا گینگ تھا۔ سیٹھ بھگت لال۔ چور گھڑے۔ جوشی جی۔ میڈم راج۔ شمشاد۔ سیٹھ کستور چند۔ بچن دت۔ اور بابو ڈانس ماسٹر۔

دیر تک وہسکی چلتی رہی۔ دیر تک رات بہتی رہی۔ دیر تک ہوس نگاہوں ہی نگاہوں میں اُڑتی رہی۔ ایک بھنبھناتی ہوئی مکھی کی طرح وہ اس رُخسار سے اُس رخسار اور اس جام سے اُس جام اور اس آنکھ سے اُس آنکھ تک اُڑتی رہی۔ اکرم برابر پیتا رہا۔ ضرورت سے زیادہ پیتا رہا۔ پینے سے زیادہ بہکتا رہا۔ مگر اوپر سے نہیں اندر ہی اندر بہکتا رہا۔ اس کے تخیل میں ایک سمندر تھا۔ ایک ساحل تھا۔ ساحل پر ننگے جسم تھے

کسی نے وائیلن رکھ دی۔ وائیلن کے تاروں سے سُر نہیں سو سو کے نوٹ نکلتے تھے اور ان جسموں پر بچھے جاتے تھے حتّٰی کہ وہ جسم ان نوٹوں سے بالکل چھپ گئے۔ پھر وہ نوٹ اوپر اٹھتے اٹھتے ایک میز بن گئے۔ میز کے اوپر چند ہاتھ تاش کھیلنے لگے۔ تاش میں کوئی بیگم، بادشاہ، یکّہ نہ تھا۔ ہر تاش کے پتّے پر عجیب سے لوگوں کی تقدیریں تھیں۔ کوئی پھاوڑا چلا رہا تھا۔ کوئی سڑک کوٹ رہا تھا۔ کوئی کپڑا بن رہا تھا۔ کوئی انجن چلا رہا تھا۔ کوئی کپڑے سی رہا تھا۔ کوئی سیٹ بنا رہا تھا۔ کوئی پھول اُگا رہا تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ کسی کی آنکھیں غائب تھیں۔ کوئی ہسپتال میں پڑا چیخ رہا تھا۔ کوئی مرگھٹ کو جا رہا تھا۔

مگر جو کھیلنے والے ہاتھ تھے وہ بڑے خوب صورت، مخروطی اور حنائی پوریں لئے ہوئے تھے۔ کسی کی انگلی میں دو تولے سونے کی مردانی انگوٹھی میں نگل کا لال تھپر تھا۔ کسی کی کلائی میں سونے کی زنجیر تھی یا ہیرے کا کنگن تھا۔ کسی کی چھنگلیا میں ہیروں سے جڑی ہوئی انگوٹھی تھی جس کے درمیان میں ایک گھڑی ٹکی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ تاش کو اٹھاتے۔ زور سے میز پر رکھتے

کٹ!

ڈیل!

چلو۔

پتّے ادھر سے اُدھر پھینکے جاتے اور کوئی ہسپتال چلا جاتا۔ کوئی پاگل خانے۔ کوئی مرگھٹ کو کوئی کارخانے کو، اور کوئی ڈاک خانے کو۔ کوئی پتّہ سڑک پر کھڑا ہو کے بھیک مانگنے لگتا۔ پھر کبھی کوئی خوبصورت انگوٹھیوں سے مزیّن ہاتھ اس پتّے کو اٹھا کر ایک طرف ڈال دیتا۔ او۔ ہر ہنس کر اپنے ساتھی سے کہتا تیرے پاس ایک جوکر آگیا ہے"

اکرم نے بہت پی تھی اس نے اپنا سر ہلایا، آنکھیں جھپکائیں۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ سیٹھ کے دفتر میں اکیلا ہے۔ اس کے سامنے جوشی جی کا اسسٹنٹ بجھا چاہ رہا بیٹھا ہوا اس کی طرف تک

رہا ہے۔

"میں کہاں ہوں؟" اکرم نے پوچھا۔

"سیٹھ کے دفتر میں" بھتا چاریہ نے جواب دیا۔

"سیٹھ کہاں ہے؟"

"بہار جیل پر"

"مگر مجھے اُن سے ——— انہوں نے مجھ سے وعدہ ———" اکرم خاموش ہوگیا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی، مگر اس کی ٹانگوں نے اسے جواب دے دیا۔ بھتا نے اپنی جگہ سے اُٹھ کے اسے سہارا دیا، جب کہیں وہ چلنے کے قابل ہوا۔

باہر آکے بھتا نے کہا "آپ کی وجہ سے آج میری دیوالی حرام ہوگئی ——— آپ اتنا کیوں پی لیتے ہیں"

"کیوں کہ اس آتش کا کھیل مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔"

"تو مت دیکھئے"

"آنکھیں کیسے بند کروں"

بھتا نے بُرا سا منہ بنا کے کہا "جو شی جی کہہ گئے تھے۔ بس آپ کو گھر پہنچا دوں۔ اب بارہ بج چکے ہیں اور مجھے . . . ."

"تم رہنے دو" اکرم نے کہا "میں خود گھر چلا جاؤں گا"

"یقیناً؟"

"یقیناً!"

بھتا اکرم کو چھوڑ کے چلا گیا۔ پریل سے گزرتے ہوئے اکرم نے سوچا۔ آج نہ پھر خالی ہاتھ

اپنی بہن کے گھر جا رہا ہے۔ آج وہ پھر کیا کہے گا اسے۔ کیا کہے گا اُسے۔ کیا کہے گا . . . .

مگر رشیدہ بہت کچھ جانتی تھی۔ نہ صرف اپنے بھائی کو بلکہ اپنے بھائی کے ارد گرد کی زندگی کو۔ اسے اتنا کچھ معلوم تھا۔ جب ہی وہ خاموش رہتی تھی۔ بہت سے لوگ بہت سی باتیں کرتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔ بہت سے لوگ کچھ نہیں کہتے اور سب کچھ جانتے ہیں۔ ان کی خاموشی حماقت نہیں ہوتی ہے۔ اس نے جب اپنے بھائی کو اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے زینے سے چڑھ کے آتے ہوئے دیکھا! اس نے جب اُس کے سُتے ہوئے چہرے اور اس چہرے پر سُستی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تو وہ خاموش رہ گئی۔

اکرم نفیس کے سرہانے آ کے فرش پر بیٹھ گیا۔ نفیس کپڑا اوڑھے اور سر مونہہ ڈھانپے لیٹا تھا۔ اکرم نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کے بڑی تلخی سے کہا "سیٹھ نے مجھے اتنی دھمکی پلادی کہ اس سے بچے کے لئے ساری دوائیں اور سارے انجکشن آ سکتے تھے۔ مگر اس نے مجھے دھمکی پلادی، روپے نہیں دئے۔ رشیدہ میں کیا کروں ؟"

رشیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا ———— اُس نے نفیس کے سر پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ نفیس مُردہ پڑا تھا۔

اکرم نفیس کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اور اس کے دل میں صرف یہ خیال آیا کہ اگر وہ رشیدہ کے سر پر بار نہ ہوتا۔ اگر وہ خود کماتا ہوتا تو آج نفیس نہ مرتا۔ وہ رقم جو اس کے کھانے پینے اور روزمرہ کی ٹرام کے کرائے پر خرچ ہوتی تھی وہ رقم نفیس کی بیماری پر رشیدہ خرچ کر سکتی تھی۔ تو بھی رشیدہ نے ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ ایک روپیہ۔ ایک اٹھنی۔ ایک چونی۔ ایک دونی کر کر کے رشیدہ نے نفیس کی ساری زندگی اکرم پر خرچ کر دی۔ ہر لمحہ اس نے نفیس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اور ایک دفعہ بھی اس نے

اکرم کو اس گھر میں آتے ہوئے نہیں روکا۔ کیسی یہ اُس کی بہن تھی ؟ اکرم کا سارا بدن سر سے پاؤں تک کانپ گیا کیا وہ اس کا بھائی تھا ؟ اگر کسی طرح سے وہ اس گھر سے چلا گیا ہوتا۔ اگر اس نے کمانا نہ کمایا ہوتا ٹرام اور بس، گرہستی نہ بنایا ہوتا، تو آج نفیس زندہ ہوتا۔ کبھی کبھی تو رشیدہ کے سامنے بالکل واضح طور پر یہ کیفیت آئی ہوگی۔ یہ متبادل کیفیت یعنی ایک طرف اکرم ہے۔ دوسری طرف نفیس ہے۔ . . . .

ہائے جلاد ماں ! ہائے جلاد بھائی۔ ہائے جلاد زندگی ! تم دونوں کو زندہ کیوں نہ رکھ سکیں ؟ یہ کیسی زندگی ہے۔ خوراک۔ کرایہ۔ بجلی۔ پانی۔ چیزوں سے چیزوں سے چیزوں سے پھر چیزوں کی طرف واپس آجانا اور بیچ میں انسان کو غائب کر دینا۔ ایسے جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جیسے چیزیں اس کے لئے نہیں تھیں۔ وہ چیزوں کے لئے تھا۔

یکایک اکرم کی زبان پر نمک کا ذائقہ آیا۔ ہاں۔ یہ ایک آنسو تھا جو اس کے رخسار سے بہہ کر اس کے ہونٹوں کی راہ سے زبان پر آ گیا تھا۔ مگر کس قدر تلخ اور نمکین ! اکرم نے سختی سے اسے جھٹک دیا نفیس کے سر پر چادر اُڑھا دی اور خود بالکنی میں جا کے کھڑا ہو گیا۔

دوسرے دن جب وہ اور رشیدہ، حبیب اور جمیل۔ نفیس کو دفن کر کے لوٹے تو اکرم نے اپنا سوٹ کیس بند کیا اور اپنا بستر باندھنے لگا۔ اس کی بہن خاموشی سے کھڑی دیکھتی رہی۔ بستر باندھ کر اکرم نے ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھالیا۔ بستر کاندھے پر ڈال لیا۔

اس کی بہن نے اسے روکا نہیں۔ وہ اس کے ساتھ دروازے تک گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ میرا بھائی جارہا ہے۔ کل میرا بیٹا گیا۔ آج میرا بھائی جارہا ہے۔ میں اُسے روک نہ سکی۔ میں اسے بھی روک نہ سکوں گی۔ روکنے کے لئے بھی انسان کے پاس کچھ چاہیئے۔ رشیدہ نے سوچا۔ تمہارے پاس اگر کچھ ہے تو بھائی بھی کچھ ہے۔ وہ ایک خوب صورت جذبہ ہے۔ ایک پیارا نشہ ہے۔ اور اگر کچھ نہ ہو تو بھائی ایک بہت بُری عادت ہے۔

اکرم نے سوچا۔ کچھ ہو تو بہن ایک پھول ہے۔ نہ ہو تو ایک آنسو ہے۔

دونوں بھائی بہن خاموشی سے دروازے تک گئے۔ جب اکرم دروازے سے باہر نکلنے لگا تو رشیدہ نے اسے روک کر اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔ اور جلدی سے اندر آ کے دروازہ بند کر لیا۔ اکرم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے آنسو روک سکے، مگر نہ روک سکا۔ وہ وہیں بند دروازے کے باہر لگا لگا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دروازے کے اِدھر اکرم رو رہا تھا۔ دروازے کے اُدھر رشیدہ رو رہی تھی۔ دونوں کے بیچ میں زندگی سفید کفن کی طرح کھڑی تھی۔

ہارون بی روڈ کے مرکزی ایمپلائمینٹ ایکسچینج کے باہر چنے والے کے پاس اپنا سوٹ کیس اور بستر رکھ کر کرم دفتر میں داخل ہوا۔ اب اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ فلم کا کام نہیں کرے گا بلکہ کوئی دوسری نوکری اختیار کرے گا۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری جو بھی اُسے مل جائے گی وہ اُسے کر لے گا۔ یہی سوچ کر وہ ایمپلائمینٹ ایکسچینج میں عرضی گزارنے آیا تھا۔ یہاں ایک کلرک اس کا پہلے سے واقف تھا۔ اس لئے کام آسانی سے ہو گیا ورنہ جانے کتنے دن لگتے ایک عرضی گزارنے میں۔ کلرک اسے دفتر کے بڑے بابو سے ملا کے کیبن میں چلا گیا۔ بڑا بابو ان لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنی اہمیت کا احساس ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے اور جن سے حکومت کے سکریٹریٹ کے سکریٹریٹ بھرے پڑے ہوتے ہیں۔

بڑے بابو نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اپنی نیولے کی سی مونچھوں کو سنوارا۔ اپنی سفید قمیص کی سیاہ بو کو ٹھیک کیا اور کھانس کر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جایئے" بڑے بابو کے لہجے سے صاف ظاہر ہوتا تھا "تمہیں اس لئے بلا لیا ہے کہ تم میرے اسسٹنٹ کے واقف کار ہو۔ ورنہ . . . . ' بڑے بابو نے دو چار فارم نکالے۔ دو ایک کلپ اُلٹے سیدھے کئے۔ اور پھر مونہہ اُٹھا کر مینڈک کی سی آواز میں کہا "آپ کا نام ؟"

"اکرم !"

"باپ کا ؟"

"معظم !"

"سکنہ ؟"

"نور پور !"

"آہم ——" بڑے بابو ذرا سا کھانسے۔ اِک ذرا سے وقفے کے بعد پھر بولے۔ ان کی ہینڈ کا ئی لہجے میں وہ بات تھی، جو کہہ رہی تھی۔ دیکھو اب مُرے پھنسے! اب آرہی ہے اصل بات !

"کیا کام کرتے ہو ؟"

"کوئی کام کرتا تو یہاں کیوں آتا" اکرم نے جواب دیا۔

بڑے بابو ذرا چونکے۔ ذرا غور سے انہوں نے اکرم کی طرف دیکھا۔ بولے "میرا مطلب ہے کون ہو تم ؟ ٹائپسٹ ہو۔ مکینک ہو۔ ڈرائیور ہو ؟"

"میں شاعر ہوں" اکرم نے جواب دیا۔

"شاعر ؟" بڑے بابو چیخے "شاعر ؟ کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ شاعر ہوں۔ شعر کہتا ہوں۔ جیسے لوہار ہتھوڑا چلاتا ہے۔ بڑھئی لکڑی کاٹتا ہے ڈرائیور موٹر چلاتا ہے۔ ٹائپسٹ ٹائپ کرتا ہے اُسی طرح شاعر شعر کہتا ہے۔"

"مگر —— مگر شاعر کا ایمپلائمینٹ ایکسچینج میں کیا کام ؟"

"کیوں نہیں۔ بے روزگار شاعر ہوں۔ کام چاہتا ہوں"

بڑے بابو نے سر ہلا کے کہا "شاعری کوئی کام نہیں ہے"

"کیوں کام نہیں ہے۔ بڑی محنت، کاوش اور دماغ سوزی کا کام ہے"

"میرا مطلب ہے، وہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جس سے سماج کو فائدہ پہنچتا ہو۔ جیسے بڑھئی ہے، میکنک ہے، مدرس ہے، کلرک ہے، انجینیر ہے"

"میں بھی ایک انجینیر ہوں روحوں کا، ایک مدرس ہوں اخلاق کا، ایک میکنک ہوں سماج کا۔ ایک بڑھئی ہوں تخلیق کا"

بڑے بابو نے سر ہلا کے اس طرح کہا جیسے کسی دیوانے سے ان کا واسطہ پڑا ہو۔ "مسٹر اکرم! اگر تم میرے اسسٹنٹ کی معرفت نہ آئے ہوتے تو میں تمہیں ابھی کمرے سے باہر نکلوا دیتا، تم خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں کہہ چکا ہوں، ہمارے ہاں شاعر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر تم اس کے علاوہ کوئی ڈھنگ کا کام چاہتے ہو تو بولو۔ میں ابھی تمہاری عرضی داخل کرنے کو تیار ہوں"

اکرم نے میز پر مکا مار کے کہا "میں شاعر ہوں۔ میں بطور شاعر اور ادیب کے اس ملک سے اپنی روزی طلب کرتا ہوں"

"تو پڑے طلب کرتے رہو۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے"

"اگر ضرورت نہیں ہے تو کالی داس کا نام کیوں لیتے ہو۔ ٹیگور اور غالب کی کتابیں کیوں چھاپتے ہو۔ شیکسپیر اور پریم چند کا نام فخر سے کیوں لیتے ہو۔ ٹالسٹائے اور گورکی کے سامنے سر کیوں جھکاتے ہو۔ تم مجھے یہ بتاؤ۔ یہ تمہارا سماج کیا ہے؟ یعنی جب تک غالب زندہ رہا، تم نے اُسے بھوکا مارا۔ جیل میں سڑایا لیکن جب وہ مر گیا، اُس کے بعد تم نے اس کی تصویر اٹھا کے ڈاک کے ٹکٹوں پر چھاپ دی۔ اگر تمہیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر اس نے کوئی مفید کام نہیں کیا تھا تو کیوں چھاپی؟ جواب دو"

بڑا بابو کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے زور سے گھنٹی بجائی کہ ایک کے بجائے دو تین چپراسی اور دو ایک کلرک اندر دوڑتے آئے۔

بڑے بابو نے اکرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسے باہر نکال دو" پھر اس نے اکرم

سے کہا" لے مسٹر۔ تم پاگل خانے میں جاکر اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔ پھر یہاں آنا تمہاری عرضی لے لوں گا" جب وہ دفتر سے باہر نکلا، بلکہ جب اُسے نکال دیا گیا، تو اکرم کو احساس ہوا کہ اس نے کیسی غلطی کی تھی۔ وہ گیا تھا کام کی تلاش میں، خواہ مخواہ بڑے بابو سے اُلجھ بیٹھا۔ مگر اکرم نے سوچا۔ یہ نکتہ ہے مجھے کے لئے دور کرنے کے لئے۔ یہ شاعروں اور ادیبوں والی بات۔ آخر ہم لوگ کہاں جائیں۔

اکرم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے وہ چنے والا کہیں نظر نہ آیا جس کے پاس وہ اپنا سوٹ کیس اور بستر رکھ گیا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ بڑی مشکل کے بعد اُسے چنے والا دو پولیس کے آدمیوں میں گھرا ہوا سر پر چنے کی ٹوکری اور ہاتھ میں سوٹ کیس اور کندھے پر بستر اٹھائے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اکرم بھاگ کر اس کی جانب گیا اور موڑ پر اسے پکڑ لیا۔

چنے والے نے اکرم کو دیکھ کر بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ بولا " یہ پولیس والے مجھے چوری کے الزام میں پکڑ کر لئے جا رہے تھے۔ میں نے لاکھ کہا، آپ اندر گئے ہیں دفتر میں۔ مگر یہ مانے نہیں۔ بولے چلو تھانے۔ اب میں تھانے جا رہا تھا۔ بھگوان کی کرپا سے تم آ گئے۔ لو سنبھالو اپنا سوٹ کیس اور بستر اور اب کان پکڑتا ہوں۔ آگے کسی کی مدد نہیں کروں گا۔ بھلائی کا زمانہ نہیں ہے بابو۔۔۔۔۔۔"

اکرم نے اپنا سوٹ کیس اور بستر سنبھالا اور دادر کی طرف ہو لیا۔ آج رات تک اسے رہنے کے لئے کہیں نہ کہیں جگہ ڈھونڈنا پڑے گی۔

شام کے پانچ بجے وہ لال باغ میں تھا۔ لال باغ سے وہ غیرارادی طور پر پریل کی طرف روانہ ہوا۔ پریل پہنچ کر اس نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر سامنے کی بلڈنگ کی طرف دیکھا جس کے ایک کمرے میں اُس کی بڑی بہن رہتی تھی۔ اس کے دل میں بڑی شدت سے یہ خیال اُبھرا۔ کیوں نہ وہ واپس چلا جائے اپنی بڑی بہن کے پاس۔ پھر اسی شدت اور سختی سے اس نے اس خیال کو اپنے دل میں دبا دیا۔۔۔۔۔ نہیں وہ واپس نہیں جائیگا۔ اب وہ آگے جائے گا۔ کہیں پر خود اپنے لئے جگہ تلاش کرے گا۔ وہ اپنی بہن کی غریب

مجبوس اور نادار زندگی پر مزید ظلم نہیں توڑے گا۔

ہاں مگر یہاں پر یل کے فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے گویا اُس کی ٹانگیں اور اس کی ہمت سب جواب دینے لگیں۔ جاؤ۔ جاؤ۔ کوئی اس کے دل میں کہنے لگا۔ بار بار کہنے لگا۔ سامنے کی بلڈنگ میں چلے جاؤ۔ وہاں ایک کمرہ ہے۔ ایک بالکنی ہے۔ بالکنی میں بستر بچھا لو۔ آرام سے ٹانگیں پسار کے سو جاؤ۔۔۔۔ سو جاؤ۔ . . . سو جاؤ۔ . . .

اکرم نے یکایک سامنے کی بلڈنگ سے مونہہ پھیر لیا، اور آگے دادر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے وہ دادر کے ڈاک خانے تک پہنچ گیا۔ یہاں فٹ پاتھ پر جامن کا ایک گھنا پیڑ تھا۔ اکرم نے ستانے کے لئے ہاتھ سے سوٹ کیس زمین پر رکھ دیا اور خود بستر پر بیٹھ کر اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت پاؤں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے ڈالے۔ ہاتھوں کی انگلیوں پر چاندی کی بے شمار چھوٹی بڑی انگوٹھیاں پہنے اس کے پاس آئی اور بولی " بیٹا ایک خط تو لکھ دو "

اتنا کہہ کے اس عورت نے ایک پوسٹ کارڈ اس کے حوالے کیا۔

اکرم نے اپنی جیب سے اپنا پرانا قلم نکالا " کیا لکھوں اماں ؟"

" اب کیا بتاؤں بیٹا، کیا لکھو " وہ عورت اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کے بولی " میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ لکھوا کی سگائی اپنے گاؤں سودھرا میں کی تھی۔ مگر لکھوا نے یہاں جسودھا سے شادی کر لی "

" جسودھا کون ہے ؟ "

" میری بہو ہے۔ مگر مراٹھی ہے۔ نوگزی لانگ والی ساڑی پہنتی ہے۔ نہ میں اس کی بات سمجھوں نہ وہ میری بات سمجھے۔ دن میں دس بار تو لڑائی ہوتی ہے اور بعد میں بات کچھ نہیں نکلتی۔ معلوم ہوتا ہے اس نے میری بات غلط سمجھ لی ہے یا میں نے غلط سمجھ لی تھی۔ اب کیا کروں۔ لکھوا اپنا بیٹا ہے۔

اُدھر سودھرا کی بیوی بھی اپنی برادری کی تھی۔ اِدھر دھوبی لوگ کلوا کو جات باہر کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔"

"کیوں ؟"

"کہتے ہیں" اُس نے کیوں جات باہر شادی کی۔ بیٹا اب یہ تو بڑا شہر ہے، بھیّا۔ یاں تو بھانت بھانت کے لوگ دریاں رہتی ہیں اور ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ہاں تو پتہ نہیں چلتا کون دھوبی ہے۔ کون نائی ہے۔ کون چمار ہے۔ اب ـــــ جسودھا ایک نائی کی بیٹی ہے۔ ہماری تو ناک ہی کٹ گئی۔ جانے کلوا کیا کہے گا ـــــ"

"کلوا کون ہے ؟"

"ارے میرا گھر والا ہے۔ اُس نے تو کلوا کی سگائی اپنے دوست جھگن کی لونڈیا گنتی سے کر دی تھی۔ جب تو دونوں گھٹنوں چلتے تھے جب ان کی سگائی ہوئی تھی۔ کلوا مجھے بہت پیٹتا تھا بیٹا، اس لئے میں اُسے چھوڑ کر یہاں اپنے بیٹے کے پاس آ رہی۔ کلوا تو یہ سُن کے بہت خفا ہوگا۔ وہ وہاں سودھرا میں تاڑی بیچتا ہے میرا کلوا، اور اتنی تاڑی بیچتا نہیں ہے جتنی خود پیتا ہے۔ وہ اس وقت ہوتا تو میری چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دیتا۔ مگر اب میں کیا کروں۔ جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب تو ایک ہی صورت ہے کہ کلوا کے چھوٹے بھائی رامو سے گنتی کی سگائی کر دی جائے۔ میری تو کچھ اور سمجھ میں نہیں آتا۔ کیسے اس معاملے کو پٹاؤں۔ تم ہی بتاؤ بیٹا"

"تو میں کیا لکھوں اس خط میں ؟" اکرم نے پوچھا۔

"بس یہی کچھ لکھ دو جو میں نے بتایا ہے" وہ عورت بڑی معصومیت سے بولی "دو تو حرف ہوں گے کون سی رامائن لکھنی ہے"

خیر اکرم نے اپنی تحریر میں شارٹ ہینڈ اور خورد بین دونوں کے اوصاف ملا کے کسی نہ کسی طرح سے وہ خط لکھا۔ اتنے میں وہ عورت چلّا پڑی۔ بولی "ارے یہ تو میں بھول ہی گئی۔ وہ کلوا سے کہئے بیٹا کہ

چھگن سے کہہ دے کہ لکشمن کے گرو دھرم ناتھ جو پرانی دھرم شالہ کے باہر برگد کے پیڑ کے نیچے سادھی لگاتے ہیں اُن کی جٹا کے دو بال بھیج دے۔"

"کاہے کے لئے؟" اکرم نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم لکھو دونا، تجہیں کیا؟" دھوبن بڑے پُراسرار طریقے سے بولی۔

"میرا بیٹا بھیرو جی سیندہ کر رہا ہے۔"

"کاہے کے لئے؟"

دھوبن نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر وہ جامن کے پیڑ کے نیچے اکرم کے بالکل قریب بیٹھ گئی اور بولی کسی کو بتانا نات۔ میرا بیٹا جب بھیرو جی کو سیندہ کرنے لگا تو آس پاس کی سب لانڈریوں کے کپڑے اس کے پاس دُھلنے کو آویں گے۔"

"ہوں" اکرم نے کہا۔

"ہوں!" دھوبن نے سر ہلا کے کہا "بس بابا دُھرم ناتھ کی جٹا کے دو بال مل جاویں تو سب ٹھیک ہو جاوے گا۔"

"مگر" اکرم نے کہا "اس خط میں تو اب لکھنے کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی" اکرم نے خط اُلٹ پلٹ کے دونوں طرف سے دکھا دیا۔

"یہاں کیوں نہیں لکھ دیتے؟" دھوبن نے ایک خالی جگہ پر اشارہ کیا۔

"یہ پتہ لکھنے کی جگہ ہے۔" اکرم بولا۔

دھوبن بڑی مایوس ہوئی۔ بولی "نئے آئے معلوم ہوتے ہو۔ ورنہ تم سے پہلے اس جامن کے پیڑ کے نیچے جو خط لکھنے والا بیٹھتا تھا اُسے تو میں جو چاہے ہے اور جتنا چاہے بول دوں وہ سب لکھ دیتا تھا۔ تم بہت کھلا کھلا لکھتے ہو۔"

اکرم نے کہا "آئندہ سے احتیاط کروں گا"

دھوبن نے اسے اپنی دھوتی کے پلّو سے ایک آنہ نکال کے دے دیا۔ بولی "میرے حساب سے دو پیسے ہوتے تھے مگر تم اپنے دیس کے معلوم ہوتے ہو اس لئے دیا آنہ۔ رام رام"۔

"رام رام" اکرم نے جواب دیا۔

اکرم نے ڈاکی کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ سامنے ڈاک خانے کے باہر لوہے کا جنگلا تھا جس کے پیچھے دیوار سے لگے ہوئے باغ کے پیڑوں کی ڈالیاں لوہے کے جنگلے پر سایہ کئے ہوئے تھیں۔ جنگلے کے باہر دیوار پر سائے کے نیچے ایک ٹائپسٹ اپنے سر کے اوپر چھتری کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک سٹول پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ سٹول پر اور بھی دو سرے کاغذ تھے۔ پوسٹ کارڈ۔ منی آرڈر فارم۔ رجسٹری کے فارم۔ پارسل کے فارم اور اسی طرح کا ڈاک خانے سے متعلق سامان۔ اکثر و بیشتر ڈاک خانے میں آنے والے لوگ اَن پڑھ ہوتے تھے۔ اس لئے ڈاک خانے کے باہر اسی قسم کے لوگوں کی اشد ضرورت ہوتی تھی۔ اس لئے ان لوگوں کا دھندا اچھا چلتا تھا۔

ڈاک خانہ اب بند ہونے والا تھا۔ ٹائپسٹ کے پاس اس وقت کوئی کام بھی نہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جامن کے پیڑ کے نیچے آیا۔ اکرم کی طرف غور سے دیکھ کر بولا "تم اچھے موقعے پر آئے ہو"۔

"کیا مطلب؟" اکرم نے چونک کر کہا۔

"زیادہ ہوشیار نہ بنو" ٹائپسٹ نے کہا "میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ میں ٹائپسٹ ہوں۔ تم خط لکھنے والے ہو۔ مگر یہ تو تمہیں پتہ ہے کیسے چلاکر رام بھروسے مر گیا اور اب اس کی جگہ خالی ہے"۔

رام بھروسے؟ جگہ خالی؟ میں سمجھا نہیں" اکرم نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

ٹائپسٹ نے ذرا کی ذرا اکرم کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر اُسے یقین ہو گیا کہ اکرم رام بھروسے کو بالکل نہیں جانتا ہے۔ بولا "مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے سمجھا تمہیں کسی نے یہاں بھیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس جامن کے

پیڑ کے نیچے رام بھروسے بیٹھتا تھا۔ وہ کل ہی مر گیا۔"

"کیا ہوا اُسے" اکرم نے پوچھا

"فاقے سے مر گیا۔ اکیلا ہوتا تو فاقے سے کبھی نہ مرتا۔ یہاں خط لکھنے کا جو کام ہے۔ اُس میں آپ ایک بڑے کُنبے کا خرچ نہیں چلا سکتے۔ ایک دو ہوں تو کام چل جاتا ہے۔ رام بھروسے کی بیوی تھی۔ سات بچے تھے۔ فاقے سے تو مرنا ہی تھا اُسے۔ خطوط نویس اتنے پیسے کہاں سے کما سکتا ہے؟ تم اکیلے ہو نا؟"

"ہاں!"

"کہاں ٹھہرے ہو؟"

"ٹھہرنے کا ابھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

"تو چلو میرے ساتھ ہانی کلہ میں۔"

"کہاں؟"

"وہاں جھونپڑیاں ہیں۔ ہم لوگ دس بارہ آدمی ہیں۔ تین جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ سب مل کے خرچ چلاتے ہیں۔ مزے میں رہتے ہیں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"اکرم"

"مسلمان ہو؟"

"ہاں"

"کوئی بات نہیں۔ میرا نام جسونت ہے" ناٹے نے ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اکرم نے مصافحہ کیا۔

جسونت نے کہا "میں گجراتی ہوں۔ مگر ہماری جھونپڑیوں میں ہندو، مسلمان، سکھ، پٹھان

گجراتی۔ مراٹھے۔ پنجابی سب ہی طرح کے لوگ رہتے ہیں" پھر وہ ہنس کر بولا "وہاں جگہ اس قدر تنگ ہوتی ہے۔ روشنی اس قدر کم ہوتی ہے۔ غریبی اس قدر گہری ہوتی ہے کہ چھوت چھات ایک قسم کی عیاشی سی معلوم ہوتی ہے، جب سوتے میں ایک کی ٹانگ دوسرے کے سر پر اور دوسرے کا سر تیسرے کی ٹانگ پر رکھا ہو تو مذہبی اختلافات کو قائم رکھنا ذرا مشکل ہوتا ہے"

اکرم نے پوچھا "تم کمیونسٹ ہو؟"

"ہاں" جسونت نے سر ہلایا اور پھر اس کے قریب آ کے کہا "مگر کسی سے کہنا نہیں بھیا۔ ہم ایسا ہے کہ اپنی روزی کمانے کے لئے ڈاک خانے والوں کی اور پولیس والوں کی دونوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ میں تمہیں سب بتاؤں گا۔ مگر بھائی اگر انہیں یہ پتہ چلے گا کہ میں اس طرح کے خیال رکھتا ہوں تو پولیس والے دوسرے دن ہی ڈنڈا مار کے مجھے اس جنگلے کے اڈے سے نکال دیں گے۔ روزی سے بھی جاؤں گا"

"میں بھلا کیوں کہوں گا" اکرم نے بڑے زور سے سر ہلایا۔

اکرم کو بانی کلہ کی جھونپڑیوں کا اڈہ بہت پسند آیا۔ اس کے مقابلے میں اس کی بہن کا ایک کمرہ تاج محل تھا۔ لیکن یہاں جو چیز بہت عمدہ تھی وہ یہ کہ ان جھونپڑیوں میں رہ کے آدمی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس سے نیچی سطح پر بھی کوئی معاشرت ہو سکتی ہے۔ نہایت تنگ و تاریک جھونپڑیاں۔ تنگ آلودہ ٹین کی دیواریں۔ نہ کوئی روشن دان نہ کوئی کھڑکی۔ ایک تنگ سا دروازہ جس میں سے آدمی سر جھکا کے گزرے گھٹنوں کے بل چل کے گزرے تو اور بھی اچھا ہے۔ قطار اندر قطار جھونپڑیوں کے سلسلوں کے درمیان ایک ٹیڑھی میڑھی کچی گلی جس میں جابجا نیم کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ جن کے گرد مرد عورتیں بچے بوڑھے نوجوان عُریانی کے مختلف مدارج میں بٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ تاش کھیل رہے تھے۔ بنگر زدں

ے کھیل رہے تھے یا دال بگھار رہے تھے۔ شور اور بُو۔ فضا متعفن اور پیاسی۔ پانی کا نل پچاس جھونپڑیوں میں ایک۔ جھونپڑیوں کے اندر فرش کچا اور سیلا ہوا۔ برسات میں ٹین کی چھت نہیں ٹپکتی تھی فرش ٹپکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی فرش کے اندر کہیں اُبل رہا ہے۔ اور کچی مٹی کے نیچے سے زور مار کے اوپر نکل آنا چاہتا تھا۔ اور اکثر اوقات کامیاب ہو جاتا تھا۔ فرش میں اس طرح کیچڑ کے بُلبلے پھوٹتے دکھائی دیتے تھے۔ بار بار مٹی ڈالنے سے بھی فرش کی سیلن نہ جاتی تھی۔ اس تمام تنگ و تاریک، بدبودار فضا میں انسانی سانس اور پسینے کی گھٹی باس چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی جو اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ اس بستی میں خوشبو ایک ایسی عیاشی ہے جو یہاں کے مکینوں کو میسر نہیں! اس لئے ان جھونپڑیوں کے اندر سے جو بدبو ایک دفعہ اٹھتی تھی وہ باہر کہیں نہیں جاتی تھی۔ بیس جھونپڑیوں میں آس پاس اور گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ پکی آبادیوں سے ادھر آتے ہوئے اور اس بستی کے چاروں طرف پکی آبادیاں تھیں۔ ایک طرف بمبئی سنٹرل کا شاندار اسٹیشن اور ریزرو بنک آف انڈیا کے آٹھ منزلہ کوارٹر۔ دوسری طرف بائی کھلہ بازار کے عالی شان سٹور اور دوکانیں۔ تیسری طرف جھیا تاہل کی بلند و بالا عمارت کئی ایکڑوں تک پھیلی ہوئی اور چوتھی طرف امیر و بہرہ لوگوں کی مسلمان بستی اور بیچ میں جھونپڑیوں کا اڈہ۔ گویا ایک طرح سے بالکل شہر کے مرکز میں اُس کے دل میں اک تاریک زخم کی طرح رِستا ہوا۔ اُس تضاد کو ظاہر کرتا ہوا جس میں ایک طرف عمارتیں۔ اونچی سے اونچی ہو کر آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں، تو دوسری طرف اتنی نیچی ہو جاتی ہیں کہ زمین کے سینے سے لگ جاتی ہیں۔ ایک طرف ہوا اتنی لطیف اور ایر کنڈیشنڈ ہوتی ہے کہ سانس میں لپٹیں سی آنے لگتی ہیں اور دوسری طرف اتنی متعفن اور بدبودار کہ ناک کی حس بھی جاتی رہتی ہے۔ ایک طرف نہانے کے تالاب دوسری طرف پیشاب کے جوہڑ۔ ایک طرف دولت کے انبار دوسری طرف گوڑے کے۔ اور یہ تضاد اس قدر واضح اور گھناؤنا تھا کہ بہت سے سیاست دانوں اور شہر کے نیک آدمیوں نے مشورہ دیا تھا کہ ان اڈوں کو جلا دینا چاہئے ــــــــ اور یہ تجویز بڑی معقول تھی۔ سمجھ میں آنے والی تھی۔ یعنی اڈے کو جلا دو

یہ ساری فضا بدبو، تاریکی، سیلن، گھٹن خود بخود فنا ہو جائے گی۔ ایک دفعہ پولیس نے کوشش بھی کی تھی۔ دو ایک بار یہ اڈّے خود بھی جل گئے تھے۔ مُسلسل برساتوں میں سڑتی ہوئی پرانی لکڑی کو خود بخود آگ لگ گئی تھی۔ اور جھونپڑوں میں جب آگ لگ جائے تو کچھ نہیں بچتا۔ جتنے پھٹے پرانے بستر اور چیتھڑے لکڑی کے صندوق ہوتے ہیں وہ جل جاتے ہیں۔ نیم کے درخت بھی محفوظ نہیں رہتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فرش کی مٹی اور ٹین کی چھت تک جل جاتی ہے۔ کچھ نہیں بچتا۔ اور کوئی کچھ اپنی جان بچانے کے سوا کچھ بچانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کیوں کہ کسی کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جو بچایا جائے۔ اوّل تو ایسے موقعوں پر فائر بریگیڈ انجن نہ تو بلایا جاتا ہے۔ نہ خود آتا ہے۔ اگر آ بھی جائے تو آئے آس پاس کی پکّی عمارتوں کو محفوظ کرنے کے کام میں لگا دیا جاتا ہے۔ ٹھیک بھی ہے۔ مناسب بھی ہے۔ رواج بھی ہے۔ دستور بھی ہے۔ مگر ایک بات جوان بستیوں کے جلنے سے سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ اگر فرض کر لیجیے باٹی کمٹا کی بستی جلا دی جائے تو دو تین دنوں میں یہ بستی یہاں سے ہٹ کر اٹلانگا کے قریب نمودار ہو جائے گی۔ اٹلانگا سے جلا دیجیے تو یہ پلٹ کر کولابے میں نمودار ہو جائے گی۔ وہاں سے جلا دیجیے تو ماہم میں نظر آ جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ بمبئی شہر نہ ہوا ایک بہت بڑا جسم ہو جس میں جگہ جگہ پھوڑے پھنسیاں دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ایک جگہ کے پھوڑے کو داغ کر جلا دیجیے پھر پھوڑا کسی دوسری جگہ نمودار ہو جائے گا۔ وہاں سے جلا دیجیے، کسی تیسری جگہ سے رِسنے لگے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصور پھوڑے کا نہیں ہے، اندر کا خون خراب ہے۔ اور جب تک اندر کا خون صاف نہیں ہوگا، گلے سڑے پھوڑے، یہ کالی میلی پھنسیاں اُٹھتی رہیں گی۔

اکرم جب بستی میں داخل ہوا تو اُسے یہ سب باتیں ایک دم دھیان میں نہیں آئی تھیں۔ یہ تو وہاں مسلسل رہنے سے آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں گُھس گئیں۔ لیکن تاریکی اور گھٹن کے احساس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی بات جو اُس نے اُس وقت ملاحظہ کی وہ اُس کی ناک کی تیز حس تھی۔ اُسے

بڑی حیرت ہوئی کہ اس لبتی میں بدبوؤں کا ایسا مختلف النوع سلسلہ تھا جو اس سرے سے اُس سرے تک گندگی کی قوس و قزح کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بدبوئیں کبھی نہ سونگھی تھیں۔ اپنی حس پر اس طرح اس کا درجہ بدرجہ مطالعہ بھی نہ کیا تھا۔ دیواروں اور چھتوں پر کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی یہ بدبوئیں اس قدر صحیح ثابت ہوئی تازی مسلسل اور متواتر ہوتی تھیں کہ گویا وہ انہیں اپنے ہاتھ سے چھو سکتا تھا۔

اُس وقت جھٹپٹا سا ہو رہا تھا جب جسونت اکرم کو لئے لبتی میں داخل ہوا سب سے پہلے جھونپڑے کے باہر ایک کھاٹ پر شہباز خاں پٹھان جو سود پر روپے کا لین دین کرتا تھا بیٹھا ہوا تسبیح پھیر رہا تھا۔ اس نے جسونت کو سلام علیکم کہا اور پھر ایک گہری نگاہ اکرم پر ڈالی جو اجنبی تھا۔ جسونت اکرم کو لئے آگے چلا گیا۔ جہاں ایک نیم کے پیڑ کے ارد گرد مٹی کے ایک اونچے چبوترے پر بہت سی دُھندلی صورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ نیم کے پیڑ سے ایک لالٹین ٹنگی تھی۔ چبوترے پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے جسونت کو ایک اجنبی کے ساتھ آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور اس لئے خاموش ہو گئے۔ اور جب جسونت چبوترے پر آ کے اکرم کے ساتھ بیٹھ گیا تب بھی وہ خاموش رہے اور خاموشی سے اجنبی کو گھورتے رہے۔

من جیت سنگھ ٹیکسی ڈرائیور شہباز خاں پٹھان کے بعد سب میں سے تیز اور تگڑا مانا جاتا تھا۔ اس وقت اس نے پگڑی اُتار کے اندر جھونپڑے میں رکھ دی تھی۔ جُوڑا اچھی طرح سے باندھ کے سر کے اوپر رکھا تھا اور گلے میں ایک میلی سی بنیائن اور کچھا پہنے ہوئے اپنے سانولے اور دُھندلے رنگ میں بڑا بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے اپنی مونچھوں پہ تاؤ دیتے ہوئے جسونت سے پوچھا "یہ کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟"

جسونت نے کہا "یہ اکرم ہے۔ یہاں رہنے کے لئے آیا ہے"

"کیا کرتا ہے یہ؟ پولیس میں تو نوکر نہیں ہے؟ ہم پہلے ہی پولیس والوں کے ہاتھوں سے بہت

وہ ہیں " فضل رام پور یا۔ یا " یہ بھی ٹیکسی ڈرائیور تھا ؟ "

جسونت نے کہا " نہیں۔ یہ بے چارہ تو ڈاک خانے کے باہر خط لکھتا ہے "

" تو ٹھیک ہے " ایک بڑھیا عورت اپنی منجھی ہوئی آواز میں چلائی " اس بستی میں ایک اور پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت بھی تھی "

یہ بوڑھی عورت جمنا تھی۔ اپنے زمانے میں ایک مشہور طوائف تھی۔ اب گوشہ نشینی اختیار کر کے اس بستی میں زندگی کے آخری دن پورے کر رہی تھی۔ اس کی جھونپڑی، جیسا کہ اکرم کو بعد میں معلوم ہوا، بستی میں سب سے عمدہ تھی۔ فرش سیمنٹ کا تھا اور ساری بستی میں اسی ایک جھونپڑی کا فرش سیمنٹ کا تھا مگر جمنا بے حد کنجوس تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے اپنی جھونپڑی میں اپنے اچھے وقتوں کا روپیہ گاڑ رکھا ہے۔ اس لئے فرش پر سیمنٹ کرا رکھا ہے۔ تاکہ کوئی فرش آسانی سے کھود نہ سکے۔

" اس کی ضمانت کون دے گا " پستہ قد دھوے نے کہا جو مراٹھا تھا اور قریب کی چال میں کام کرتا تھا۔

جسونت بولا " میں دیتا ہوں۔ ابھی تو اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم میرے حساب میں لکھ لو آج شام سے تو اس نے کام شروع کیا ہے۔ دس بارہ روز میں دے دے گا " ابھی میرے حساب میں لکھ لو "

ایک موٹی بھاری گرجتی ہوئی آواز نے بلند بانگ لہجہ میں چلا کے کہا۔ اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ جدھر سے آواز آئی تھی۔ اکرم بھی اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک موٹا آدمی چھ فٹ سے اونچا نکلتا ہوا۔ بڑے بڑے گھنگھریلے سیاہ بال ماتھے پر جھکائے ہوئے۔ کمر تک ننگا۔ کمر سے نیچے ایک دھوتی پہنے ہوئے۔ ہاتھ میں پانی کی بالٹی لئے اس کے قریب کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

" ارے تم ستیہ پال رائے ؟ " اکرم اپنی جگہ سے اٹھا۔

ستیہ پال رائے نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ اور پانی کی بالٹی زمین پر رکھ کر اس طرح مخاطب ہوا

جیسے اُس کے سامنے بستی کے دو چار آدمی نہ ہوں۔ دس بارہ ہزار کا مجمع ہو۔ "دوستو! یہ ساعر ہے۔ کوی ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا ساعر ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا کوی ہے۔ یہ فلم ڈائرکٹر بھی ہے۔ آں۔ کیا سمجھے؟ ہندوستان کا سب سے بڑا فلم ڈائرکٹر۔ سب سے سچا۔ سب سے عمدہ۔ سب سے نیک۔ سب سے پیارا۔ غریبوں کی مدد کرنے والا۔ غریبوں کی سچی، صحیح زندگی دکھانے والا فلم ڈائرکٹر۔ آپ کے درمیان کھڑا ہے۔ دوستو! شرم کا مقام ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ دیش۔ یہ ہمارا راجہ رام موہن رائے اور سوامی ویویکانند کا دیش۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کا دیش (اور پھر یہ سوچ کر کہ اکرم مسلمان ہے) یہ ہمارا محمد علی اور شوکت علی کا دیش ہے۔ لعنت ہے ہم پر۔ ایں کہ ہم ایسی ہستی کی قدر نہیں کر سکتے آں؟"

ستیہ رائے نے اس طرح گھور کر نتھنے پھلا کر چہرہ کانوں تک سُرخ کر کے چاروں طرف دیکھا۔ جیسے کسی کو کچا چبا جائے گا۔ اس کے بعد اس نے نگاہ چاروں طرف گھما کر اکرم پر ڈال دی۔ گویا سپرد ڈال دی اور بڑی نرمی سے اس سے مخاطب ہوا "مگر تم فکر نہ کرو۔ میرے بھائی تم یہاں شوق سے رہو جب تک تمہارا جی چاہے۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ ان حرام زادوں کو۔ یہ جو فلم انڈسٹری پر اس وقت قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ اِن سب کو چُن چُن کر باہر نکال دوں گا۔ مگر میرا طریقہ دوسرا ہے۔"

اس کے بعد ستیہ رائے رُک گیا اور اپنا ایک ہاتھ ہوا میں اونچا کر کے بولا "مجھے ——— مجھے وہ کیا سمجھتے ہیں۔ آج میں اس گندی بستی میں ہوں۔ مگر ایک دن دکھا دوں گا کہ میں ستیہ رائے بنگالی پُلس یو پین پُلس کا تیستہ کیا ہوتا ہے۔"

"ارے بھائی" بابو رام کلرک نے جو دھوبے کے ساتھ میں بیٹھا تھا اور دھولے پل میں ہی اکاؤنٹ سیکشن میں کلرک تھا احتجاج کرتے ہوئے کہا "خود کو تو گالی دیتے ہو۔ میں بھی تو کائستھ ہوں۔"

"اوہ! آئی ایم ویری ساری" ستیہ رائے نے بڑی لاپرواہی سے کہا اور پھر اکرم کی طرف متوجہ ہو کے کہنے لگا "دیکھتے جاؤ۔ میری ٹیکنک دوسری ہے۔ میں تو آہستہ آہستہ پتنگ اُڑاتا ہوں۔ پہلے رکھا۔ پھر باندھا۔ پھر تانا۔ پھر کھینچا۔ اور کھینچ کے چھوڑ دیا۔ کہ جاؤ بیٹا لٹکے رہو" یہ اس کی تقریباً آخری تحریر ہوتا تھا جیسے اکرم کو بعد میں پتہ چلا۔ اس وقت تو ستیہ رائے نے اُسے اپنے گلے سے لگایا اور اس کے بعد پانی کی بالٹی اُٹھائے ایک جھونپڑی میں گھس گیا۔

ستیہ رائے سے اکرم کی ملاقات سرسری تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے ستیہ رائے کو سیٹھ باکڑیا کے فلم سٹوڈیو میں دیکھا۔ دو تین بار مختلف فلمی دفتروں میں چکر لگاتے ہوئے۔ اُسے اتنا معلوم تھا کہ ستیہ رائے ایک فلمی دلال ہے جو پروڈیوسروں کی فلمیں بکوانے کا دھندا کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو چرب زبان ہونا ہی چاہیئے ستیہ رائے کی زبان بھی موٹر کے پہیئے کی طرح پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی تھی۔ اس کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ کوئی دوسرا اس کے سامنے زبان کھول نہیں سکتا تھا۔ ستیہ رائے کے جانے کے بعد محفل میں بڑی دیر تک سناٹا رہا۔ خود جسونت کو اکرم نے ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے پہلے کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ اُسے بتائے گا۔ اب اِس وقت جو اس نے دیکھا تو سب لوگ اسے ایک نئی ہمدردی کی نگاہ سے تک رہے تھے۔ اور وہ بہت پریشان ہوا۔ وہ کسی کی ہمدردی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ان میں اُن جیسا ہو کے رہنا چاہتا تھا۔

فضل خاموشی سے سر جھکائے حقہ پیتا رہا تھوڑی دیر کے بعد اس نے جسونت سے کہا "اسے میری جھونپڑی میں سونے دو وہاں جگہ زیادہ ہے۔"

"بہت اچھا" جسونت بولا۔

اور اس نے دیکھا کہ جسونت اس کے ہاں کرنے سے بہت خوش ہوا من جیت سنگھ نے قریب آکے اکرم کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مار کے کہا "واگُورو سب ٹھیک کر دیں گے۔ تو بالکل نہ گھبرا۔ میں تجھے

اپنے چھوٹے بھائی کرتار سے ملاؤں گا۔ کرتار میرا چھوٹا بھائی ہے"۔ اور جب من جیت یہ کہہ رہا تھا۔ اکرم نے محسوس کیا کہ چھوٹے بھائی کے ذکر سے من جیت کی آواز میں غرور سا آچلا تھا "کرتار یہاں میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے۔ دو سال میں ڈاکٹر بن جائے گا۔ بڑا ڈاکٹر! میرا کرتار۔ میرا چھوٹا بھائی۔ میں اُسے کبھی یہاں آنے نہیں دیتا۔ اتوار کو اُس سے ملنے کے لئے ہوسٹل میں جاتا ہوں۔ اگلے اتوار کو تمہیں لے چلوں گا" جیسے من جیت کہہ رہا ہو فکر نہ کر تو بھی میرا چھوٹا بھائی ہے'۔

من جیت ٹیکسی ڈرائیور تھا اور خود اس گندی بستی میں رہتا تھا۔ مگر اس کی ساری کمائی اپنے چھوٹے بھائی کرتار کو پڑھانے میں صرف ہوتی تھی۔ اپنے اوپر وہ بہت کم صرف کرتا تھا۔ اکثر کہا کرتا۔ میرا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بیوی بچے تو سب مر چکے ہیں اور اب صرف یہی ایک چھوٹا بھائی بچا ہے۔ گھر کا چراغ۔ یہ ڈاکٹر بن جائے تو سمجھوں گا میں نے کچھ کیا۔ واہ گرو کی کرپا سے اب دو سال رہ گئے ہیں۔ جیسے من جیت کہہ رہا ہو۔ میں آن پڑھ ہوں۔ جاہل ہوں۔ غیر تہذیب یافتہ ہوں۔ تمہاری محبت کے لائق نہیں ہوں۔ مگر میرا ایک بھائی ہے۔ میں نے اُسے پڑھایا ہے۔ اُسے ہوسٹل میں رکھا ہے۔ وہ ڈاکٹر ہونے والا ہے۔ وہ تمہاری محبت کے لائق ہے۔ میں تمہیں اس سے ملا دوں گا۔

اکرم کا جی بھر آیا اس نے من جیت کو زور سے گلے سے لگا کے کہا "نہیں بھیا من جیت میں تم سے بھی مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں مدت کے بعد اپنوں میں آیا ہوں"

رات تاریک اور بدبودار تھی۔ فرش پر کیڑے، جوئیں، روچ اور کھٹمل رینگتے تھے۔ فضا میں مچھر بھنبھناتے تھے۔ پھر بھی جھونپڑوں کے اندر اور جھونپڑوں کے باہر گلی میں اور نیم کے چبوترے کے فرش پر انسانی جسم نیند میں مدہوش پڑے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب قریب لکڑی کے شہتیروں کی طرح نیم کے پیڑ کے اوپر لالٹین دھیمی دھیمی جل رہی تھی۔ سب سو رہے تھے مگر اکرم جاگ رہا تھا۔ اور جمنا بڑھیا اپنے

جھونپڑے کے دروازے میں اُکڑوں بیٹھی ہوئی جاگ رہی تھی۔

" اماں تم سوئی کیوں نہیں ہو؟ " اکرم نے آہستہ سے پوچھا " کس کا انتظار ہے ؟ "

بُڑھی ہنسی۔ اس کی ہنسی تلخ اور زہر آلود تھی۔ پھر جمنا نے آہستہ سے کہا " بیٹا ایک طوائف چمگادڑ کی طرح ہوتی ہے۔ وہ دن کو سوتی ہے۔ رات کو جاگتی ہے۔ بیس برس تک رات کو مسلسل جاگنے سے اب نیند آنکھوں سے اُڑ گئی ہے۔ اب مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ زندگی کے دن پورے ہونے کو آئے۔ پھر بھی اب عادت بن چکی ہے۔ میں رات کو جاگتی ہوں۔ دن کو سوتی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں دن کیسا ہوتا ہے۔ بھور کیسی ہوتی ہے۔ سورج کدھر سے نکلتا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو بیٹا۔ سو جاؤ۔ آرام سے سو جاؤ "

اکرم کو اپنا حلق کھنچتا ہوا، اندر کو سکڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جیسے حلق میں کوئی چیز پھنس رہی ہو۔ اُس نے آہستہ سے اپنا مونھ موڑ لیا اور کروٹ بدل کے چبوترے پر دراز ہو گیا۔ پھر بھی سونے سے پہلے اس کے ذہن میں جو تصویر تھی۔ وہ ایک بڑھی عورت کی تھی۔ جس کے پپوٹوں پر پلکیں نہیں تھیں اور جو آنکھیں جھکائے بغیر ایک دروازے میں اُکڑوں بیٹھی اندھیرے میں دیکھ رہی تھی۔ اندھیرا اُس کے آگے تھا، اندھیرا اس کے پیچھے تھا۔ اندھیرا اُس کے اوپر تھا۔ اندھیرا اس کے نیچے تھا۔ اندھیرا ——— اندھیرا ——— اندھیرا . . . . اندھیرا جو اُس کا آخری گاہک تھا!

دن اور راتیں ہفتوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ فلمی صنعت کا بحران کم نہ ہوا، بڑھتا ہی گیا۔ اکرم کی خطوط نویسی کا بہت سے لوگوں نے مذاق اُڑایا تھا۔ یہاں تک کہ ایکسٹرا بھائی لوگوں کے لئے بھی وہ ہنسی مذاق کا موضوع بن گیا تھا۔ شروع شروع میں اکرم کے اس کام کے شروع کرنے کا چرچا بھی ہوا تھا۔ ایوننگ ویوز نے اس کی تصویر بھی چھاپی تھی۔ اس سے پہلے بھی یہ اخبار ایک بی اے پاس پالش کرنے والے کی تصویر چھاپ چکا تھا۔ مگر کسی ہمدردی کی نگاہ سے نہیں، صرف سنسنی پھیلانے کے نکتہ نگاہ سے، مگر اس بات کو بھی اب چھ ماہ سے اوپر ہو گئے تھے۔ فلمی لوگ اکرم کو بھول گئے تھے ان کے لئے اپنی ہی پریشانیاں کیا کم تھیں۔ اُجرتیں کم ہو رہی تھیں۔ مختلف سٹوڈیو میں لائٹ مینوں نے اپنی یونین بنالی تھی۔ کئی بار سٹوڈیو میں ہڑتالیں ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بہت سی آدھی چوتھائی تیار تصویریں ڈبوں میں بند پڑی تھیں۔ نئی تصویریں بہت کم شروع ہو رہی تھیں۔ مہورت بہت کم ہوتے تھے۔ بہتیروں کو کئی کئی وقت فاقے لگ رہے تھے۔ دادر مین روڈ پر اک دھواں دھواں سی کیفیت کا منظر تھا۔ کبھی ایسا ستا تھا جیسے سب اونگھ رہے ہوں۔ کبھی یک لخت ایسی لڑائی کہ آن کی آن میں سر کھل جاتے۔ ایکسٹرا لوگوں کو۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹروں کو بلکہ کئی سفید پوش ڈائریکٹروں کو فاقے لگ رہے تھے۔ جسم پر دُھلا ہوا کپڑا پہنا اور چہرے پر ڈھلی ہوئی مسکراہٹ

کو قائم رکھنا بڑا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

بھٹاچاریہ نے پہلے پہل اکرم کا بہت مذاق اُڑایا تھا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے اسے اس کام کو چھوڑ کر پھر سے فلموں میں آنے کو کہا تھا۔ یہاں تک کہا تھا کہ اس کے اس حقیر کام کرنے سے فلم والوں کی تحقیر ہوتی ہے مگر اکرم نہیں مانا۔ اب وہی بھٹاچاریہ تھا کہ اکرم کی دانش مندی کو سراہ رہا تھا۔

"صبح سے رات کے بارہ بجے تک کام کرتا ہوں۔ پھر بھی کوئی پیسہ نہیں دیتا۔ تین پکچروں میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوں۔ ایک پکچر کے پورے پیسے نہیں ملتے۔ سیٹھ باکڑیا نے سٹے میں بیس لاکھ ہار دئے ہیں۔ ہوتے ہیں حالت پتلی ہے ذرا صبر کرو۔ ارے جب حالت موٹی تھی جب تم نے کون سی تھیلیاں کھول دی تھیں۔"

اکرم خاموش رہا

"تم بہت اچھے رہے" بھٹا نے کہا "دن میں کتنا کما لیتے ہو؟"

"وہ ڈھائی روپے۔ کسی دن تین بھی ہو جاتے ہیں"

"یہاں تین بھی نہیں ملتے" بھٹا نے اکرم کی طرف رشک سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں یہ لفافہ ڈال آؤں۔ بھائی سے سو روپیہ منگایا ہے" بھٹا نے لفافہ اکرم کے سامنے لہرایا اور پھر ڈاک خانے کے اندر گھس گیا۔

ایک دن اکرم نے کسی صاحب کو ڈاک خانے میں گھستے ہوئے دیکھا۔ جانا پہچانا انداز معلوم ہوا مگر چونکہ اس آدمی کی پشت اکرم کی طرف تھی اور اکرم اس وقت ایک خط لکھنے میں مصروف تھا۔ اس لئے اس نے زیادہ توجہ نہ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ آدمی ڈاک خانے کے باہر نکلا تو اکرم نے جھٹ پہچان لیا مرزا راحت حسین تھے۔ مگر کس قدر گویا پچک سے گئے تھے۔ ان کے سرخ و سفید گال اندر کو دھنس گئے تھے اور وہ فراخ صبیح رنگ

ما تھا دُھواں دُھواں سا ہو رہا تھا۔

"ارے مرزا جی ؟" اکرم کے مونہہ سے بے اختیار نکلا۔

مرزا جی نے بھی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھا۔ حیرت دونوں کو، ایک دوسرے کو اس حالت میں پا کر ہو رہی تھی۔ مگر اکرم اپنی حالت پر زیادہ مطمئن نظر آتا تھا۔ مرزا جی نے اپنی آنکھیں پٹپٹائیں۔ گھبرا کے بولے "اماں تم یہاں کیا کرتے ہو ؟"

"خطوط نویسی کرتا ہوں"

مرزا جی خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے "دیکھا۔ اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں کو بھی یہاں کام نہیں ملتا۔ میں تو پاکستان جا رہا ہوں"

"کیوں ؟"

"کیا کروں۔ یہاں ایک سال سے بے کار بیٹھا ہوں۔ اب تو فاقوں کی نوبت آنے لگی"

"پاکستان میں کیا فاقے نہیں ہوں گے۔ وہاں کیا بے کاری، غریبی، جہالت اور اس قسم کے مسائل نہ ہوں گے۔ یہ بیماری ہر جگہ ہے مرزا جی"

مرزا جی اپنے شانے ہلاتے ہوئے بولے "کراچی میں میرا ہم زلف ہے۔ وہ ایک اونچے سرکاری عہدے پر فائز ہے۔ اس نے مجھے لکھا ہے کہ اگر میں پاکستان آجاؤں تو وہ مجھے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں چھ سو کی پوسٹ دلا دے گا ٹھیک ہے !"

"مگر تمہارا ملک تو یہ تھا۔ تمہیں لکھنؤ اس قدر پسند تھا۔ مرزا جی سال میں دو مرتبہ تم اپنے وطن جاتے تھے لکھنؤ کے پان۔ اُس کا کچھر۔ اس کا مخصوص لب و لہجہ۔ وہ گُھلا ملا تمدّن زمین کی سی سوندھی سوندھی خوشبو تھے۔۔۔!"

مرزا جی نے اپنی نظریں اکرم سے پھیر لیں۔ آہستہ سے بولے "میں نے سب منظور کر لیا ہے"

اور اکرم نے مرزا جی کے گورے چہرے، ان کے شفاف چکن کے کرتے اور سفید پاجامے کی طرف

دیکھ کر سو جاؤ۔ اے کسی وسیع منجمد خلاء میں رہنے والے خوب صورت لوگو! اب تمہارے لئے کوئی ابتدا نہیں ہے اور کوئی انتہا نہیں ہے۔ کوئی جزا نہیں ہے اور کوئی سزا نہیں ہے۔ کیوں کہ تم نے اپنے لئے سب کچھ منظور کر لیا ہے۔ تمہیں لکھنؤ کے بجائے کراچی ملا یا لاہور کے بجائے جالندھر ملا اور تم نے اسے منظور کر لیا۔ امجد کے بجائے تمہیں عشرت ملا اور تم نے اُسے منظور کر لیا۔ ایک دن تمہیں زندگی کے بجائے پستول کی گولی ملے گی اور تم اسے بھی منظور کر لو گے۔ کیوں کہ تمہاری روح کا طوفان مر چکا ہے۔ اور تمہارے ساحل کا سیلاب اُتر چکا ہے۔ اور تمہاری کاوش نے تھکن کا گھنیرا سایہ دیکھ لیا ہے۔ اس لئے اب تمہارے لئے کوئی پتہ نہیں کھڑکھڑائے گا۔ اور کوئی شاخ نہیں لرزے گی۔ اور کوئی بہار تمہارے دروازے پر دستک دینے کے لئے نہیں آئے گی۔ اور تم اپنے برف پوش سمن زاروں میں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے مر جاؤ گے۔ اے مرے خالی خولی خوبصورت ننگے لوگو!

مرزاجی نے اُس سے کہا "تم یہاں اپنی زندگی برباد کیوں کر رہے ہو۔ پاکستان چلے جاؤ۔ پڑھے لکھے مسلمان کے لئے اب بھی وہاں بہت قدر ہے"

"اگر سب ہی پڑھے لکھے مسلمان چلتے بنے تو ان پڑھ مسلمانوں کا یہاں کیا ہوگا"

اکرم کی آنکھیں غصے سے چمک رہی تھیں۔ اس نے ذرا بلند لہجے میں کہا "تم بھولتے ہو مرزاجی۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ بے کاری، مفلسی، ناداری مسلمانوں ہی میں نہیں ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، جینیوں اور پارسیوں میں بھی ہے۔ غریبی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم مسلمانوں ہی کی بات کرتے ہو تو یہ بھی سُن لو کہ اس ملک میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ کوئی اور ملک اتنا بڑا نہیں ہے کہ انہیں سہارا دے سکے۔ یہی ان کا ملک ہے۔ یہی ان کا وطن ہے۔ اسی وطن سے وہ پیار کرتے رہے۔ اس کی مٹی کے گیت گاتے رہے۔ اسی کے سماج کا ایک ضروری قیمتی اور بہترین حصہ بن کر ان کے آگے بڑھنا ہوگا۔ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ میرے دماغ میں یہ بات بالکل واضح اور صاف صاف ہے"

مرزاجی ایک تلخ ہنسی ہنسے۔ بڑی احتیاط سے انہوں نے اپنے جیبی پاندان میں سے ایک پان

نکلا۔ اسے گلے میں دبایا۔ اور بغیر کسی سلام کے اکرم سے مونہہ پھیر کے چلے گئے۔ جیسے انہوں نے کسی مسلمان نہیں کسی کافر کا چہرہ دیکھ لیا ہو اکرم ویرنک مزاجی کی غائب ہوتی ہوئی پشت کی طرف دیکھتا رہا۔ یکایک اس کے کانوں میں آواز آئی "سلام . . . . اے!" اور وہ چونک کے مُڑا اُس کے سامنے ولایت بیگم کھڑی تھی۔ مگر وہ موہنی وہ ادا، وہ مجروح معصومیت اب جانے کدھر غائب ہو گئی تھی۔ ولایت بیگم نے اپنے خوب صورت ابرو استرے سے صاف کروا ڈالے تھے۔ اور پنسل سے نقلی ابرو کمان کی طرح خمیدہ بنائے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے جنہیں چھپانے کے لئے اس نے اپنے رخساروں پر رنگ و روغن ضرورت سے زیادہ تھوپا تھا۔ ہونٹوں پر لپ سٹک اس قدر زیادہ تھی کہ دونوں ہونٹ پھٹے ہوئے زخم معلوم ہوتے تھے۔ اس قدر شوخ لہو کا سا رنگ تمہارہ! ولایت بیگم نے ہنس کے کہا "مجھے رضیہ نے بتایا کہ اب تم یہاں بیٹھتے ہو"

"کون رضیہ؟"

"ارے رضیہ کو تم نہیں جانتے ہو۔ کمال ہے۔ ارے وہ ناچتی ہے اپنے ساتھ جسم بہت اچھا ہے اس کا۔ وہ تو تمہاری اتنی تعریف کرتی ہے کہ میں بھی وہ تم پر عاشق ہے اور تم ضرور اسے جانتے ہو گے"

اکرم کو یاد آیا۔ اس نے سر ہلا کے کہا "ہاں اُسے دو تین بار دیکھا ضرور ہے۔ مگر ملا آج تک نہیں ———"

ولایت بیگم ہنسی بولی "کسی دن ملا دوں گی۔ اس وقت ایک منی آرڈر لکھ دو"

"کتنے کا ہے؟"

"پچھتر روپے کا"

"کسے بھیجو گی؟"

"ارے میری طرف سے مت بھیجئے۔ ورنہ کمال کا غضب ہو جائے گا۔ عشرت کے نام سے بھیجو"

اب اکرم چونکا "کون عشرت؟"

"ارے وہی عشرت جو کبھی راج کے پاس تھا۔ راج نے اُسے نکال دیا۔ اس بے چارہ کی بہت بُری حالت ہے"

"مگر عشرت کا تم سے کیا تعلق؟"

ولایت بیگم نے آہستہ سے کہا "وہ اب میرے پاس ہے۔ گو گھر والے مجھ سے بہت خفا ہیں۔ مگر مجھے بڑا ترس آیا اُس پر۔ میں نے کہا۔ جہاں اتنے لوگوں کو پالتی ہوں وہاں ایک اور سہی۔ لو، منی آرڈر جلدی سے لکھ دو"

"کس پتے پر جائے گا؟"

"رئیس گنج جائے گا۔ حسین پورہ محلے کا نام ہے۔ اور آمنہ بیگم اس کی ماں کا نام ہے۔ اس کی ماں بہت بیمار ہے۔ اس نے پیسے مانگے تھے۔ عشرت کے پاس کہاں سے ہوں گے۔ اس لئے بھیج رہی ہوں۔ میرا پتہ نہ لکھنا"

"تو کس کا پتہ لکھوں؟"

"عشرت کا لکھو۔ اور ——— اور ——— ولایت بیگم نے یکایک سوچ کے کہا۔ نیچے اپنا پتہ دے دو۔ جب رسید آئے گی میں تم سے آکے لے جاؤں گی۔ ٹھیک ہے؟"

"بہت اچھا!"

"تم بہت اچھے ہو" ولایت بیگم نے اکرم سے کہا "اس دن جو جو پر جب تم نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں نے اپنے دل میں کہہ دیا تھا کہ اس بے چارے کا بُرا حشر ہوگا۔ سو دیکھ رہی ہوں"

"کیوں؟"

"یہ دنیا شریفوں کی نہیں ہے"

"نہیں ولایت بیگم۔ یہ دنیا شریفوں ہی کی ہے" اکرم نے اس سے کہا۔

"نہیں ـــــــ" ولایت بیگم بڑی سختی سے بولی "یہ دنیا شریفوں کی نہیں ہے"

اکرم چپ ہو رہا۔ منی آرڈر لکھوا کے ولایت بیگم نے اسے ایک روپیہ دیا۔ اکرم نے انکار کر دیا۔

"لے لو" ولایت بیگم نے کہا "حرام کی کمائی ہے۔ ایک روپیہ تم لے گئے تو کون سا غضب ہو جائے گا"

"ایسا کیوں کرتی ہو ولایت!" اکرم نے بڑی افسردگی سے کہا "ایسا کیوں کرتی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اپنے آپ کو تباہ کر دینا"

ولایت کی ساری شوخی ایک دم ختم ہو گئی۔ جیسے اس کے چہرے سے تاریکی کا سایہ سا گھوم گیا۔ وہ یکایک کھانسنے لگی۔ اس کی آنکھیں اُبل آئیں۔ اُس کے حلق سے تھوک کے ساتھ خون کی ایک لکیری باہر فرش پر دوڑ گئی۔

اکرم کانپ گیا۔ "تم اپنا علاج کراؤ۔ تم یہ باتیں چھوڑ دو۔ کسی ماں باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ تم کسی ہسپتال میں داخل ہو جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ چل کے تمہیں داخل کرا دوں گا"

ولایت اس کے ہاتھ کا سہارا لے کے اٹھی۔ بولی "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب مجھ میں کچھ نہیں رہا۔ اب سب ختم ہے"

اور وہ چلی گئی۔ اکرم دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ ایک عجیب بے ہنگم چال سے چل رہی تھی۔ داہنا پاؤں کہیں اور بایاں پاؤں کہیں۔ اور داہنا کولہا کہیں اور بایاں کولہا کہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک عورت نہیں، دو عورتیں بیچ میں سے شق ہو کے الگ الگ ٹانگ۔ اور کولہے کے سہارے دو مختلف سمتوں میں گھسٹ رہی ہیں۔ اکرم نے مونہہ پھیر لیا۔ بہت مشکل ہے۔ چیزوں کو دیکھنا۔ سمجھنا اور سمجھ کر خاموش ہو جانا۔ اپنے دل و دماغ کو اس قدر خالی کر دینا کہ وہاں کوئی سوچ باقی نہ رہ جائے۔ ہمارے ملک میں کتنی ہی عورتیں۔ آدھی عورتیں ہیں۔ آدھی سے بھی کم ایک تہائی۔ ایک چوتھائی۔ عورتیں۔ ایسی عورتیں جن کے اندر کوئی عورت نہیں

ہے۔ جن کے صرف اعضا عورتوں کے سے ہیں لیکن جن کے اندر کوئی عورت باقی رہنے نہیں دی گئی۔ کوئی ماں، کوئی بہن، کوئی بیوی، کوئی محبوبہ ـــــــ عورتیں جنہیں صرف تاجر بنا دیا گیا ہے۔ صرف دوکان دار۔ صرف منافع خور۔ جن کے اندر سے دل بھی نکال لیا گیا ہے اور وہاں محض ایک چاندی کا سکہ رکھ دیا گیا ہے۔

بہت مشکل ہے اس ظلم کو دیکھنا اور خاموش رہ جانا! اکرم نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑ لیا۔ کہیں پر کوئی راستہ ہے۔ ضرور کہیں پر کوئی راستہ ہے۔ اگر اس نے جلد یا بدیر اسے تلاش نہ کیا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔

اُس روز بارش برس کے تھم گئی تھی۔ شام کا وقت تھا اور بستی کے اوپر آسمان میں شفق گلنار بادلوں کی جھالریں سجائے کھڑی تھی۔ بستی کے آس پاس اور بستی کی گلی میں چھوٹے چھوٹے جوہڑوں میں پانی بھر گیا تھا۔ اور اس وقت شفق کے عکس سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پانی کی سطح پر ہزاروں گلاب تیر رہے ہیں آسمان کے اس چھوٹے سے کونے میں اس وقت اتنا حُسن تھا کہ اوپر دیکھتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی۔

مگر بستی کے لوگ اوپر نہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک عرصہ ہوا وہ آسمان کو بھلا چکے تھے اس وقت نیم کے پیڑ کے نیچے بڑے زور شور سے بحث جاری تھی دھوبے جو عموماً خاموش رہتا تھا۔ اس وقت بہت ہی بے چین اور مضطرب انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا "سیٹھ نے مجھے بلایا۔ کاغذ کا پرزہ جو میں نے بوائلر مین کو دیا تھا۔ اور بوائلر مین نے انجینئر کو دیا تھا۔ وہ اس وقت اس کے سامنے تھا۔ وہ بہت بے چین اور پریشان نظر آتا تھا۔ مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر کہنے لگا۔ "کب سے تم ہماری مل میں کام کرتے ہو؟"

"دس سال سے"

"اس کاغذ پر تم دستخط کرا رہے تھے؟"

"ہاں"

"تم جانتے ہو اِس کاغذ پر کیا لکھا ہے"

"جی۔ لکھا ہے کہ دنیا میں جنگ بند ہونی چاہیئے"

سیٹھ نے کاغذ دوہرا کیا۔ تہرا کیا۔ چوہرا کیا۔ اس نے اُسے پھر آہستہ سے کھولا اور اتنے عرصے تک وہ بالکل خاموش رہا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا۔

"کیا تم بھی شانتی سبھا کے ممبر ہو؟"

"ممبر تو نہیں ہوں۔ والنٹیر ضرور ہوں"

"دنیا میں امن ہو یا جنگ ہو، تمہیں اس سے کیا۔ تم مزے سے اپنا کپڑا بُنتے جاؤ"

میں نے سیٹھ کو ہیروشیما کے بارے میں بتایا۔ اُس نے میری آدھی بات سُن کر ہی کہا۔

"سیاست؟ سیاست۔ تم مزدور لوگ اگر سیاست کم کرو اور کام زیادہ کرو تو دنیا میں کسی قسم کی تکلیف باقی نہ رہے۔"

میں نے کہا "میرے پچھلے دس سال کا ریکارڈ دیکھ لو۔ کیسا کام میں نے کیا ہے"

سیٹھ بولا "اسی لئے تو تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اُسے فوراً نکال دیتا۔" اتنا کہہ کر اُس نے مجھے غور سے دیکھا، بلکہ گھورا۔ جیسے پولیس والے کسی ملزم کو گھورتے ہیں۔ سیٹھ ہنسا۔ بولا "تم بہت چالاک ہو۔ اچھا جاؤ۔ اب کی تمہیں معاف کر دیتا ہوں۔ مگر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا" اس کے بعد اس نے وہ دستخطوں والا کاغذ لے کے پھاڑ دیا اور مجھے اشارے سے کہا کہ اب مجھے چھٹی ہے۔

"پھر" جسونت نے اپنی ناک انگلی سے دو تین بار موڑتے ہوئے پوچھا "تم نے دستخط نہیں کروائے؟"

دھوبے بولا "ایسا بھی کیا؟ مگر میں اب محتاط ہو گیا۔ میں نے جا کے اپنے مزدور بھائیوں سے

کہا کہ سیٹھ کیا کہتا تھا۔ کئی مزدور بھائی جو اس سے پہلے شانتی سبھا کی اپیل پر دستخط نہ کرتے تھے انہوں نے فوراً دستخط کر دئے "

"کیوں"

وہ بولے "سیٹھ اگر اس اپیل کی مخالفت کرتا ہے تو اس میں ضرور کوئی اچھی چیز ہوگی"

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ من جیت سنگھ اور فضل خوب زور سے ہنسے۔ اکرم جواب تک اس کو کچھ بدھو سمجھتا تھا، مسکرا کر اس کو نئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھوے نے اپنی نیکر کی جیب سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا۔ کہنے لگا "پہلا کاغذ جو سیٹھ نے پھاڑ دیا اُس پر بڑی مشکل سے دو سو دستخط ہوئے ہوں گے۔ سیٹھ کے منع کرنے کے بعد آٹھ سو لوگوں نے اس پر دستخط کر دئے۔ تم نے اگر اس وقت ان لوگوں کے چہرے دیکھے ہوتے!" دھوے یکایک خاموش ہو گیا۔ اس نے دستخطوں والے کاغذوں کا پلندہ جسونت کے ہاتھوں میں دے دیا۔

جسنا بولی "اس جنگ کی تو میں بات نہیں کرتی لیکن پچھلی جنگ میں مجھے یاد ہے سپاہی مجھے مونہہ مانگے دام دے جاتے تھے"

من جیت نے کہا "اور اس کے بعد وہ خندق پر جا کے گولی کھا کے مر جاتے تھے۔ اسی طرح میرا چچا مرا تھا۔ مجھے یاد ہے ہمارے گاؤں میں دیوالی کا میلہ تھا۔ اُس روز ہم لوگوں نے نئے کپڑے پہنے تھے ہمارے دونوں ہاتھ مٹھائیوں سے بھرے ہوئے تھے اور جیبوں میں آتش بازی کا سامان تھا جو ہم پہلے سے خرید کے لے جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک ڈاکیہ میرے والد کو ڈھونڈتا ہوا آیا۔ اور وہ تار پڑھ کے میرے والد دہاڑیں مار کے رونے لگے۔ پڑھے" وہ چُپ ہو گیا۔ پھر من جیت نے سر ہلا کے کہا "یقیناً زندگی بہت اچھی چیز ہے۔ مجھے اپنا چچا ابھی تک یاد ہے۔ لام پر جانے سے پہلے وہ کس قدر خوب صورت اور تندرست دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی داڑھی سُرخ تھی، اور سُرخ اس کے بال تھے، اور سُرخ اس کے

محال تھے۔ اور وہ ایک بیوہ اور ایک بچی چھوڑ کر مر گیا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتا تو شاید میں اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتا" من جیت نے افسردگی سے سر ہلایا۔

فضل نے کہا "پچھلی جنگ کی بات تو میں نہیں کرتا لیکن اِس جنگ کے دنوں میں پسینجر بہت ملتے تھے۔ میری ٹیکسی صبح سے شام تک چلتی تھی۔ ان سے زیادہ رات میں کماتا تھا۔ کوئی دن ہی ایسا ہوتا ہوگا جس دن ساٹھ ستر روپے نہ کما لیتا ہوں گا۔ اب ؟ مشکل سے بائیس تیئیس روپے ہوتے ہیں۔"

جسونت نے کہا "جنگ میں راشن کتنا ملتا تھا۔ ستر روپوں میں تم خرید کیا سکتے تھے۔ بنگال میں جنگ کے دنوں میں کیا ہوا۔ تیس لاکھ آدمی فاقے سے کیوں مر گئے کیوں کہ سارا اناج محاذِ جنگ پر جا رہا تھا اس لئے تمہیں اور مجھے فاقے کرنے پڑے۔ صرف روپوں پر کوئی نہیں جی سکتا ہے اور آدمی کی زندگی ایک ٹیکسی کی کمائی سے ہزار درجے بہتر ہے۔ مانتے ہو کہ نہیں"

فضل نے اثبات میں سر ہلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد رُک کے بولا "ایک اپیل مجھے بھی دے دو میں ٹیکسی ڈرائیور یونین کے سامنے اُسے رکھوں گا"

جسونت نے اپیل کا ایک چھپا ہوا کاغذ اُسے دیا۔ پھر اس نے اکرم سے مڑ کے کہا "تم فلم انڈسٹری میں اتنے بڑے بڑے نامور اداکاروں، ہدایت کاروں، تقسیم کاروں کو جانتے ہو۔ اگر تم ان لوگوں سے دستخط کرا سکو تو ہمارے کام کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے"

اکرم نے کاغذ ہاتھ میں لے کے کہا "مگر اس میں ہے کیا۔ میں تو سمجھتا ہی نہیں۔ کون ایسا آدمی ہوگا جو اپنے ہوش و حواس میں ہو اور اس اپیل پر دستخط نہ کر دے"

جسونت نے کہا "یہ چیز اس قدر آسان نہیں ہے۔ تم چھابڑی کے سیٹھ کی باتیں تو سن چکے ہو"

"وہ سیٹھ تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ساری دنیا تھوڑی پاگل ہے" اکرم نے ہنس کے کہا۔

"دنیا میں کئی خطرناک پاگل موجود ہیں، جو پاگل خانے میں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ اونچے اونچے عہدوں پر دندناتے ہیں اور دن رات جنگ جنگ چلاتے ہیں"

"ہوں گے! دوسرے ملکوں میں ہوں گے" اکرم نے ذرا بلند لہجے میں کہا "مگر ہمارے ملک میں نہیں ہیں۔ خود ہمارے پردھان منتری کی پالیسی ہی ہے کہ دنیا میں کہیں جنگ نہ ہو"

"اس میں کوئی شک نہیں" جسونت بولا "پنڈت نہرو کی مخلصانہ کوششوں نے امن کی کاوش میں ہندوستان کو ایک تاریخی مقام بخشا ہے۔ مگر بدقسمتی سے خود ہمارے ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو طرح طرح سے پنڈت نہرو کی صلح جوئی کی پالیسی کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا مونہہ بند کرنا ضروری ہے۔ اور پنڈت نہرو کی امن پسند پالیسی کو آگے بڑھانے کے لئے عوام کا تعاون دینا بھی بہت ضروری ہے"

دھوبے نے بابورام کی طرف مسکرا کے کہا "اپنے بابورام نے اپیل پر دستخط نہیں کئے"

"کیوں بابورام؟" جسونت نے پوچھا۔

اب ہر شخص بابورام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بابورام کے لئے ان کی نگاہوں سے بچنا بے حد مشکل ہوگیا پہلے تو اس نے اپنے ہاتھ اپنی پیٹھ کی طرف کرلئے گویا وہ خود نہیں اس کے ہاتھ مجرم تھے۔ جنہوں نے اس اپیل پر دستخط نہیں کئے تھے۔ پھر اس نے دایاں پاؤں اٹھا کے بائیں پاؤں پر رکھا اور جب اس سے بھی کام نہ بنا تو یکایک غصے میں بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا کامونسٹ کمرک کو جنگ یا امن کے سوال سے کیا تعلق ہے میرے لئے آنا جانا ہی کافی ہے کہ دو اور دو چار روپے ہوتے ہیں"

دھوبے نے کہا "کبھی کبھی دو اور دو چار سپاہی بھی ہوتے ہیں" من جیت سنگھ نے بابورام کے لہجے میں بالکل اس کی نقل کرتے اس طرح کہا کہ سب کو ہنسی آگئی۔

جسونت بولا "اور دو اور دو چار بم بھی ہوتے ہیں۔ اور اگر ان چار بموں میں سے ایک بم ایٹم بم یا

ہائیڈروجن بم کا ہوا تو تم اور تمہارا یہ کارخانہ اور یہ خوبصورت شہر بمبئی ایک لمحہ میں فنا ہو جائے گا۔"

بابورام نے غصے سے کہا "ہو جائے مجھے کیا۔ میں تو اس گلی سڑی بدبودار بستی میں ——"

مگر وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں بے اختیار گلی کے سرے پر گھوم گئیں اور اس نے زور سے سانس اندر کھینچی کہ چبوترے پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی اسی طرف دیکھنے لگے جدھر بابورام دیکھ رہا تھا۔

گلی کے سرے پرسے دو لڑکیاں چلی آرہی تھیں۔ ...ان، متبسم، سبک خرام، شفق کے لال بادلوں کے پرے کے پرے ان کے پس منظر میں تھے جن سے ان کی ساڑیوں کے رنگ اور بھی نکھر گئے تھے اور ان کے سر کے گرد سُرخ روشنی کے ہالے سے گھومتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس دنیا، کم از کم اس بستی کی مخلوق معلوم نہ ہوتی تھیں۔ ان کے روشن چہرے۔ ان کی سفید بلوریں ہنسی فضا میں ایک سفید فاختہ کی طرح ڈولتی ہوئی۔ اور جب وہ چبوترے کے قریب اتنے آدمیوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں تو گلی کے چھوٹے چھوٹے جوہڑوں میں ان کی ساڑیوں کے رنگ قوس وقزح کی طرح پھیل گئے۔ یکایک ایک لمحے کے لئے وہ سہم سی گئیں۔ پھر ان میں سے ایک نے جو دوسری سے زیادہ ہوشیار معلوم ہوتی تھی اپنی لانبی لانبی پلکیں جھپکا کے پوچھا "چھ نمبر کی جھونپڑی کون سی ہے ؟"

ایک لمحے کے لئے یا شاید ایک صدی کے لئے کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر جمنا نے آہستہ سے کہا "وہ میری جھونپڑی ہے چار نمبر کی۔ اس سے آگے والی کا نمبر پانچ ہے۔ اُس سے آگے کی جھونپڑی چھ نمبر کی ہے"

ہولے ہولے قدم بڑھاتے ہوئے چبوترے کے قریب سے بدن چُراتے ہوئے وہ دونوں لڑکیاں ساڑی سنبھالتے ہوئے آگے چلی گئیں۔

وہ لڑکی جس نے سوال پوچھا تھا اُس کے بالوں میں بابورام نے دیکھا گلاب کا ایک پھول ٹکا ہوا تھا۔ کتنا عرصہ ——— کتنا عرصہ ہوا اس نے گلاب کا پھول نہیں دیکھا تھا۔ ایک بے نام سی مہک

اس کے نتھنوں میں لہرا گئی اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔

جسونت نے اپنی نگاہیں لڑکیوں کی طرف سے پھیر لیں اور بابو رام کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "وہ بھلا جہاں انسان رہتا ہے وہاں خوب صورتی بھی ہوتی ہے۔ چاہے وہ یہ گلی سڑی بستی کیوں نہ ہو"

بابو رام لاجواب ہو گیا۔ اس نے جسونت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا "وہ کاغذ مجھے دو۔ میں دستخط کر دیتا ہوں ——"

اور کسی نے نہیں پہچانا تھا لیکن اکرم نے پہچان لیا تھا۔ ان میں ایک رفعیہ تھی، اور دوسری جس نے سوال پوچھا تھا وہ رضیہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں اکرم کو معلوم ہوا رفعیہ کی حالت اچھی نہ تھی۔ رضیہ اس کی مدد کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی کب تک کوئی کسی کی مدد کر سکتا ہے اس زمانے میں؟ رفعیہ نے بھنڈی بازار کا کمرہ چھوڑ کر یہاں بستی میں چھ نمبر کی جھونپڑی کرائے پر لے لی تھی، اور اب یہاں اپنی اماں اور اپنی مرحوم بہن کے پانچ بچوں کو لے کر آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ رضیہ کو ساتھ لے کے جھونپڑی دیکھنے کے لئے آئی تھی۔

بستی میں ایسی خوب صورت عورتیں۔ ایسی خوب صورت ساڑیاں۔ ایسے خوبصورت رنگ کاہے کو کسی نے دیکھے تھے۔ وہ لڑکیاں صدیوں کے سہانے خواب کی طرح اچانک اس بستی میں نمودار ہو گئی تھیں۔ اور کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ وہ لوگ بدبو، سڑاند، بدصورتی، کمینگی، تنگ نظری اور چیخ و پکار سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ ایک روشن چہرہ، ایک صاف ستھری ساڑی، گلاب کا مہکتا ہوا پھول بھی ان کے لئے اجنبی تھا۔ ایک ایسا خوب صورت لمحہ تھا جو شاید پریوں کی دنیا سے آیا تھا۔

ننگ دھڑنگ بچے، غلیظ اور شور مچاتے ہوئے بچے، لانبے لانبے بال کھولی ہوئی عورتیں، لٹکے ہوئے پستانوں سے ریں ریں کرتے ہوئے بچوں کو دودھ پلاتی ہوئی جوق در جوق چھ نمبر کی جھونپڑی کے سامنے آ کے کھڑی ہو گئیں۔

یہ خوب صورتی ناقابلِ یقین تھی۔ یہ لمحہ اس زمین کا نہیں شفق کے رنگین آسمان کا ٹکڑا تھا۔

بہت دیر تک لوگ کھڑے دیکھتے رہے۔ دیر تک رفعیہ اندھیری جھونپڑی میں رضیہ کے ساتھ کھڑی اس کی دیواروں اور چھتوں کو دیکھتی رہی۔ مگر وہاں دیکھنے کی چیز ہی کیا تھی۔ یہاں آٹھ روپے کرایہ تھا۔ بھنڈی بازار کی کھولی کا ستائیس روپے کرایہ تھا۔ فیصلہ پہلے ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر دیکھنے اور سوچنے کے بعد رفعیہ اور رضیہ ہولے ہولے جھونپڑی سے نکل گلی میں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئیں، ساڑی اٹھا کر جوہڑوں سے بچتی ہوئیں، اپنے خوشنما سینڈلوں سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئیں گلی کے سرے پر جدھر سے آئی تھیں اُدھر غائب ہو گئیں۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک، اتنا عجیب اور فوری طریقے سے ہوا کہ بستی کو باور نہ ہوتا تھا کہ ابھی یہاں چند لمحے پہلے خوب صورتی آئی تھی۔ حسن اُترا تھا۔ گلاب مہکا تھا۔ فضا جگمگائی تھی۔

یہاں تو کوئی نہ آیا تھا۔

وہی تنگ و تاریک گلی تھی۔ وہی اس کے بدنما جوہڑ تھے۔ وہی زنگ آلود دیواریں۔ وہی بدبُو وہی پُرانا سناٹا۔ یکایک گلی کے دوسرے سرے پر ایک آدمی اپنی بیوی کو زور زور سے پیٹنے لگا۔۔۔ اکرم کے سارے بدن میں جھرجھری سی آئی۔ اس نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر آسمان پر بھی شفق غائب ہو چکی تھی۔ آسمان پر صرف بادلوں کی سیاہ راکھ باقی رہ گئی تھی۔ اتنے میں جمنا اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لالٹین روشن کئے آئی۔ اور فضل نے لالٹین اس کے ہاتھ سے لے کے نیم کے پیڑ پر لٹکا دی۔ روشنی کا ایک ہالہ سا جھونپڑے پر پڑنے لگا۔ جو لوگ اب تک خاموش تھے۔ دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگے۔ آؤ۔ روشنی آؤ۔ کہیں سے آؤ۔

اتوار کو فلم سٹوڈیو تو بند نہیں ہوتے تھے لیکن فلم کمپنیوں کے دفتر ضرور بند ہوتے تھے۔ اور اگر نہیں ہوتے تھے تو ان کمپنیوں کے جن کی شوٹنگ اس روز کسی اسٹوڈیو میں جاری ہوتی لیکن نو بھارت پروڈکشن کا دفتر شوٹنگ ہو نہ ہو ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ صرف باہر کا دروازہ ذرا سا بند کر دیا جاتا۔ اندر ہال میں دو بڑی بڑی میزوں پر بڑے زور کی رمی چلتی تھی۔ میڈم کا ٹیبل الگ تھا۔ سیٹھ باٹلی والا الگ تھا۔ میڈم کی ٹیبل پر آنہ آنہ پوائنٹ کی گیم ہوتی تھی۔ سیٹھ باٹلی والا کے ٹیبل پر شہر کے بڑے بڑے سٹہ باز آتے تھے۔ وہ آنہ آنہ پوائنٹ کو کیا خاطر میں لاتے۔ دو روپے پوائنٹ تک تو وہ کرکٹ کلب آف انڈیا میں کھیل سکتے تھے۔ اس لئے سیٹھ باٹلی والا نے اپنی ٹیبل پر پانچ روپیہ پوائنٹ کی گیم رکھی تھی۔ تاکہ کچھ تو مزا آئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا تھا کہ عورتیں چاہے وہ لاکھوں کمانے والی ہیروئنیں کیوں نہ ہوں۔ کبھی سیٹھ کے ٹیبل پر نہ کھیلتی تھیں۔ وہ میڈم کے ٹیبل پر تاش لے کے بیٹھ جاتیں اور ان کے ساتھ دوسرے بڑے بڑے اداکار یا سلور جوبلی منانے والے ہدایت کار کبھی کبھار شامل ہو جاتے۔ رمی گیارہ بجے دن سے شروع ہوتی اور رات کے گیارہ بجے سے پہلے ختم نہ ہوتی۔ بیچ میں دوپہر کا کھانا۔ شام کی چائے۔ رات کی وہسکی اور کھانا سب ہی کچھ چلتا۔ ساری فضا دھوئیں کے سگریٹوں اور الکحل کی بُو سے معمور ہو جاتی۔ آنکھیں صرف تاش کے پتوں پر لگی رہتیں۔ کھانا، چائے، وہسکی

سگریٹ صرف ہاتھوں کے ذریعے ہونٹوں تک پہنچتے تھے۔ آنکھیں اُس وقت ایسے معاملوں میں بالکل بے کار تھیں۔ وہ نہ شراب کا رنگ دیکھ سکتی تھیں نہ سگریٹ کا برانڈ نہ چپاتی کی صورت وہ صرف تاش کے پتے دیکھ سکتی تھیں۔

ایسے موقع پر اکرم کا شانتی سبھا کی اپیل لے کر پہنچ جانا ایک اذیت ناک بدعت سے کم نہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے بُرا مانا۔ مگر وہ تاش کے پتوں میں اس قدر منہمک تھے کہ اس وقت انہوں نے خاموشی سے اس اپیل پر دستخط کر دینا ہی سب سے اچھا سمجھا۔ اگر کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ خوب خوب اکرم پر جرح کرتے۔ بہت سے سوال پوچھتے۔ اور اکرم خود ہی سوچ کے آیا تھا اور چاہتا بھی یہی تھا کہ سوال وجواب ہوں، گفتگو میں رنگ آئے بحث میں موضوع کھل کر سامنے آئے۔ اچھی طرح بحث کے بعد وہ لوگ دستخط کریں۔ اس نے دو ایک بار اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش بھی کی۔ مگر تاش کھیلنے والے رمی کے رسیا کہاں اس وقت سیاست کی بات سننے والے تھے۔ "ہاں۔ ہاں! ٹھیک ہے" کہہ کر وہ جلدی سے دستخط کر کے اپنا پیچھا چھڑاتے گئے۔ اکرم بہت مایوس ہوا۔ اسے اس بات کی امید نہ تھی کہ حالات یہ صورت اختیار کریں گے۔ یکایک اس کا جی چاہا کہ وہ مزید دستخط حاصل کرنا بند کر دے اور اس معاملے کو پھر کسی دوسرے روز کے لئے ٹال دے۔ مگر مصیبت تو یہ تھی کہ اسے اتوار کے روز کے علاوہ اور کسی دن چھٹی نہ ملتی تھی۔ صرف اتوار کو ڈاک خانہ بند ہوتا تھا۔ اور اتوار کو یہاں ہر روز سیٹھ باکڑیا کے دفتر میں رمی ہوتی تھی۔ اور یہی ایک جگہ تھی جہاں انڈسٹری کے تقریباً سب بڑے بڑے اداکار اکٹھے مل جاتے تھے۔ وہ مایوس ہو کے اپیل کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھنے کا سوچ رہا تھا کہ اتنے میں حالات نے پلٹا کھایا اور سیٹھ باکڑیا نے تاش کے پتے میز پر زور سے پھینک کر اپیل پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

"میں کہتا ہوں" سیٹھ باکڑیا میز پر مکا مار کے بولے "امن سے جنگ ہزار درجہ بہتر ہے۔"

ہر شخص سیٹھ باکڑیا کی طرف دیکھنے لگا۔ فلم انڈسٹری کا امیر ترین سیٹھ اس وقت سیاست دانوں پر اپنی رائے سے دنیا کو سرفراز کر رہا تھا۔ ہر شخص نے اپنے پتے میز پر رکھ دیئے اور غور سے سیٹھ باکڑیا کی طرف

دیکھنے گے۔

اکرم نے پوچھا "کیوں؟ جنگ امن سے کیوں اچھی ہے؟"

"تجربہ۔ میرے بچے تجربہ" بانکڑیا نے اکرم کی طرف مشفقانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا جو اکرم کو بہت کھلا گر وہ چپ ہو کے سیٹھ کی باتیں سننے لگا۔

"جنگ سے پہلے میں کیا تھا۔ تم سب جانتے ہو جنگ کے دنوں میں مجھے بارہ لائسنس تصویریں بنانے کے لئے ملتے تھے۔ ہر لائسنس کے دام مارکیٹ میں سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سے کم نہیں تھے۔ جب تک جنگ رہی میں نے لاکھوں روپیہ کمایا۔ جب جنگ بند ہوئی حکومت نے لائسنس دینے بند کر دیئے۔ جنگ کے دنوں میں میں نے تین سٹوڈیو خریدے۔ جنگ کے بعد میں نے ایک نئی گاڑی بھی نہیں خریدی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے جنگ نے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ میں چاہتا ہوں دنیا میں پھر سے جنگ ہو۔ بھاؤ بڑھیں۔ لائسنس ملیں۔ میری جیب بھرے۔ میں بزنس مین ہوں بزنس کی بات کرتا ہوں بیٹا۔ بولو کیا کہتے ہو؟" اکرم نے کہا "سیٹھ صاحب آپ ایسے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے جنگ میں لاکھوں کمائے ہیں۔ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں"

بانکڑیا نے کہا "ایک مجھ ہی پر کیا موقوف ہے۔ ان اداکاروں سے پوچھو، تمہارے سامنے میز پر بیٹھے ہیں۔ راج تاجنگ سے پہلے پانچ ہزار ایک فلم میں کام کرنے کا لیتی تھی۔ اب پچاس ہزار سے کم میں نہیں آتی شمشاد سے پوچھو۔ سات ہزار لیتی تھی۔ اب ستر سے کم کی بات مشکل سے کرتی ہے۔ دلیپ کمار سے پوچھو۔ دیوآنند سے پوچھو راج کپور سے پوچھو۔ یہ سب لوگ تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ مہتہ جی سے پوچھو، یہ بھی میری طرح فلم پروڈیوسر ہیں۔ جنگ سے پہلے جس ملتے کا تیس ہزار روپیہ ایک فلم کا ملتا تھا اب اسی حلقے سے جنگ کے زمانے میں پچھتر ہزار ملنے لگا۔ امن ہوا تو پھر تیس ہزار بلکہ پچیس ہزار ہی ملنے لگے۔ بتاؤ، امن ٹھیک ہے کہ جنگ؟"

مہتہ جی نے مسکرا کر کہا "اس حساب سے تو جنگ ہی اچھی تھی۔ یہی میں بھی کہتا ہوں"

اکرم نے کہا "آپ کی طرح سوچنے والے کتنے آدمی ہیں۔ وہ پھر بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں"

سیٹھ بھگت لال نے کہا "اس معاملے میں میں اکرم کا ہم خیال ہوں۔ جنگ کے زمانے میں ان پرڈیوسرش نے ہم ڈسٹری بیوٹروں کا خون چوسا ہے۔ کتنے ہی ڈسٹری بیوٹر جنگ میں دیوالیئے ہو گئے"

سیٹھ گنتر چند نے کہا "ہاں یہ تو ٹھیک ہے"

اکرم نے کہا "دو کے مخالف دو"

راج بولی "کچھ بھی ہو جنگ بُری چیز ہے۔ میں نے وہ لڑائی تو نہیں دیکھی لیکن میرا خاندان بہت بڑا ہے ہر بعد کبھی نہ کبھی سر تُمپتُول ہو جاتی ہے۔ بڑی واہیات چیز ہے یہ لڑائی"

شمشاد بولی "مجھے خاموش زندگی پسند ہے۔ مجھے یاد ہے جب جاپانیوں کے بم کلکتے پر گرے تھے تو میں بمبئی سے بھاگنے کی سوچ رہی تھی۔ یہ صحیح ہے۔ جنگ میں میری اداکاری کی قیمت بہت بڑھی۔ میں نے بمبئی میں کئی بلڈنگیں بھی خرید لیں۔ مگر جن دنوں کلکتے میں بم پڑے۔ اُن دنوں میں سوچتی تھی۔ میری اس جائداد کا کیا ہوگا سنتی ہوں، آج کل ایسا ایسے بم بن رہے ہیں۔ راج تُو ہی بتا رہی تھی مجھے ایک ایٹم بم سے سارا شہر کا شہر اُڑ جاتا ہے۔ ناں ناں بانگڑیا سیٹھ۔ لاکھوں روپیہ کمانے کا کیا فائدہ اگر آدمی زندہ ہی نہ رہے"

"چار" اکرم نے کہا۔

پھر اکرم دروازے پر کھڑے ہو کے چپراسی کی طرف مڑا اور اس سے کہنے لگا "پھڈکے! تم بھی کچھ کہو گے"

پھڈکے نے اپنے بڑے بڑے دانت باہر نکال دیئے۔ بولا "میں غریب آدمی ہوں۔ میں کیا بولوں گا"

"نہیں۔ نہیں" اکرم نے کہا "ایسے موقعوں پر غریب آدمی ہی کو زیادہ بولنا چاہئے"

پھڈکے چپ رہا اور خاموشی سے بانگڑیا سیٹھ یعنی اپنے مالک کی طرف دیکھنے لگا۔

سیٹھ بانگڑیا نے مسکرا کے کہا "ہاں ہاں! بھئی۔ آج کل اشتراکیت کا زمانہ ہے۔ ہماری حکومت بھی

اشتراکی ہو رہی ہے۔ تم بھی کہو۔ شری پنڈکے!"

پنڈکے کا چہرا اس طنز سے سُرخ ہو گیا مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ آہستہ سے بولا "اب آپ اتنے عقل مند آدمی بیٹھے ہیں میں ایک جاہل گنوار کسان کیا کہوں۔ جنگ میں وہ لوگ میرے دونوں بڑے بھائیوں کو فوج میں زبردستی بھرتی کر کے لے گئے۔ بڑا بھائی تو مارا گیا۔ چھوٹا بھائی اندھا ہو گیا۔ میں اگر گاؤں سے بھاگ کے یہاں نہ آتا تو شاید اس وقت یہ بات کہنے کے لئے زندہ بھی نہ ہوتا۔"

"کون سی بات؟" سیٹھ بانکڑیا نے پوچھا۔

"آدمی روپے کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ زندگی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

پنڈکے اتنا کہہ کے خاموش ہو گیا۔ سارے ہال میں سناٹا سا چھا گیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے تاش کھیلنے والے نامور لوگوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ معمولی اَن پڑھ، گاؤں سے آیا ہوا چپراسی ایسی سوجھ بوجھ کی بات کرے گا۔

اکرم نے کہا "پانچ! اور کوئی بات کرے گا؟"

میڈم بولی "تم نے سیٹھ کی لاکھوں روپے والی بات کا جواب نہیں دیا ہے"

اکرم نے کہا "پنڈکے نے جواب دے دیا ہے۔ میں اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا لیکن میں ایک سوال ضرور سیٹھ سے پوچھنا چاہوں گا۔ یہ جو لاکھوں روپے سیٹھ نے اکٹھے کئے ہیں کیا یہ آسمان سے اترے ہیں؟ یا کیا سیٹھ نے کوئی ٹکسال کھول رکھی ہے؟ کہاں سے آئے ہیں آخر کسی نے محنت کی ہو گی۔ کسی نے کھیت میں ہل چلایا ہو گا۔ کسی نے کارخانے میں کپڑا بُنا ہو گا۔ کسی نے بھٹے میں اینٹیں لگائی ہوں گی۔ کسی نے دفتر میں صبح سے شام تک کام کیا ہو گا اور پھر دس دس آنے کر کے سنیما کا ٹکٹ خریدا ہو گا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ پبلک کا اتنا لاکھوں روپیہ ایک آدمی کی تجوری میں آ کے بند ہو جائے۔ ایک لاکھ آدمی بھوکے رہیں اور ایک آدمی کے پاس ایک لاکھ روپیہ اکٹھا ہو جائے۔ میڈم کیا آپ نہیں دیکھ سکتیں کہ سیٹھ اس لئے جنگ

چاہتے ہیں تاکہ آرام سے لائسنس لے کے لاکھوں آدمیوں کی روحوں کی بلیک مارکیٹ کر سکیں"

میڈم بولی "تو تم مانتے ہو کہ سیٹھ کو جنگ نے فائدہ پہنچایا ہے"

"ہاں!" اکرم نے اقرار کیا۔

میڈم فتح مندانہ لہجے میں بولی "تو لاؤ۔ میرے دستخط کاٹ دو۔ میں نے اُس وقت رمی کے رش میں دستخط کر دیے تھے۔ میرا دھیان پتّوں میں تھا۔"

اکرم نے میڈم کے دستخط پر سیاہی کی لکیر پھیر دی۔ پھر اس نے میز پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں سے مسکرا کے کہا "اور کوئی اپنا دستخط واپس لینا چاہتا ہے"

کوئی نہیں بولا۔

اکرم نے کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر سیٹھ کی طرف دیکھ کے بولا "سیٹھ میں پھر آؤں گا تمہارے پاس۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ تم میرے کاغذ پر دستخط کر دو گے"

"کیوں؟"

"کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ وہ کاغذ کا ٹکڑا ہے جو امیر اور غریب۔ نیک اور بد۔ فرشتے اور شیطان دونوں کو اپنی زندگی گزارنے۔ اپنی قسمت آزمانے اور اپنے اپنے انجام تک پہنچنے کا موقعہ دیتا ہے۔ جس طرح کا بھی وہ انجام ہو۔ اس سے بھی غرض نہیں۔ لیکن جو جنگ اب سامنے نظر آ رہی ہے۔ اور جسے روکنا بھی ہے۔ وہ امیر اور غریب۔ نیک اور بد۔ فرشتے اور شیطان میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھے گی۔ ہم سب مر جائیں گے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اگلی جنگ میں تم لاکھوں بھی کما نہ سکو گے۔ بلکہ پچھلی دو جنگوں میں جو لاکھوں تم نے کمائے ہیں وہ بھی ہاتھ سے کھو دو گے۔ یاد کرو ناگاساکی، ہیروشیما۔ کوئی نہیں کہہ سکتا ہوا کا رُخ کدھر بدلے گا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا سیٹھ۔ ایک دن یہ بمبئی بھی ناگاساکی یا ہیروشیما سے بڑا المیہ بن جائے، ایک بم اور تمہاری ساری بلڈنگیں اور سارے سٹوڈیو ایک لمحے میں منہدم!"

" اوران کے ساتھ تم بھی "

" اس لئے میں تم سے کہتا ہوں سیٹھ۔ میں پھر آؤں گا۔ اور پھر آؤں گا۔ کیوں کہ اس اپیل پر مجھے تمہارے ایسے چور، بدمعاش، بلیک مارکیٹئے اور ٹھگ کے بھی دستخط منظور ہیں "

بانکڑیا نے ہنستے ہوئے سیٹھ بھگت لال کو کہنی مار کے کہا " سنتے ہو۔ سالا مجھے کیسے کیسے خطاب سے نوازتا ہے۔ بس ایک اس کو میں نے چھوٹ دے رکھی ہے "

"کیوں" سیٹھ بھگت لال نے آزردہ ہو کے پوچھا۔

" معلوم نہیں کیوں؟ شاید کبھی کبھی دوسرے کے مونہہ سے اپنے متعلق سچ سننا اچھا معلوم ہوتا ہے " بانکڑیا نے اقرار کیا اور پھر اس نے مڑکر جاتے ہوئے اکرم کو آواز دے کے کہا " اکرم ادھر آ کم بخت شاید تو ٹھیک کہتا ہے۔ اگلی جنگ میں کچھ نہیں بچے گا میرے لئے۔ بتا کہاں دستخط کروں؟ "

جب اکرم کاغذ جیب میں ڈال کے باہر کی طرف چلا تو شمشاد نے راج کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا " ہائے مجھے بڑا اچھا لگتا ہے یہ اکرم۔ جب بات کر رہا تھا تو کیسے معصوم بھولا سا لگ رہا تھا اور کتنا پیلا بالکل کسی آئرش پوڈل کی طرح ــــــ آئرش کتے مجھے بہت پیارے لگتے ہیں نا! "

راج نے دبے دبے لہجے میں اُسے جواب دیا " کہو تو اسے پیغام بھیج دوں کہ تم کسی کو بہت پیارے معلوم ہوتے ہو "

شمشاد نے آہ بھر کے کہا " نہیں۔ جانی۔ وہ اُس عشرت کے واقعے کے بعد دادی اماں بہت محتاط ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے میں ایک آئرش پوڈل ہی خرید لوں گی "

اور جب اکرم ہال سے باہر آگیا تو اُسے دُھوسے ملا جو دروازے کے پیچھے کھڑا کھڑا یہ سب گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے بڑی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھ کے کہا " تم نے اسے ایسی کھری کھری سنائیں کہ میرا تو خیال تھا، وہ تمہیں کھڑے کھڑے نکلوائے گا "

اکرم نے کہا" اگر میں اُسے کھری کھری نہ سناتا تو وہ کبھی دستخط نہ کرتا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں"
ستیہ رائے نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کے کہا "واہ رے میرے شیر۔ جھنڈے گاڑ دیئے تُو نے
آج۔ تو نے جھنڈا ہمالیہ سے اٹھایا اور ایشیا پر گاڑ دیا۔ کیسے تُو نے اس سیٹھ کو رکھا، باندھا، تانا کھینچا اور
پھر کھینچ کے چھوڑ دیا کہ جاؤ بیٹا لٹکے رہو "

من جیت سنگھ نے پوچھا" اچھا اب کہاں چلیں گے ؟ "

اکرم نے کہا قریب ہی راج محل سٹوڈیو ہے۔ دیکھیں وہاں اگر کسی کی شوٹنگ ہو رہی ہو گی تو
دستخط کرا لیں گے "

اکرم جس وقت راج محل سٹوڈیو میں اپنے ساتھیوں کو لے کر پہنچا، اُس وقت جوشی جی کی پکچر کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ مگر اُس وقت اتفاق سے شوٹنگ بند تھی۔ کیوں کہ جوشی جی اور سودیش پرانجپے ایک لائٹ مین کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا۔ بڑی معمولی سی بات تھی۔ جوشی جی نے سیٹ پر ایک ناچنے والی لڑکی روزی کا بوسہ لے لیا تھا۔ اور اس قسم کی چھوٹی موٹی حرکتیں سٹوڈیو میں اکثر ہو جایا کرتی تھیں اور لوگ عام طور سے اس طرف سے آنکھ بند کر کے کام کرتے تھے مگر آج سودیش پرانجپے بگڑ بیٹھا تھا۔ وہ ایک معمولی لائٹ مین تھا۔ روزی کا عاشق بھی نہ تھا۔ پھر اُسے بیچ میں بولنے کا کیا حق تھا۔

جوشی جی برہم ہو رہے تھے "سالا دو ٹکے کا آدمی۔ ہم پر رباب کرتا ہے" جوشی جی نے بمبیا زبان میں کہا۔

سودیش پرانجپے نے کہا "سالا دو ٹکے کا ہو یا چار ٹکے کا تم کو اس سے کیا۔ ہم تم کو بولتا ہے۔ تم ڈائرکٹر رے۔ تو سیٹ پر شرافت سے کام کرو۔ سالا یہ سٹوڈیو ہے۔ کوئی پون پل کا کوٹھا نہیں ہے "

"یہ روزی تمہاری ماں لگتی ہے ؟" جوشی جی نے غصے سے پوچھا۔

سودیش پرانجپے بولا "یہ نہ ہماری ماں ہے۔ نہ بہن نہ دوست۔ ہماری کچھ بھی نہیں ہے پھر بھی عورت

تو ہے۔ عورت کی عزت کرنا سیکھا ہم کو"

" بڑا آیا عزت کرنے والا۔ سالے اگر یہ مجھے بوسہ دیتی ہے تو تُو بیچ میں دُم مارنے والا کون ہوتا ہے"

"سوال مرضی کا نہیں ہے۔ سوال اصول کا ہے ۔ کل کو یہ تمہارے ساتھ سیٹ پر سونے کے لئے تیار ہو جائے گی تو کیا ہم اس کی اجازت دیں گے ؟ کبھی نہیں" سودیش پرانجپے نے بڑی مضبوطی سے انکار میں سر ہلایا۔

" تم کون ہوتے ہو حکم دینے والے" جوشی جی نے اپنی ٹھوڑی آگے بڑھا کے پوچھا۔ اس کی نیولے کی سی آنکھوں میں غصے کی لہریں دوڑ گئیں " میں اس سیٹ کا ڈائرکٹر ہوں جو چاہوں کر سکتا ہوں، جسے چاہوں کان سے پکڑ کر باہر نکال سکتا ہوں۔ گٹ آؤٹ یُو بلیڈی سوائن!" جوشی جی نے انگریزی میں کہا۔

" یُو بلیڈی ڈاگ!" سودیش پرانجپے نے بھی اُسی لہجے میں ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

جوشی جی اور ان کا اسسٹنٹ بطا چاریہ اور دوسرے لوگ حیرت میں رہ گئے۔ ایک لائٹ مین انگریزی بول رہا تھا ان کے برابر کی انگریزی۔ جوشی جی نے ایک نئی نظر سے سودیش پرانجپے کی طرف دیکھا۔ سودیش پرانجپے ایک خاکی نیکر خاکی قمیض پہنے اپنی جگہ پر خاموش کھڑا تھا۔ اکرم نے اس کی گھنی بھوؤں کے نیچے کی روشن آنکھوں کو دیکھا۔ اُس کے اُبھرے ہوئے مراٹھی رخساروں کے نیچے کے مضبوط جبڑے کو دیکھا۔ گردن کے نیچے کے مضبوط ملاشی جسم کو دیکھا۔ سودیش پرانجپے کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا جواب غصے سے گہرا سرخ ہو رہا تھا۔ مگر اکرم دیکھ رہا تھا کہ سودیش اپنے آپ پر قابو پانے کی بہت کوشش کر رہا تھا۔

جوشی جی بولے " میں بطور ایک ڈائرکٹر کے تمہیں حکم دیتا ہوں۔ سیٹ سے باہر چلے جاؤ"

سودیش پرانجپے ایک لمحے کے لئے رکا۔ پھر وہ گھوم کر سیٹ سے باہر چلا گیا۔

جوشی جی نے کیمرہ مین سے کہا " لائٹ فکس کرو جلدی سے "

کیمرہ مین زور سے چلایا " وہ سولر ادھر لاؤ۔ بے بی ادھر کھسکاؤ۔ بھانڈپ وہاں فکس کرو"

مگر گمی لائٹ مین نے کیرو مین کی ہدایات پر عمل نہیں کیا اور سب لوگ سر جھکائے روشنیوں کے پاس سے کھسک آئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سیٹ کے باہر چلے گئے۔ شوٹنگ بند ہو گئی۔

رضیہ اور رفیعہ، روزی، سلوچنا، ماریا، واڑیا اور دوسری ناچنے والی لڑکیاں اور ان کا استاد بابولال سب حیرت سے کھڑے کے کھڑے رہ گئے ــــــــ یکایک رضیہ کو معلوم ہوا کہ سٹوڈیو میں مرکزی فرد خود ڈائرکٹر نہیں ہوتا ہے۔ ایک معمولی لائٹ مین ہوتا ہے جو دن رات سٹوڈیو کی روشنیاں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر لے جاتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو ایک منٹ میں سٹوڈیو بند کرا سکتا ہے۔

دھوبے خود مزدور تھا اس لئے اُسے اس واقعہ میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ــــــ سٹیج نمبر ایک کے باہر جہاں سودیش پرانچپے اور دوسرے اس کے لائٹ مین ساتھی کھڑے تھے، خود اپنا تعارف کرانے کے لئے چلا گیا اور ان سب سے باتیں تفصیل سے پوچھنے لگا۔

سودیش پرانچپے کہنے لگا " ایک تو تین ماہ تک پگار نہیں ملتی ہے۔ دوسرے ہم لوگ ان کی رنڈی بازی بھی دیکھیں۔ نہیں چلیگا! " سودیش پرانچپے نے بڑی مضبوطی سے سر ہلایا۔ "ہم کو ان کی پرائیویٹ لائف سے کوئی گرج نہیں ہے۔ مگر یہ اِدھر سیٹ پر ہم کو اپنی پرائیویٹ لائف نہیں دکھا سکتے۔ نہیں چلیگا " اس نے پھر مضبوطی سے سر ہلایا۔

" سالا ہلکٹ ! " دوسرا لائٹ مین بولا " میں سالے کا سر توڑ دیتا۔ بڑا آیا کہیں کا ڈائرکٹر "

سودیش نرمی سے بولا " سر توڑنے سے کام نہیں چلیگا۔ سیٹ پر یہ گندہ دھندا بند ہونا چاہئے۔ بس ! "

دھوبے نے پوچھا " کیا تمہاری یونین ہے ؟ "

" ہاں " دوسرا لائٹ مین بولا " ابھی ابھی کی یونین ہے۔ ہمارا سودیش اُسی کا وائس پریذیڈنٹ ہے "

دوسرے لائٹ مین نے بڑے فخر سے سودیش کی طرف دیکھ کے کہا۔ اکرم نے سودیش سے ہاتھ ملایا
"تم نے بہت اچھا کام کیا۔ اِن لڑکیوں کی بہت بُری حالت تھی"

سودیش ذرا سا مسکرایا۔

اتنے میں ان لوگوں نے دیکھا کہ کونے کے میک اپ روم سے بہت سی لڑکیاں نکلیں اور دھیرے دھیرے ان کی طرف آتی گئیں جدھر یہ لوگ کھڑے تھے۔ بہت سی لڑکیاں حجاب محسوس کر رہی تھیں اور ایک دوسرے کو ٹہوکا دے کے آگے چلنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ یا ایک دوسرے کے پیچھے ہو کے ہنسنے کی کوشش کر رہی تھیں جیسے لڑکیاں ایسے موقعوں پر اکثر کیا کرتی ہیں۔ رضیہ اور رفعیہ اُن سب میں آگے تھیں۔ رضیہ بولی "آپ نے اس وقت بہت اچھا کیا"

رفعیہ بولی "آپ ہمارے لئے کھڑے ہو گئے حالانکہ ہمیں خود یہ لڑائی لڑنی چاہئے تھی۔ میں تو ان لڑکیوں کو لاکھ سمجھاتی ہوں مگر ایسی بزدل ہیں یہ!"

رنذی محبوب سی ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اب وہ ہمت کر کے آگے آئی۔ اس نے سودیش سے ہاتھ ملایا مگر کچھ کہا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

سودیش نے کہا "تم ہماری بہن ہو، ہماری ہی طرح مزدور ہو۔ ہماری ہی طرح دن رات خون پسینہ ایک کر کے تھکا دینے والے ناچوں میں کام کر کے اپنی روٹی کماتی ہو۔ اس کے اوپر سے اگر کوئی تمہاری بے عزتی کرے تو تم کو خود منع کرنا چاہئے۔ ایسا بھی کیا؟" سودیش کے لہجے میں بڑی شکایت تھی۔

رفعیہ نے اس کے بازو کو ٹہوکا دے کے کہا "اب کے ایسا ہی ہوگا۔ ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا کہ اکیلی اکیلی الگ الگ رہنے سے دوسروں کی شرافت پر بھروسہ کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم نے ابھی میک اپ روم میں اپنی یونین بنائی ہے اور رضیہ کو اپنا سکریٹری بھی چُن لیا ہے۔ اور اب ہم جہاں کوئی ایسی شرارت ہوگی سب کی سب واک آوٹ کر جائیں گی"

"بس!"

سودیش مسکرانے لگا" اس نے رفیہ سے کہا" جس سٹوڈیو میں تم سے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے، مجھ سے کہو۔ وہاں کے کسی بھی لائٹ مین سے کہو۔ سالے ہم سٹوڈیو میں ہڑتال کرا دیں گے مگر یہ بدمعاشی نہیں چلنے دیں گے! نہیں چلیگا! کھتم!!"

اکرم کو سودیش کا "کھتم" بہت پسند آیا۔ اس نے سودیش سے پوچھا" تم کہاں رہتے ہو"

"ماہم کاز وے کی جھونپڑیوں میں" سودیش نے اسے بتایا۔

"پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو"

سودیش چُپ ہو رہا۔

اس کے ایک ساتھی نے بڑے فخر سے اکرم کو بتایا" ہمارا سودیش میٹرک تک پڑھا ہے"

اتنے میں رفیہ نے کہا" چلو لڑکیو میک اپ اُتارو۔ گھر چلیں۔ تھوڑے عرصے میں یہ خبر سارے سٹوڈیو میں پھیل گئی کہ نہ صرف لائٹ مینوں نے بلکہ ناچنے والی لڑکیوں نے بھی ہڑتال کر دی ہے۔ جوشی جی کا اسسٹنٹ بھٹاچاریہ دوڑتا دوڑتا ان کے پاس آیا۔ ہانپتے ہوئے بولا " رفیہ بوئی۔ رفیہ بوئی۔ کیا گجب کر رہی ہو۔ سیٹ لگا پڑا ہے۔ آج کام ختم نہ ہوا تو پھر لگوانا پڑے گا۔ دس ہجار کا نقصان ہو جائے گا"

"ہم سے کیا کہتے ہو۔ اپنے اُس اجاڑ ماتی بلے جوشی گنجے سے کہو۔ کاہے کو ہماری لڑکی کو چھیڑا تھا۔"

"رفیہ بوئی۔ اب کی جانے دو۔ جوشی دل میں بہت شرمندہ ہیں"

رفیہ نے اپنی انگلیاں نچاتے ہوئے کہا" دل میں شرمندہ ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ سب کے سامنے معافی مانگنی پڑے گی۔ سیٹ پر جتنے آدمی موجود تھے جن کے سامنے جوشی جی نے یہ بُری حرکت کی ان سب کے سامنے انہیں روزی کے پاؤں چھو کر معافی مانگنی پڑے گی۔ جاؤ اپنے ڈائرکٹر سے کہہ دو"

بھٹاچاریہ مونہہ لٹکائے ہوئے جوشی جی کے پاس چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد لڑکیوں نے نعرے

تالی بجائی جو اپنی نئی طاقت کو محسوس کر کے بہت خوش تھیں۔ بچوں کی طرح شوخ اور ہنسی سے معمور نظر آتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے تالی بجا بجا کر گانا اور ناچنا شروع کیا۔ سٹیج نمبر ایک کے لان میں سارے لائٹ مین اور دوسرے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا سٹوڈیو میں سٹرائیک نہیں میلہ ہے

کوئی ایک گھنٹے کے بعد بجھا چارہ بڑا سنجیدہ سا منہ بنائے اس مجمع کے قریب آیا "اندر چلئے۔ جوشی جی معافی مانگنے کے لئے تیار ہیں"

مجمع میں خوشی کے نعرے بلند ہوتے۔ ٹوپیاں فضا میں اچھلیں۔ لڑکیوں نے ناچ کا آخری چکر زور سے ختم کیا۔ پھر سب لوگ اندر سیٹ کی طرف بھاگے۔

اندر سیٹ پر جوشی جی سگرٹ پر سگرٹ پی رہے تھے۔ ان کے قریب کیمرہ مین اور اس کا اسسٹنٹ کھڑے تھے۔ اور بابو لال ڈانس ماسٹر، تمام لائٹ مین اور ناچنے والی لڑکیاں اور دوسرے بھی کئی تماشائی اندر آگئے اور سب خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ دیکھیں اب جوشی جی کیا کرتے ہیں! جوشی جی کی تیوری تنی ہوئی تھیں ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ انہوں نے سگریٹ کو زور سے فرش پر پھینک کر اسے زور سے اپنے جوتے سے مسل دیا۔ رومال نکال کر اپنے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ پھر کہا "ہاں میری غلطی تھی۔ مجھے معاف کر دیا جائے" پھر وہ یکایک آگے بڑھے اور انہوں نے روزی کے پاؤں چھوتے "اب زندگی بھر کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا"

جوشی جی کی آواز پر خلوص تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سودیش کی طرف مڑا اور اس نے کہا۔ "میں نے تمہیں گالی دی۔ اور میں نے تمہیں۔" سودیش نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہاتھ ملاؤ" جوشی جی نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سودیش نے بڑی مضبوطی سے مصافحہ کیا۔ سارے سیٹ پر تالیوں کی گونج سنائی دے گئی۔

کیمرہ مین نے چلا کے کہا۔ "ہاں! وہ رائفل ادھر لاؤ۔ اس چھجے پر بھانڈ وپ مارو۔ وہ سپاٹ

کدھر ہے!"

لائٹ مین روشنیاں اِدھر سے اُدھر لے جانے لگے۔ ساؤنڈ نے ناچ کے گیت کا پلے بیک شروع کیا۔

لڑکیاں پاؤں سے تال دینے لگیں۔

کام شروع ہوگیا۔

سٹوڈیو سے باہر آکے ستیہ رائے نے ہاتھ اونچا کر کے زور سے چلّا کے کہا "جھنڈا گاڑ دیا۔ ہمارے دیش کی استریوں نے۔ ہمالیہ سے اٹھایا اور ایشیا پر جھنڈا گاڑ دیا!"

"اتنا شور نہ کرو۔ اکرم نے سنجیدہ ہو کے ستیہ رائے سے کہا۔ "تم نہیں جانتے آج ہماری انڈسٹری میں کتنی عظیم تحریک نے جنم لیا ہے"

یکایک اکرم کو مرزا جی یاد آگئے وہ جو پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کی سب باتیں۔ ان کی گھٹن، ویرانی گھبراہٹ۔ تاریکی۔ خود اُس کا ہاتھوں میں سر پکڑ کے بیٹھ جانا۔ راستہ؟ راستہ کہاں ہے۔ یکایک اکرم کے دل میں بہت سی باتیں صاف ہوگئیں۔ اب اسے یکایک معلوم ہوگیا کہ راستہ کدھر سے جاتا ہے۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ راستہ شاید شانتارام۔ محبوب۔ کاردار۔ مکرجی۔ اور ایسے بڑے بڑے لوگ اُسے بتائیں گے۔ یکایک اسے معلوم ہوگیا کہ یہ راستہ تو فلم کے بہت معمولی افراد کے دلوں اور زندگیوں سے ہو کے گزرتا ہے۔ ایک لائٹ مین۔ ایک ناچنے والی۔ ایک فلم ایکسٹرا۔ دروازے پر کھڑا ہوا چپراسی. . . .

دُھومے نے اس سے کہا "یہ فضا میں ہے۔ یہ فضا میں ہے!"

"کیا؟" اکرم نے پوچھا۔

"یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے کس نے انہیں بتایا تھا؟ ہم لوگ تو الگ الگ ان سے رہے۔ کبھی ان لوگوں سے بات بھی نہیں کی۔ موقعہ ہی نہیں ملا۔ مگر یہ تو فضا میں ہے۔ تم اس طرح کے خیال

رکھنے والوں کو قید کر سکتے ہو۔ اس پوری فضا کو، ہوا کو کیسے قید کرو گے؟" چمکتے ہوئے فولاد کی ہلکی سی جھلک دُھومے کی آنکھوں میں تھی۔

پیدل چلتے ہوئے وہ لوگ ابھی بہت دُور نہ گئے ہوں گے کہ ایک ٹیکسی ان کے قریب آ کے رُکی۔ اور کسی نسوانی آواز نے کہا "مسٹر اکرم!" اکرم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رفعیہ اُس سے مخاطب ہوتی "مسٹر اکرم!" رفعیہ بولی "ولایت بیگم کو تو آپ جانتے ہوں گے۔ وہ آپ کی کچہری میں کام کر رہی تھی۔ وہ شہر کے ہاسپٹل میں بہت بُری حالت میں بیمار پڑی ہے۔ اُسے دیکھنے چلئے گا"

اکرم نے ٹیکسی کے اندر نگاہ ڈالی۔ پیچھے کی سیٹ پر رفعیہ کے ساتھ رضیہ اور روزی بیٹھی تھیں۔ اکرم نے اپنے ساتھیوں سے اجازت مانگی اور پٹ کھول کر آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ٹیکسی چل دی!

اکرم نے مُڑ کے پوچھا "کیا ہوا تھا اُسے؟"

لڑکیوں نے شرم سے مونہہ پھیر لیا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اکرم کچھ تو سمجھ گیا۔ پھر اس کے ذہن میں ولایت بیگم سے اس کی آخری ملاقات اُبھر آئی۔ اور اس نے انہیں وہ واقعہ سنایا۔ کس طرح وہ عشرت کی اماں کے لئے پچھتر روپے منی آرڈر کرنے کے لئے آئی تھی۔ عشرت کا نام سنتے ہی اکرم نے دیکھا کہ رفعیہ ذرا چونکی۔ پھر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ اُسے یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی مگر اُس نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔

روزی بولی " وہ دل کی بڑی نیک ہے۔ گر! ـــــــ " روزی چپ ہوگئی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر رضیہ بولی " آپ آج کل کوئی پکچر نہیں بنا رہے ہیں؟ " وہ سب جانتی تھی پھر بھی اُس نے یہ سوال پوچھا۔

" نہیں "

" کیوں؟ "

" وہ جن لوگوں کے ہاتھ میں تھیلیاں ہیں۔ وہ مجھے میری مرضی کا موضوع نہیں لینے دیتے۔ اس لئے " ـــــــ اکرم نے ہنس کر کہا " اس لئے اب میں دادر پوسٹ آفس کے باہر خطوط نویسی کرتا ہوں "

رضیہ نے حیرت سے پوچھا " آپ خوش ہیں اپنے اس نئے کام سے؟ "

" اتنا ہی خوش جتنا کوئی ان حالات میں خوش رہ سکتا ہے "

روزی بڑی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ اس کے بھرے ہوئے رسیلے ہونٹ واقعی اس قدر خوب صورت تھے کہ کسی بھی مرد کو بوسے کے لئے پاگل کر سکتے تھے۔ اکرم نے سوچا پھر روزی کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کتنی خفگی ہے۔ جیسے آدمی جولائی کی تپتی ہوئی لو کو چھوڑ کر کسی ٹھنڈے چشمے کے کنارے آ بیٹھے۔

باقی رستے میں خاموشی رہی۔ مگر اکرم نے محسوس کیا جیسے روزی بار بار اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

ہسپتال میں ولایت بیگم کے کمرے کے باہر ایک بینچ پر بے بے۔ ابا جلال الدین۔ اور سیف بیٹھے تھے۔ پریشان حال پچکے ہوئے مردہ اور اُداس۔ مگر اُن میں عشرت کہیں نظر نہ آیا۔ اکرم کو بڑی حیرت ہوئی مگر بعد میں اُسے شفیع سے معلوم ہوا کہ ولایت بیگم کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں نے عشرت کو گھر سے نکال دیا تھا۔ مگر پھر بھی، اکرم نے سوچا، عشرت کو یہاں آنا چاہئے تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ سب لوگ باہر کھڑے رہے اور ان کے دیگر گھر کے لوگوں نے باتیں کرتے رہے اور ولایت بیگم کی صحت کے بارے میں پوچھتے رہے اور اظہارِ افسوس کرتے رہے پھر جب ہسپتال والوں کی طرف سے کمرے کے اندر جانے کی اجازت مل گئی تو نرس کے اشارے پر وہ سب لوگ ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ اندر چلے آئے۔ . . .

ایک اونچے سفید براق بستر پر ولایت بیگم بے ہوش پڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے اور اس کے رخسار نیلے تھے۔ اُسے ابھی ابھی آکسیجن دی جا چکی تھی۔ لیکن اس کا مونہہ زور سے اندر کو کھنچا ہوا تھا، اور ناک کے نتھنوں سے اندر سانس کی نالی تک سانس یوں رُک رُک کر گھُر گھُر کرتی ہوئی چل رہی تھی جیسے سانس کے رستے میں کسی نے بھاری بھاری چٹانیں گرا دی ہوں۔ اور اب سانس ان چٹانوں کی دراڑوں میں سے ہوتی ہوئی گھومتی ہوئی بڑی مشکل سے ناک کے نتھنوں سے خارج ہو رہی ہو۔

یہ بڑا بھیانک منظر تھا۔ ولایت بیگم کا وہ پھول کا سا رنگ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اُس کے دونوں بازو سنولے سیاہ اور جلی ہوئی لکڑیوں کی طرح اُس کے دونوں طرف سرہانے پر بے حس و حرکت پڑے تھے۔ کبھی کبھی اُن کی انگلیوں میں ایک خفیف سی لرزش پیدا ہوتی۔ وہ انگلیاں جیسے مٹھی میں بند ہونا چاہتی تھیں، وہ بازو جیسے سرہانے سے اُٹھ کے سینے کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ دو تین بار ولایت بیگم کے بازوؤں میں ایسی جنبش پیدا بھی ہوئی اس کے ہاتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور سینے کی طرف چلے مگر نرس نے انہیں سہلاتے ہوئے پھر سرہانے پر رکھ دیا۔

ٹھوڑی سوجی ہوئی تھی۔ ٹھوڑی پر ایک بہت بڑا زخم تھا۔ ٹانگوں کا جو حصہ یعنی ٹخنوں سے نیچے کا جو حصہ نظر آتا تھا وہاں پر زخم تھے۔ سب پر پٹی بندھی ہوئی تھی مگر سب زخم رِس رہے تھے اور سانس گھُر گھُر گھُر گھُر کہیں میلوں دُور سے آتی ہوئی گھسٹ گھسٹ کر چل رہی تھی۔

یکایک ولایت بیگم نے آنکھیں کھول دیں۔ رضیہ اور رفیعہ ذرا آگے کو ہو لیں۔ مگر ولایت بیگم تو صرف

چھت کو تک رہی تھی۔ وہ کسی کو پہچان نہ رہی تھی۔ وہ صرف چھت کو تک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت ہی دھیمے دھیمے سرگوشی میں اس کے ہونٹوں سے آواز نکلی "میرا بچہ! میرا بچہ ...."

رفعیہ کا دل کانپ گیا۔ وہ کتنے عرصے پہلے کی ایک رات میں کھو گئی۔ جب وہ اور ولایت راج تا کے گھر ناچی تھیں جب وہ عشرت کے لئے اِس قدر اُداس تھی، اور ولایت نے اسے بتایا تھا کس طرح اس کا دل ایک بچے کے لئے تڑپتا ہے۔

وہ ہونٹ بند ہو گئے۔ وہ آنکھیں دیر تک چھت کی سطح کو دیکھتی رہیں، جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ یکایک ایک شدید جان کاہ کاوش کے بعد ولایت بیگم بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نرس حیرت میں رہ گئی اُس نے ولایت بیگم کو لٹانا چاہا مگر اس کے جلے ہوئے بازوؤں میں نہ جانے کہاں سے اس وقت طاقت آ گئی تھی کہ اس نے اپنے بازوؤں سے نرس کو پرے کر دیا۔ وہ آنکھیں سیدھی خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ تیزی سے اٹھے اور سینے کی طرف گئے۔ ولایت بیگم نے اپنے سینے پر دو ہتڑ مار کر رُندے ہوئے گلے سے چلّا کر کہا "ربّا۔ کیا میں ہمیشہ آدھی عورت رہوں گی۔ کیا میری چھاتیوں میں کبھی دودھ نہیں اُترے گا؟ ربّا بولتا کیوں نہیں" ولایت بیگم زور سے چیخی۔ اور اس کی آواز ایک زخمی ابابیل کی طرح وارڈوں میں پھڑپھڑاتی چلی گئی۔ پھر اس نے ایک بار دو بار زور زور سے اپنے سینے پر دو ہتڑ مارے اور پھر یکایک وہ پیچھے کو بستر پر گر گئی۔ اس کے دونوں بازو بے جان ہو کر دائیں جانب گر ے۔

نرس جلدی سے آگے بڑھی۔ مگر وہاں اب کوئی نہ تھا۔ ولایت بیگم کی دونوں آنکھیں بے نور اور بے جان تھیں۔ منجمد جھیل کی طرح ———

تو تم نے اُسے مار ڈالا! اکرم ٹیکسی میں سوچنے لگا۔ میرے پیارے خوب صورت شریف سماج! تم نے ولایت بیگم کو پہلے تو ایک سیاہی چوس کی طرح استعمال کیا۔ پھر اُسے گندے تولئے کی طرح برتا۔ اور آخر میں ایک

غلیظ جھاڑن سمجھ کر موت کے کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا۔ لیکن جب تک میری جان میں جان ہے اور میرے ہاتھوں میں طاقت ہے اور آنکھوں میں نور ہے اور دماغ میں سوچ اور سمجھ کی ایک رمق بھی موجود ہے میں لڑتا رہوں گا اِس اندھی، شیطنت، ظلم اور خوف ناک بے انصافی کے خلاف۔ ایک بار نہیں دس بار نہیں۔ میں دس لاکھ بار اپنے فولادی مکّوں سے تمہارے آہنی جبڑوں کے خلاف ٹکر لگاتا رہوں گا۔ تاکہ کبھی کسی وقت کسی طرح تو تمہارے اندھے دماغ میں کہیں سے روشنی کی ایک کرن پہنچے۔ اے گندے، گھناؤنے، غلیظ، حرام خور، سُوز کا سا چہرہ لے کر چلنے والے سماج۔

کبھی وہ کپڑے اچھے تھے۔ کبھی ان کی تراش بھی اچھی تھی۔ مگر اس وقت وہ گندے میلے کچیلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ سیٹھ چھیدی لال بہت دیر تک عشرت کے مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ مگر عشرت کی آنکھیں غیر معمولی ۔۔۔ پر روشن تھیں اور ہتھیلیاں بھی پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ رات بھر وہ بخار سے پھنکتا رہا تھا۔ کئی راتوں سے اسے بخار ہوتا تھا۔ پھنکتا تھا۔ جسم کو جھلسانے والا بخار۔ یکایک صبح کو غائب ہو جاتا تھا۔ جسم کی ہڈی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہر عضو اپنی جگہ سے الگ اور حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے۔ عشرت نے کانچ کے ٹوٹے ہوئے گلاس سے دو تین بار اس سے پانی پیا۔ خدایا، اندر کتنی حدت ہے۔ پیٹ میں پانی کی ایک پوری مشک چاہیئے۔ ان دو تین گلاسوں سے کیا ہوگا۔ پانی پی کر اس نے زرد رنگ کا مفلر اپنے گلے کے گرد لپیٹا۔ اتنے میں دستک دیئے بغیر قاسم اندر آگیا۔ قاسم کماٹی پور کا مشہور دادا تھا، اور بالکل دادا ہی دکھائی دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر غلطی نہیں کھا سکتا تھا۔ کوئی اسے کسی اعتبار سے کسی حیثیت سے شریف انسان نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کی پوری زندگی، اُس کا پیشہ، اُس کے خصائل، اُس کا کردار اُس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ قاسم بلڈنگ کے مالک کی طرف سے کھولیوں کا کرایہ وصول کرتا تھا۔ اور کوئی کچھ بھی کہے، مالک مکان کے انتخاب کی داد دینی پڑتی تھی جس قسم کے لوگ اُن کھولیوں میں رہتے تھے ان سے کرایہ وصول کرنا قاسم ہی کا کام تھا۔ قاسم نے آس پاس کی تین بلڈنگیں اپنے قبضے میں رکھی تھیں۔

قاسم نے پوچھا "کل پیسے ملے ؟"

قاسم جواب بھی جانتا تھا۔ پھر بھی چپ رہا ——— عشرت نے آہستہ سے سر ہلایا

"تین ہفتے ہو گئے کھولی کا کرایہ تم نے نہیں دیا۔ ایسے کیسے چلیگا ؟"

"آج جا رہا ہوں دادا شاید آج وہاں کام مل جائے"

"تین ہفتے سے تم یہی کہہ رہے ہو۔ تین ہفتے سے میں نے صبر کر رکھا ہے۔ کھانا اپنے پاس سے کھلایا ہے۔ کھولی کا بھاڑا نہیں لیا۔ مارفیا کہاں کہاں سے ڈھونڈھ کے لا رہا ہوں۔ اپنے بیٹے کی طرح رکھا ہے تمہیں۔ مگر تم نے ابھی تک کچھ کر کے نہیں دیا۔ میں تم سے کہتا ہوں۔ یہ کام دام کچھ نہیں ملے گا تمہیں۔ کب سے تمہیں سمجھا رہا ہوں میری ٹولی میں آجا۔ مزے کرے گا"

"بس دو تین دن اور دیکھنے دو"

قاسم نے اپنے شانے زور سے ہلائے۔ جیسے کہہ رہا ہو، سب بے سود ہے مگر یہ بھی کر کے دیکھ لو۔

"دادا انجکشن"

"نہیں ہے !"

"دادا مر جاؤں گا" عشرت گڑگڑانے لگا۔ اس نے قاسم کے گھٹنے پکڑ لئے۔ عشرت کی آنکھوں میں قطعی کوئی چمک نہ تھی۔ ایسی بے نوری ہو رہی تھیں۔

قاسم مسکرایا۔ بولا "ابے پاؤں کیوں پڑتا ہے۔ تیری زندگی لے کے آیا ہوں"

قاسم نے اسے انجکشن دیا۔ عشرت باہر چلا گیا۔

اس وقت چھیدی لال کے سامنے بیٹھے ہوئے عشرت چاہ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح آج اُسے کام مل جائے۔ کیسا بھی کام ؛ کوئی بھی کام۔ ورنہ اُسے قاسم کی شرط ماننا ہو گی۔ قاسم کی ٹولی میں شامل ہونا پڑے گا۔ اور قاسم کی ٹولی میں شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگلے دو تین ماہ میں اسے جیل جانا پڑے گا۔

کیوں کر قاسم نے اسے بتایا تھا کہ آدمی جرائم کی دنیا میں رہ کر اتنا ہوشیار نہیں ہوتا۔ پانچ سال تک آدمی باہر جرم کرتا رہے تو اسے اصلی گُر کا پتہ نہیں چلتا جب تک وہ جیل نہ جائے۔ جیل کے اندر ہی وہ تمام اسرار و رموز ایک ایک کر کے کھلتے ہیں جن پر گناہوں کی دنیا پلتی ہے۔ واں ایک سے ایک بڑا استاد رہتا ہے، جس نے ساری زندگی کی ریاضت سے یہ فن حاصل کیا ہے۔ اس لئے قاسم نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ جوں ہی کوئی نیا آدمی اس کی ٹولی میں شامل ہوتا، وہ اسے دو ایک ماہ میں جیل بھجوا دیتا۔ اور جیل بھجوانے میں ایک اور بات بھی تھی۔ جیل جا کے آدمی پھر اِدھر یا اُدھر کی نہیں سوچتا۔ وہ بس اِدھر ہی کا ہو جاتا ہے۔ اُس دنیا کے دروازے اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور اس دنیا کے نیچے جو دنیا بستی ہے اُس کے دروازے اس کے لئے کھُل جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جیل جا کے آدمی کی بے چین رُوح اطمینان حاصل کر لیتی ہے۔ اسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے عرفان دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو نیکی اور پاکیزگی سے آتا ہے۔ اور جس کی معراج جنت ہے۔ دوسرا وہ جو بدی اور غلاظت میں ڈوب جانے سے آتا ہے اور جس کی انتہا جہنم ہے۔ وہ لوگ جو شب و روز جہنم میں رہتے ہیں ان کے لئے آگ کے شعلے بچھوؤں کے ڈنک اور تپتے ہوئے لوہے کے داغ اور جلتے ہوئے گوشت کی بُو کچھ معنی نہیں رکھتی، وہ تو روز مرہ کی بات ہے۔ وہ لوگ جہنم سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے جنتی نہر کے کنارے ٹہل رہے ہوں۔ کم از کم قاسم کو دیکھ کر اس کے سکون اطمینان اور اس کے ضمیر کی مکمل تشفی کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا۔ ان چند سالوں میں عشرت کے ضمیر کی کھال بے حد موٹی، کھردری اور بے حس ہو گئی تھی۔ تو بھی کچھ باقی تھا، عشرت محسوس کرتا تھا کہ ابھی وہ وہاں تک نیچے نہیں اُترا۔ جہاں تک اسے گناہ کا عرفان حاصل کرنے کے لئے نیچے اُترنا چاہئے۔ بس ایک معمولی سی جھجک تھی۔ کہیں پر اس کے ضمیر کی موٹی کھال کے اندر کوئی چیز ابھی تک زندہ تھی۔ حرکت کرتی تھی کبھی کبھی اُسے پریشان کر دیتی تھی۔ وہ جب نیچے دیکھتا۔ تو اُسے گہرائی سے بڑا ڈر لگتا۔ جانے دُور نیچے اُس سانپوں کے بِل میں کیا ہو۔ نیچے جانے کی کشش بھی اس کے دل میں تھی کیونکہ اب اتنا نیچے آ چکا تھا کہ جب وہ اوپر دیکھتا تو روشنی اسے اتنی دُور اوپر نظر آتی جیسے وہ کسی گہرے کنویں میں

گر چکا ہو۔

عشرت۔ دو تین بار آہستہ سے کھانسا۔ پسینے کے تریڑے اُس کے ماتھے سے پھوٹنے لگے۔

عشرت نے جیب میں رومال ٹٹولا۔ رومال کہیں نہ ملا۔ اس نے کرتے کے آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھ لیا۔ اس حرکت سے اس کے زرد زرد گالوں پر سرخی چھا گئی۔

سیٹھ چھیدی لال بولے "آخری مرتبہ میں نے تمہیں راج کے ہاں ایک پارٹی میں دیکھا تھا۔ بہت عرصہ ہو گیا"

عشرت خاموش رہا۔

"تم بہت بدل گئے ہو"

عشرت۔ پھر بھی خاموش رہا۔

اُن دنوں راج نے تمہاری سفارش کی تھی کہ تمہیں میں اپنی تصویر میں ہیرو لے لوں مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی"

عشرت کھانسا۔

"یہ کھانسی بہت بُری ہوتی ہے۔ علاج کرو"

عشرت نے کہا "مجھے کام چاہئے"

"مجھے معلوم ہے" چھیدی لال نے بناوٹی ہمدردی سے کہا "مگر مصیبت یہ ہے کہ میری دونوں تصویریں ختم ہو رہی ہیں اُن میں تو کوئی کام نہیں ہے۔ پھر بھی ان تصویروں کے ختم ہونے، ایڈیٹ کرنے، سنسر کو دکھانے اور نئی تصویر شروع کرنے میں چھ ماہ تو ضرور لگیں گے"

عشرت نے ضد کرتے ہوئے کہا "مجھے آج کام چاہئے"

چھیدی لال ہنسا "کچھ نہیں سکتا۔ تم وہ کام کرو گے بھی۔ تم ہیرو بننا چاہتے تھے نا؟" چھیدی لال

نے چٹکی بجا کے اپنے جلتے ہوئے سگرٹ کی راکھ خاک دان میں گراتے ہوئے کہا " میں تمہیں ہیرو بنا سکتا ہوں"

عشرت حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سیٹھ چھیدی لال نے جانے اُس وقت راج کے کہنے پر مجھے ہیرو نہ بنایا۔ آج خود بخود کسی سفارش کے بغیر مجھے اس حالت میں ہیرو بنانے کے لئے تیار ہے۔ عشرت کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک آگئی۔ کیا واقعی چھیدی نے یہ کہا تھا۔ ایک لمحہ پہلے اس کے کان بج تو نہیں رہے تھے۔

چھیدی عشرت کی حیرت اور مسرت کا خاموشی سے لطف اٹھاتا رہا۔ پھر کہنے لگا " اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اپنی نئی فلم کا ہیرو بنانے کے لئے تیار ہوں"

" اُس فلم کا نام کیا ہے ؟"

" اسرارِ محبت۔ عرف کوکا کی کہانی "

چھیدی لال نے معنی خیز نگاہوں سے عشرت کی طرف دیکھا مگر عشرت کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

" اور ہیروئن کون ہوگی ؟" عشرت نے پوچھا۔

" ماہ پارا"

" ماہ پارا۔ مگر وہ تو اب تین چار سال سے کسی پکچر میں ہیروئن نہیں آئی "

" پیچھے جا پڑی ہے" چھیدی نے سر ہلا کے کہا " میں جانتا ہوں آج کل اس کے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ مگر میں اُسے بھی چانس دے رہا ہوں"

عشرت نے رک رک کر کہا " یہ ــــــ میں ــــــ یعنی کی ــــــ کیا ہوں ــــــ سیٹھ۔ تم آدمی نہیں فرشتے ہو"

چھیدی لال نے اپنی انگلیوں پر پنسل نچاتے ہوئے کہا " تم اپنے سامنے کسی فرشتے کو نہیں دیکھ رہے ایک بزنس مین کو دیکھ رہے ہو"

عشرت نے سوالیہ نگاہوں سے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ سیٹھ چھیدی لال نے ذرا آگے جھک کے کہا "یہ ایک بلو فلم ہوگی"

"بلو فلم ؟"

"ہاں سب کپڑے اُتار کے کام کرنا پڑے گا۔ اور جو کام جس طرح سے کہوں گا اُسی طرح سے کرنا پڑے گا۔ پنڈت کوکا کا کوک شاستر زندہ کردوں گا اس فلم میں"

جیسے بجلی کی رَو نے عشرت کو چھو لیا ہو۔ وہ چونکا۔ اس نے زور سے کرسی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ چند لمحوں کے لئے کرسی، میز، آس پاس کی دیواریں، تصویریں، چہرے سب اس کی نظروں میں گھوم گئے۔ اُلٹے سیدھے ہوگئے۔ اُسے سمت کا۔ زاویے کا۔ وقت کا جگہ کا کوئی احساس نہ رہا۔ اسے اپنے گلے میں کوئی چیز پھنسی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ بالکل خشک سے ہوگئے۔ جیسے کسی نے ان کا سارا خون چوس لیا ہو۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرنی چاہی مگر اس کے حلق میں کوئی لعاب نہ تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہونٹوں پر زبان نہیں کوئی سُوکھا سا برش پھیر رہا ہو "آپ کا مطلب ہے کہ ــــ کہ ــــ" عشرت اپنا فقرہ پورا نہ کرسکا۔

"ہاں ہاں۔ بالکل ننگی فلم۔ ارے ان دوسری فلموں میں کیا رکھا ہے۔ چار لاکھ خرچ کرو۔ کوئی بھروسہ نہیں پاس ہو فیل ہو۔ مگر بلو فلم کوئی فیل نہیں ہوتی۔ اس میں سیٹھ بھی کماتے ہیں۔ آرٹسٹ بھی۔ یہاں اپنے تمام شرنٹ اور کالبا دیوی روڈ پر بہت سے اپنے بھائی بند ہیں جو پانچ پانچ ہزار میں ایک فلم کا پرنٹ اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ پھر دوسرے شہروں کے بڑے بڑے سیٹھ ہیں۔ دولت مند لوگ ہیں۔ راجے مہاراجے تو بے چارے ختم ہوگئے۔ ورنہ جناب پچاس پچاس ہزار میں نے ایک راجہ سے ایک بلو فلم کے پرنٹ کا لیا ہے۔ اب بھی پرانے حکمرانوں میں دس بارہ اپنے مستقل گاہک تو ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں عشرت بلو فلم ایسا سودا پوری فلم انڈسٹری میں کہیں نہیں ہے۔ اور اب تو معمولی معمولی لوگوں میں بھی اس کے گاہک پیدا

ہو گئے ہیں۔ میں دلالوں کو پروڈیوسر اور فلم کمیشن پر دیتا ہوں۔ سارے بمبئی میں وہ لوگ ادھر سے اُدھر گھومتے ہیں اور جہاں کوئی مخصوص جگہ دیکھی وہاں فلم چلا کے دکھاتے ہیں۔ ارے میری کتنی بلو فلمیں سلور جوبلی تو کیا گولڈن جوبلیاں منا چکی ہیں"

"مگر؟" عشرت کچھ کہنے والا تھا کہ چھیدی لال نے اس کی بات کاٹ کے وہیں پر کہہ دیا "اگر مگر کیا۔ بات تو وہی ہے جو دوسری فلموں میں کی جاتی ہے۔ وہ لوگ اسے کپڑے پہنا کر نگاہوں میں چھپا کر طرح طرح کے ڈانس، گیت اور مکالموں میں گھما پھرا کے کہتے ہیں اور بارہ ہزار فٹ میں کہتے ہیں۔ میں ایک ہزار فٹ میں یا دو ہزار فٹ میں کہتا ہوں۔ اور کپڑے اتار کے صاف صاف کہتا ہوں کوئی لگی لپٹی نہیں۔ بولو منظور ہے؟"

عشرت اپنی چھنگلیا کا ناخن اپنے دانتوں سے کاٹنے لگا۔ پھر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے سیٹھ چھیدی لال سے پوچھا "اور ماہ پارا؟"

چھیدی لال ہنسا۔ بولا "تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ بے چاری پچھلے تین چار سال سے جو بے کار ہے تو کیسے اب تک زندہ ہے۔ وہ برابر میری بلو فلموں میں کام کرتی ہے۔ ارے جواب نہیں ہے اس کے آرٹ کا"

"آرٹ؟" عشرت نے اپنے دل ہی دل میں سوچا۔

چھیدی لال نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "مجھے تھوڑی دیر میں سیٹھ کرتر چند کے ہاں جانا ہے۔ اگر تم کو منظور ہو بول دیو۔ اپنا ایڈوانس بھی لے جاؤ۔ ایک ہزار روپیہ دوں گا۔ پانچ دن کی شوٹنگ ہے۔ سو روپیہ ابھی ایڈوانس لے جاؤ۔ کل سے حاضر ہو جاؤ۔ ایک ہفتہ میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ جاہل لے جاؤ کہ بعد مرے جاؤں۔ تم بول نہیں سکتا۔ میں کسی کا بھروسہ نہیں کر سکتا ہوں اس بات میں۔ تم کو چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ سارا یونٹ۔ تم۔ میں۔ ماہ پارا۔ کیمرہ مین۔ اس کا اسسٹنٹ سب لوگ اکٹھے رہیں گے۔

سات دن تک کوئی آدمی اپنے گھر نہیں جا سکتا۔ کسی کو میری اجازت کے بغیر ٹیلی فون نہیں کر سکتا۔ خط نہیں لکھ سکتا۔ ایک ہزار روپیہ دوں گا۔ سو روپیہ ایڈوانس ابھی لے جاؤ۔ منظور ہے ؟"

عشرت نے ایڈوانس کے لئے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا " منظور ہے "

سیٹھ نے گھنٹی بجائی۔ ایک چپراسی اندر آیا۔ سیٹھ نے چپراسی کو کہا " خزانچی کو اندر بھیج دے " خزانچی اندر آیا۔ سیٹھ نے کہا " عشرت کو ایک سو روپیہ ایڈوانس دے دو۔ اور رسید پر دستخط لے لو "

" کس حساب میں ؟ "

" بچوں کی اخلاقی تربیت کی ڈاکومینٹری جو بن رہی ہے اس کے حساب میں "

جب خزانچی چلا گیا تو عشرت حیرت سے سیٹھ کا مونہہ دیکھنے لگا۔ سیٹھ نے ہنس کر کہا۔ ارے بھائی۔ فلم بناتا ہوں۔ تمہیں پیسے دیتا ہوں تو اس کا کہیں حساب بھی رکھوں گا کہ نہیں ؟ سو آج کل ایک ڈاکومنٹری سٹروع کر رکھی ہے " بچوں کی اخلاقی تربیت "۔ دو ایک شاٹ اس میں بھی تمہارے ہو جاتیں گے، مگر وہ بکے گی نہیں۔ گورنمنٹ تو آج کل اپنی ڈاکومنٹریاں بناتی ہے۔ وہ میری ڈاکومنٹری کہاں سے خریدے گی۔ میں تو سبھی حساب رکھنے کے لئے کاٹ پیٹ کے کسی طرح وہ ڈاکومنٹری مکمل کر دوں گا۔ اور اِس " بلو فلم " کا سارا خرچہ اُس پر ڈال دوں گا۔ ارے کیا کریں عشرت بھائی۔ آج کل سیدھے دھندے کا زمانہ ہی نہیں رہا "

" بچوں کی اخلاقی تربیت ! "

" اسرار محبت عرف کوکا کی کہانی "

عشرت جب چھیدی لال کے دفتر سے باہر نکلا تو ان دونوں عنوانوں کا خفتہ طنز اس کے ذہن میں بیدار ہوا مگر اس کی جیب میں سو کا نوٹ بھی تھا اور اس سو کے نوٹ کا مطلب تھا۔ روٹی۔ کھولی کا کرایہ مارفیا ـــ شراب اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ قاسم کے پنجے سے بچ جائے گا۔ ایک ہزار روپیہ ! ارے وہ اس میں سے پانچ سو اپنی اماں کو رتیس گنج میں بھیج سکتا ہے۔

رات کو جب قاسم اس کے پاس آیا تو عشرت نے پچھتر روپے نکال کے اسے دے دیئے اپنے پاس صرف پچیس رکھے۔ قاسم بڑا حیران ہوا۔ جب عشرت نے اسے بتایا کہ اُسے ایک فلم میں کام مل گیا ہے، وہ بہت حیران ہوا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ نوٹ لے کر خاموشی سے چلا گیا۔

عشرت نے اپنی جھلنگی چارپائی پر لیٹ کر اپنی بہن کا خط شاید بیسویں مرتبہ پڑھا:

پیارے بھیا!

تمہیں بمبئی گئے ہوئے یہ تیسرا سال جا رہا ہے۔ اماں بہت پریشان رہتی ہیں۔ کیا تم سچ مچ رئیس گنج نہیں لوٹو گے؟ ایک بار بھی اپنی اماں اور اپنی چھوٹی بہن اور بھائیوں کو دیکھنے کے لئے نہیں آؤ گے۔ یہاں میں نے سب سے کہہ رکھا ہے کہ تم فلم میں ہیرو کا کام کر رہے ہو۔ مگر تین سال سے اب تک تمہاری کوئی فلم رئیس گنج میں نہیں آئی۔ اس لئے میری سہیلیاں اب مجھ سے مذاق کرتی ہیں۔ وہ نہیں سمجھتیں کہ تم واقعی کسی فلم میں ہیرو کا کام کر رہے ہو۔ سچ بتا دو نا بھیا۔ تم کس فلم میں ہیرو کا کام کر رہے ہو۔ وہ فلم رئیس گنج میں کب آئے گی؟ تمہیں دیکھے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب تو اگر میں تمہیں فلم میں دیکھ لوں تو دیکھتے ہی رو پڑوں گی۔ جلدی بتا۔ اچھے بھیا۔ تمہاری فلم کب مکمل ہو گی۔ ہمارے رئیس گنج میں کب آئے گی؟ اس فلم کا نام کیا ہے۔ میں اپنی ساری سہیلیوں کو لے کر اُسے دیکھنے جاؤں گی۔ اور وہ جو خاں صاحب . . . .

مگر عشرت آگے نہ پڑھ سکا۔ ایک زور کا کھوکھلا قہقہہ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ عشرت۔ ہیرو——

ایک بڑی فلم کا!

پھر یکایک آنسو تیزی سے اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے اور اس نے اپنی بہن کے خط سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور چارپائی پر اوندھا ہو کے گر گیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔

دوسرے دن شام کے جھٹ پٹے میں کماٹھی پورہ پولیس لائن کے پیچھے ناریل کے جھنڈوں میں جب قاسم اپنے گرگوں سے سٹے کا حساب لے رہا تھا اور رقمیں وصول کر رہا تھا۔ کسی نے اس کے شانے

پر ہاتھ رکھا۔ قاسم نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ یہ عشرت تھا۔ مگر قاسم اس عشرت کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ عشرت کے چہرے پر خون کا ایک قطرہ نہ تھا۔ وہ ایک مُردہ لاش کا چہرہ تھا۔ آنکھوں میں کوئی چمک نہ تھی۔ اور جب عشرت بولا تو ایسے بولا گویا کنوئیں میں سے بول رہا ہو۔

"کیا ہے ؟" قاسم نے ذرا دُرشتی سے کہا۔

عشرت نے کہا "دادا میں تمہارے ساتھ کام کروں گا۔ جو بھی تم دو گے کروں گا"

قاسم اندر سے تو بہت خوش ہوا مگر اوپر سے اس نے وہ درشت لہجہ اختیار کئے رکھا۔ بولا "کیا ہوا وہاں جہاں کام ملا تھا۔ مالک کو کام پسند نہیں آیا ؟"

"نہیں" عشرت کے ہونٹ کانپنے لگے "کام ـــــ میں ـــــ وہ کام کر نہیں سکا"

"ارے بے وقوف کہیں کے۔ کام کرنے سے آتا ہے۔ ایک دو بار کوشش کی ہوتی"

"بہت کوشش کی دادا۔ مگر مجھ سے ہو نہیں ہو سکا۔ سیٹھ نے ناکارہ سمجھ کر مجھے نکال دیا۔ بہت خفا تھا سیٹھ۔ کہتا تھا میرا ایک دن کیا برباد ہوا۔ ہزاروں کا نقصان ہو گیا۔ اُس کے آدمیوں نے مجھے دھکے دے کے نکال دیا" عشرت کے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ جہنم کا سا منظر تھا۔ تاریکی میں کھویا ہوا۔ تاریکی کے اندر شعلے کی طرح بھڑکتا ہوا۔ زہر کی سانس لیتا ہوا۔ وہ اُسے بھول جانا چاہتا تھا۔ رُوح کے پردے پر سے ہمیشہ کے لئے غائب رونا چاہتا لیکن وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر بار آ جاتا تھا۔ بار بار مٹانے سے بھی آ جاتا تھا۔ اُسے وہ بھی بُھول نہیں سکتا تھا۔ جیسے کسی نے دہکتے ہوئے لوہے کی گرم سلاخ سے اس کی رُوح پر وہ منظر کھینچ دیا ہو۔ وہ جانتا تھا۔ وہ زندگی بھر اُسے کبھی نہیں بُھول سکے گا۔

اور پھر وہ ہنسی۔ بے شرم۔ بے باک۔ بے حیا عورت کی ننگی ہنسی۔ بار بار اس کے جسم پر کوڑے لگا رہی تھی۔ شراب۔ بھنگ۔ چرس۔ مارفیا۔ متعدی امراض کے کلبلاتے ہوئے کیڑوں کا کھایا ہوا کھوکھلا جسم۔ دُنیا والوں نے اُس کی ہڈی کا آخری گوشت بھی کھا لیا تھا۔

یکایک انہوں نے مجھے باہر پھینک دیا۔ ایک نچڑے ہوئے لیمو کی طرح! آے خدا!
بھول جاؤ عشرت۔ اُسے بھول جاؤ۔
عشرت نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور لڑکھڑا کر قاسم کے قدموں میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ایک رات کو کھانا کھانے کے بعد چبوترے پر بیٹھے ہوئے اکرم اور دھوے کے درمیان بڑے زور کی بحث چل پڑی۔ بحث بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی پر ختم ہوتی اگر جسونت، من جیت سنگھ، فضل اور دوسرے لوگ آپس میں بیچ بچاؤ نہ کرتے۔ بحث ہندوستانی فلموں کے بارے میں ہو رہی تھی اور خاص کر ترقی پسند فلموں کے بارے میں جن کے متعلق دھوے اپنا مخصوص نقطۂ نظر رکھتا تھا۔ اور اکرم جن کی ناکامیابی سے جلایا ہوا تھا۔ اکرم کی ترقی پسند فلموں کے بارے میں کچھ کہنا گویا بھڑ کے چھتے کو چھیڑنا تھا۔ اکثر اوقات وہ بحث میں تناسب اور توازن دونوں کھو بیٹھتا تھا۔

دھوے نے کہا "مجھے تم لوگوں کی تصویروں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ سب کی سب اُداسی اور یاسیت پرست ہوتی ہیں۔ تمہاری تصویروں کا مزدور ہے تو اس قدر پِسا ہوا، گھٹا ہوا۔ ظلم و ستم کا مارا ہوا کہ کبھی ہنستا ہی نہیں۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ سچ نہیں ہے۔ یہ حقیقت نگاری کے خلاف ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم پر بہت ظلم و ستم ہوتے ہیں۔ ہوتے ہیں۔ مگر ہم اس قدر اداس اور روتے بسورتے ہوئے لوگ نہیں ہیں جس قدر تم ہمیں فلموں میں دکھاتے ہو۔ ہم ظلم کا جواب اپنی بھرپور مدافعت سے دیتے ہیں ہماری جدوجہد بہت ہی سخت ہے" کی ہے۔ مگر ہماری زندگی میں ہر روز چند ایک لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب سورج چمکتا ہے اور شبنم کے قطرے مسکراتے ہیں جب محبت کی نگاہ ہم پر جادو سا کر دیتی ہے جب ہم گیت گاتے ہیں

اور ہمارے بچے خوشی سے دُھومیں مچاتے ہیں۔ تم اُن لمحوں کو کیوں بھول جاتے ہو؟"

اکرم نے کہا "اُن لمحوں کی موجودگی سے میں انکار نہیں کرتا۔ غریب لوگوں کی زندگی میں ایسے لمحے ضرور آتے ہیں۔ مگر یہ لمحے بڑے مختصر ہوتے ہیں۔ جو غالب حقیقت ہے وہ غریبی اُداسی اور ایک تنگ و تاریک ماحول کی ہے۔ اور غالب حقیقت کو بڑا کر کے دکھانا ہمارا فرض ہے"

دھومے نے کہا "تمہارا سب سے پہلا فرض ہے کہ تم ایسی تصویریں بناؤ جو ہم دلچسپی سے دیکھ سکیں۔ تمہاری فلمیں دلچسپ نہیں رہتیں۔ وہ سوکھے ہوئے آلوؤں کی طرح خشک ہوتی ہیں۔ سالی یہ بھی کوئی تصویر ہے۔ ہیروئن دیکھو تو لباس تار تار شکل ایسی کہ دیکھ کر اُبکائی آئے۔ ہیرو دیکھو تو یکہ مارکہ بیڑی کا ٹریڈ مارک۔ جہاں موقع ملے نہ ملے تقریر جھاڑ دیتا ہے۔ ارے بھائی ہم سنیما میں تقریر سننے نہیں جاتے۔ تقریریں بھی بہت سنتے ہیں۔ کامگار میدان میں ہمارے ٹریڈ یونین کے لیڈر ہیں غریبی کے متعلق تم سے زیادہ اعداد و شمار بتا سکتے ہیں۔ مگر ہم سنیما میں اعداد و شمار دیکھنے نہیں جاتے۔ دن بھر کے تھکے ہارے۔ کام اور وہ بھی اس گندے ماحول میں جاں گسل کام کرنے کے بعد جب ہم سنیما میں جاتے ہیں تو کوئی ایسی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں جس سے ہمارے تنے ہوئے اعصاب کو سکون پہنچے۔ آنکھوں میں طراوت آئے۔ دل کچھ اس طرف مائل ہو کہ یہ دنیا اپنی تمام سختیوں اور محرومیوں کے باوجود اتنی بُری جگہ نہیں ہے کہ فوراً سنیما ہال سے نکل کر خودکشی ہی کر لی جائے۔ ارے میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ تمہاری بہت سی تصویروں کو دیکھ کر واقعی بخیال ہوتا ہے کہ یہ دنیا اتنی بُری ہے۔ حالات اس قدر پریشان کن ہیں۔ مخالف قوتوں کا دباؤ اس قدر شدید ہے کہ خودکشی کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں اکرم بھائی۔ تم لوگوں کی تصویر داکثر میں آدھی دیکھ کے اُٹھ آتا ہوں"

اکرم کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کے نتھنے دو تین بار تیزی سے کانپے۔ اور اسے اپنا خون تیزی سے کنپٹیوں کی طرف جاتا ہوا معلوم ہوا۔ "میں تمہارے مونہہ سے ایک پڑھے لکھے باشعور مزدور سے ایسی

باتیں سُن رہا ہوں۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اُس کا تو یہ مطلب ہوا کہ زندگی کے تلخ حقائق سے مونہہ موڑ کر دلچسپ تصویریں بنائیں۔ یعنی ایسی دل چسپ تصویریں جن سے تمہارے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون ملے۔ تمہارا فلسفہ ہالی وڈ کی تصویروں کا فلسفہ ہے"

دھومے نے غصّے سے کہا "تم میری بات نہیں سمجھے ہو"

مگر اکرم نے ٹوک کے کہا " میں خوب سمجھتا ہوں یہ دل چسپی کا فلسفہ۔ سکون اور اطمینان کا فلسفہ فرار کا فلسفہ ہے جو زندگی کی غالب حقیقت ہے اُس سے مونہہ موڑ لو۔ جنسی کہانیاں بہم پہنچاؤ یا مار دھاڑ کی تصویریں بناؤ۔ جنسی ترغیب دینے والے ناچ گانے رکھو۔ وہ آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں یا محض تخیئلی فینٹاسی بناؤ۔ الٰہ دین کا بیٹا، بغداد کا درزی۔ شاہی حرم۔ کنواری کنیز۔ ایسی زندگی جو خود آج کے عرب ملکوں میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کی عکاسی کر کے دوسرے ملکوں کے کلچر کی بے عزتی کر کے اپنی جیبیں بھرو۔ تم کیا ـــــــ"

دھومے بیچ میں بول اٹھا "تم بات کو سمجھتے نہیں۔ بیچ میں بکواس کرنے لگے . . . . "

" بکواس تم کرتے ہو" اکرم نے جواب دیا۔

دھومے کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے سُرخ ہو گئیں۔ پھر وہ غصّے کو پی گیا۔ پھر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ وہ آہستہ سے بولا " اکرم بھائی یہ بکواس نہیں ہے۔ تم صرف اپنے کتابی ذوق کے بل بوتے پر۔ اپنے کتابی علم کے زور پر تصویریں بناتے ہو اور اس لئے ناکام رہتے ہو۔ کس لئے تمہاری اور تمہارے دوسرے ساتھیوں کی تصویریں ناکام رہیں۔ کبھی تم نے اس کے بارے میں سوچا یا جو تم نے دماغ میں اپنی ناکامی کی جو تصویری گھڑ رکھی ہے۔ جس میں تم لوگ اپنے آپ کو ترقی پسندی کا شہید سمجھتے ہو۔ اس سے الگ ہٹ کر سوچنے کے لئے تم بالکل تیار نہیں ہو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں تم شہید نہیں ہو۔ معاف فرمائیے گا آپ لوگ شہید نہیں ہیں۔ اپنے تمام علم کے باوجود آپ جاہل ہیں اور میں یہ ثابت کر سکتا ہوں "

دموسے نے اپنی بائیں ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کا مکا مار کے کہا اور پھر فتح مندنگاہوں سے فضل، من جیت سنگھ بابو رام اور دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

"ثابت کرو" اکرم بولا۔

"کرتا ہوں۔ مگر پہلے میں تم سے ایک سوال کرلوں۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ جنس میں کیا بُری چیز ہے۔ ایک مرد۔ ایک عورت۔ جوان بالغ۔ زندگی میں پہلی بار محبت سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اس میں کیا بُری بات ہے۔ کیوں یہ ایک اچھی فلم کا افسانہ نہیں بن سکتا۔ ناچ اور گانے کے تم سب لوگ اس قدر خلاف نظر آتے ہو۔ تم سب لوگ اسی بات پر مُصر نظر آتے ہو کہ ایسی تصویر بنائی جائے جس میں کم سے کم ناچ اور گانے ہوں بلکہ اگر بالکل ہی نہ ہوں تو وہ سب سے زیادہ ترقی پسند فلم ہوگی۔ سیٹ جتنے بُرے ہوں گے، کپڑے جتنے پھٹے پُرانے ہوں گے، رونا دھونا جتنا زیادہ ہوگا۔ مناظر جتنے تاریک ہوں گے اتنی ہی زیادہ وہ ترقی پسند فلم ہوگی اور حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی جائے گی۔ تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ میں تم سے پوچھ سکتا ہوں ناچ اور گانوں میں کیا بُرائی ہے۔ ہمارے کلچر کا ایک شاندار ورثہ ہیں، یہ پُرانے لوک ناچ اور سنگیت۔ تم ان فنونِ لطیفہ سے ہمارے لوگوں کو اپنی فلموں میں اُن سے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہو۔ لوک ناچ سارے کے سارے جنس سے متعلق نہیں ہیں۔ لیکن کچھ ہیں بھی تو اس میں کیا بُرائی ہے۔ کیا آدمی اور عورت کی محبت۔ کیا جنس کی محرومی یا اس کی نشاط آمیز کیفیت ایک ناچ میں ظاہر نہیں کی جاسکتی یہ کس قسم کی ترقی پسندی ہے۔ تم کہنا چاہتے ہو یہی ناکہ ہندوستان کے مزدور اور کسان اس قدر پسے ہوئے اور گھٹے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی میں روٹی کی جدوجہد اس قدر شدید ہے کہ انہیں ہنسنے کے لئے اور ناچ اور گانے سے حظ اٹھانے کے لئے نہ تو ان کے پاس وقت ہے اور نہ ان کے پاس اس کا سلیقہ ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور تم پر بہتان ہیں۔ اس لئے تمہاری تصویریں ہماری ہمدردی حاصل کرنے میں اکثر ناکام رہتی ہیں"

اکرم نے کہا" تم پر اور تمہاری طرح تصویریں دیکھنے والوں کے اندر ہزاروں گندی تصویروں کا زہر سرایت کر چکا ہے۔ جو حقیقت ہم اپنی تصویروں میں بیان کرتے ہیں وہ بے حد تلخ ہے۔ تم لوگ اُسے گوارہ نہیں کرتے۔ مگر ایک وقت آئے گا"

"کب وہ وقت آئے گا" دھومے نے چلا کے کہا" اگر تم آج کے مسائل کو لیتے ہو تو آج کے لوگوں کو ان میں سب سے زیادہ دلچسپی ہونی چاہئے۔ جب یہ مسائل ختم ہو جائیں گے تو آنے والی نسلوں کو ان میں صرف تاریخی دلچسپی رہ جائے گی۔ گریہ غریبی۔ یہ بے کاری۔ معاشی پریشانی تو آج کے حقائق ہیں جن میں آج کے زمانے کے لوگوں کو گہری دلچسپی ہونی چاہئے۔ پھر وہ کیوں تمہاری فلمیں نہیں دیکھتے۔ کیوں وہ دوسری فلموں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ معاملہ بالکل صاف ہے۔ تم ان فلموں کو میعم فن کاری سے نہیں پیش کرتے۔ اس لئے وہ غیر دلچسپ اور خشک رہتی ہیں"

"روس، امریکہ، یورپ کے بہت سے ملکوں میں اس طرح کی تصویریں تیار ہوتی ہیں" جسونت نے بحث میں حصہ لے کر کہا۔

"دوسرے ملکوں کی نقل میں بمبئی پر تہمت مت دھرو۔ روس میں امریکہ میں برطانیہ میں اٹلی میں لوگوں کی دلچسپی کے لئے اور بہت سے سامان ہیں۔ روس میں تھیٹر اور بیلے بہت ترقی یافتہ حالت میں ہیں۔ پھر اُن ملکوں میں ٹیلی ویژن ہے۔ میوزک ہال ہیں۔ اوپیرا ہاؤس ہیں۔ گشتی تھیٹر ہیں۔ سنگیت اور ناچ کی پارٹیاں ہیں جو مکانات اور دیہاتوں میں جا جا کے وہاں کے لوگوں کے فن اور ذوق کی تسکین کرتی ہیں۔ یہاں پر کیا ہے؟ نہ تھیٹر۔ نہ ٹیلی ویژن۔ نہ سنگیت پارٹی۔ نہ ناچ کا انتظام لے دے کے محدود طریقے پر ایک سنیما گیا ہے جس میں دس آنے خرچ کر کے عوام جا سکتے ہیں۔ اس لئے دس آنوں میں اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ ناچ بھی دیکھ لیں۔ گانے بھی سن لیں۔ زندگی کے تلخ تجربوں کے ساتھ تھوڑا سا رومانس ہو لیں۔ تھوڑا سا سنس بھی لیں۔ مگر وہاں تمام باتوں کو ایک ہی فلم میں پیدا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے

ہیں تو ان کی یہ خواہش فطری ہے اور ہمارے مخصوص قومی حالات کا نتیجہ ہے زندگی ساری کی ساری المیہ ہی تو نہیں "

" وہ ساری کی ساری نشاطیہ بھی تو نہیں " اکرم چلّایا۔

"ٹھیک ہے۔ زندگی شاید ایک مسرت ناک المیہ ہے یا الم ناک نشاطیہ ہے۔ زندگی کے ڈرامے کے یہ دونوں عناصر ایک دوسرے میں اس طرح گُھلے ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔ میرا یہاں کہنے کا یہ مطلب ہے کہ ہمارا ہندوستان فلموں کا فارمولا جسے تم اس قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہو ذرا اس پر سوچو اور غور کرو تو ہمیں ممکن ہے اس میں کچھ تاریخی مجبوریوں کے پہلو نظر آئیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تم لوگ سونی صدی اسی کی نقل کرو۔ ہاں تم اُسے استعمال کر سکتے ہو۔ اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ کے لئے! اس سے تمہارا فن زیادہ دل چسپ ہو جائے گا۔ عوام کے زیادہ قریب آجائے گا۔ چیزوں۔ رشتوں۔ زندگیوں کے بارے میں کتابی علم بہت مفید ہوتا ہے۔ لیکن سونی صدی ایک مخصوص کتابی نقطۂ نگاہ سے ہی ہمیشہ کسی ایک چیز کو دیکھے جانا اور جب وہ ناکام ہو جائے تو اس کی خامیوں پر غور نہ کرنا۔ اُن خامیوں کے اسباب پر نظر نہ ڈال کر اپنی ہٹ پر قائم رہنا میں سمجھتا ہوں قطعاً دانش مندی نہیں ہے۔ ہندوستان میں فلم کا فن باہر سے آیا ہے۔ میں مانتا ہوں لیکن یہاں اس کی پرورش اس کی ترقی بالکل اُسی انداز میں نہیں ہوگی جیسے روس یا امریکہ یا برطانیہ یا فرانس میں ہو رہی ہے۔ اس کی جڑیں ہندوستانی ہوں "

دھومے نے سر ہلا کے کہا " بس بالکل یہی بات میں کہنا چاہ رہا تھا لیکن میں ٹھیک طریقے سے نہیں کہہ سکا میں دراصل مزاج کا بہت تیز ہوں۔ اور ـــــــ کبھی کبھی ـــــــ الفاظ ـــــــ تم جانتے ہو میں اتنا پڑھا لکھا بھی نہیں ہوں۔ زبان سے لڑھک سے جاتے ہیں۔ بُرا مت ماننا " دھومے نے اکرم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اکرم نے مسکرا کے دھومے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ زور سے مصافحہ ہوا۔ پھر سب لوگ کھلکھلا کے ہنس

پڑے اور بحث ختم ہو گئی۔

اور سب کے لئے تو بحث ختم ہو گئی تھی لیکن دو آدمیوں کے لئے یہ بحث ختم نہ ہوئی تھی۔ رات کے سناٹے میں جب سب سو گئے تو اکرم دیر تک جاگتا رہا اور اس بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ موضوع کے انتخاب اور زاویۂ نگاہ کی سچائی میں اس کے ہاں اور اس کی طرح سوچنے والے دوسرے دوستوں میں کوئی کمی نہ تھی اگر کوئی کمی تھی تو یہی کہ وہ لوگ اپنے جوش میں یا تجربے کی کمی کے باعث یا دونوں باتوں کی وجہ سے جو وہ کہنا چاہتے تھے اُسے صحیح فن کاری سے کہہ نہیں پاتے۔ وحیدہ اور جسونت نے آج جو باتیں کہیں اُن میں بہت سچائی تھی۔ ہر ملک کے اپنے مخصوص حالات ہوتے ہیں اس کی اپنی کلچری ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اس کے فنون لطیفہ کی ایک مخصوص قومی ہیئت ہوتی ہے۔ ایسی چیز جو دوسرے ملکوں یا قوموں سے مستعار لی جاتی ہے اُسے بھی دوسرے ملک میں جا کر وہاں کی زندگی میں اپنی جڑ پکڑنا پڑتی ہے۔ ورنہ وہ مُرجھا جائے گی۔ اکرم کی ناکام نظموں کی طرح ـــــــ! اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اکرم نے محسوس کیا۔ میں نے بہت شدید غلطیاں کی ہیں۔

اکرم دیر تک یوں ہی سوچتا رہا اور بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک اور آدمی بھی برابر جاگ رہا ہے۔ وہ بھی اس کی طرح سویا نہیں۔ اسی بحث کے مختلف پہلوؤں پر وہ بھی غور کرتا رہا ہے۔ وہ ستیہ رائے تھا۔ . . . اکرم کو بڑی حیرانی ہوئی۔ جب ستیہ رائے نے اس کا نام لے کر پوچھا۔ کیوں کہ اس پوری بحث میں ستیہ رائے نے اب تک کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔

" اکرم ؟ "

" ہاں "

" جاگ رہے ہو ؟ "

" ہاں

" اس بحث کے متعلق میں ایک بات سوچ رہا تھا "

" کیا ؟ "

ستیہ رائے کروٹ بدل کے اکرم کے قریب ہو گیا۔ سرگوشی میں بولا تاکہ دوسرے سونے والے جاگ نہ جائیں۔ " مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تمہاری فلموں میں یا جس طرح کی فلمیں تمہارے دوست بناتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ذہنی دلچسپی تو نہیں۔ مگر کمرشل اعتبار سے جب فلمیں ناکام ہونے لگیں تو ایک بے چارہ بروکر دلال کیا کرے گا "

" درست ہے " اکرم بولا۔

" مگر ـــــــ " ستیہ رائے نے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا " مگر آج کی بحث سے میرا ایسا خیال ہوتا ہے کہ اگر۔ میرا مطلب ہے۔ ٹھیک طریقے سے۔ جیسا کہ دھوپے اور حبونت کہتے ہیں۔ ٹھیک طریقے سے ان باتوں کو رکھا جائے۔ ایک فلم میں تو بھائی ممکن ہے وہ فلم کامیاب ہو جائے۔ چانس زیادہ ہے "

اکرم چپ رہا۔

ستیہ رائے بولا " کیا کہتے ہو "

" اوں۔ اُم " اکرم نے جواب دیا۔

ستیہ رائے آہستہ سے ہنسا " ہار نہیں ماننا چاہتے۔ خیر ٹھیک ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کہ تم اور ہم مل کے ایک تصویر بنائیں۔ ایسی ہی۔ اُن نئے خیالوں کو اسی طریقے سے پیش کریں؟ کیا خیال ہے ؟ "

اکرم نے کہا " کل کی روٹی کا تو کچھ پتہ نہیں تصویر بنانے چلے ہیں "

ستیہ رائے نے کہا " بیٹا۔ تم ستیہ رائے کو نہیں جانتے۔ بنگالی بیس کا ئستھ۔ دنیا کو ہلا دوں گا۔ ایک ہفتے میں دو ٹیری ٹوری (فلمی علاقے) بیچ دوں گا۔ اور دو سیز کی ٹیری ٹری (سمندر پار کے علاقے) تو یوں چٹکی بجاتے جائے گا۔ اور اس کے بعد بنگال۔ بنگال میں امرندر گھوش ڈسٹری بیوٹر میرا اپنا دوست ہے۔

جب وہ ٹیری ٹوریاں بک گئیں تو پھر فنانس حاصل کرنا کیا مشکل ہے۔ رکھا۔ باندھا۔ تانا۔ کھینچا اور کھینچ کے چھوڑ دیا کہ جاؤ بیٹا لگے رہو"

اپنی اسکیم سرگوشی میں بیان کرتے کرتے ستیہ رائے اس قدر جوش میں آگیا کہ اس نے آخری فقرہ بالکل چلا کے کہا۔ اُس کی پاٹ دار آواز سن کے چبوترے پر سوئے ہوئے دوسرے ساتھی بلکہ آس پاس کے بہت سے لوگ جاگ گئے اور چوں چوں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مگر اکرم نے ہنس کر سب کو بتا دیا کہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ ستیہ رائے خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔

"دیکھتے جاؤ۔ میں بڑبڑا نہیں رہا ہوں۔ ایک روز میرا یہ خواب ضرور پورا ہوگا" ستیہ رائے نے کمال یقین کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اور واقعی مشکل سے ایک ماہ گزرا ہوگا کہ ستیہ رائے اپنی تصویر کی دو ٹیری ٹوریاں بیچنے میں کامیاب ہوگیا۔ جیسا اس نے وعدہ کیا تھا۔ ایک تو اودھ سیز اور دوسری بنگال کی ٹیری ٹوری اس نے بیچ دی اور کانٹریکٹ لا کے اکرم کو دکھایا۔ اس کانٹریکٹ میں تصویر کا نام تھا "طوفان" اور اس کا ڈائرکٹر اکرم تھا۔

اکرم بولا "مگر تم نے مجھے بتایا نہیں اور فلم کا نام رکھ دیا 'طوفان' طوفان کی کہانی کیا ہوگی"

"اب میں کیا جانوں" ستیہ رائے نے بڑی صفائی سے کہا "اب کہانی تم بتاؤ۔ ڈسٹری بیوٹر کہانی کا نام پوچھتا تھا۔ نام بتلائے بغیر کانٹریکٹ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے فلم کمپنی کا نام بھی دینا پڑا۔ میں نے اپنا نام دے دیا۔ ستیہ رائے پروڈکشن نمبر ا"

"اور کمپنی کا پتہ ؟"

"معرفت فٹ پاتھ بمبئی۔ فی الحال تو یہی پتہ ہے" ستیہ رائے نے ہنس کر کہا "مگر تم دیکھتے جاؤ۔ اسی طرح ایک نہ ایک روز فنانس بھی حاصل کر لوں گا"

"ہپ ہپ ہُرّے !" اکرم زور سے چلّایا۔

"مذاق مت کرو۔ معاملہ بہت سنجیدہ ہے"

"ہوں ؟ کیسے ؟" اکرم نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ کالبا دیوی روڈ پر ایک سندھی سیٹھ کی پیڑھی ہے۔ میں وہاں پیڑھی پر گیا تھا۔ سیٹھ سے ملنے کے لئے۔ وہ سیٹھ پروڈیوسروں کو پکچر گروی رکھ کر اس پر روپیہ دیتا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔ وہ ہماری پکچر کو فنانس کرنے کے لئے تیار ہے۔ اُس نے مجھ سے کہانی بھی سُنی۔ کہانی اسے بہت پسند آئی"

اکرم نے کہا "تم نے اُسے کہانی بھی سنا دی۔ کیسے ؟"

"جو میرے جی میں آیا میں نے بڑھا چڑھا کر اُسے سنا دیا۔ ان معاملوں میں تم جانتے ہو جب میں اپنی باتوں پر آجاؤں تو کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے ایسے گرجتے گونجتے الفاظ میں اُسے کہانی سنائی کہ وہ وہیں پر چت ہو گیا۔ اُس نے میرے گھٹنے پکڑ لئے۔ بولا۔ ستیہ بابو۔ ایسی کہانی میں نے زندگی میں نہیں سُنی۔ میں نے کہا تم کیا جانتے ہو۔ یہ کہانی کسی چھوٹے موٹے فلمی منشی کی کہانی نہیں ہے۔ ارے یہ کہانی انٹرنیشنل شہرت یافتہ ادیب اور شاعرِ ہندوستان۔ پاکستان۔ چین۔ جاپان اور افغانستان کے عظیم فن کار جناب اکرم بابو کی ہے۔ اکرم بابو تم مجھ کو دعا دو۔ میں نے تمہارا جھنڈا فٹ پاتھ بمبئی سے اٹھایا۔ ہمالیہ پر گاڑ دیا۔ ہمالیہ سے اٹھایا ایشیا پر گاڑ دیا"

"مگر کہانی کیسے سنائی تم نے ؟"——— اکرم متفکر ہو کے بولا "کہانی تو———"

ستیہ رائے اس کی بات کاٹ کے بولا "گھبراؤ نہیں اکرم بابو۔ کہانی وہی تیار ہو گی جو تم چاہو گے۔ ان

سیٹھوں کو کہانی کہاں یاد رہتی ہے، اور اگر یاد رہے گی بھی تو کہہ دیں گے ہم نے بعد میں بدل دی۔ اس وقت بہت سا بڑا کام تو فنانس حاصل کرنا ہے۔ سرمایہ"

"مگر سرمایہ کیسے حاصل کیا جائے۔ یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے" من جیت سنگھ نے کہا "ایک ہے سردار گور مکھ سنگھ۔ لکڑی کا ٹھیکیدار تھا کسی زمانے میں۔ مگر وہ صرف ٹیکسیوں پر روپیہ دیتا تھا"

"ارے ان دو چار ہزار سے کیا ہوگا" ستیہ رائے نے مسکرا کے کہا" من جیت سنگھ جی یہاں تو لاکھوں کی بات ہو رہی ہے۔ کم از کم ایک لاکھ ساٹھ ہزار چاہئیں"

جسونت نے کہا "تم اُس پیڑھی والے سیٹھ کی بات کر رہے تھے"

"ہاں! وہ تیار ہے ڈیڑھ لاکھ دینے کے لئے۔ مگر ایک ٹیری ٹوری اوبک جائے جب دے گا۔ کہتا ہے شمالی ہند کی ٹیری ٹوری بیچ کے دکھاؤ ——————"

"تو بیچ کے دکھاؤ" دھوت بولا "دو تو تم نے بیچ ہی ڈالی ہیں . . . "

"ارے میرا بس چلے تو میں سیٹھ کی پیڑھی بھی بیچ کے دکھا دوں مگر میرے ہاتھ میں بھی تو کچھ ہو صبح سے شام تک سگریٹ، پان، بیڑی کا خرچہ نہیں چلتا۔ خیر وہ سب چھوڑو" ستیہ رائے یہ کہہ کر آگے جھک گیا اور سنجیدہ ہو کے بولا "بات یہ ہے دوستو کہ پچاس فی صدی کام ہو گیا ہے۔ اب پچاس فی صدی کام باقی ہے۔ اس میں کچھ تھوڑی سی مدد تم لوگ کرو تو جھنڈا ایشیا پر گڑ جائے"

"کیسے؟" فضل نے پوچھا۔

بات چیت چونکہ فلم کے بارے میں ہو رہی تھی۔ اس لئے جمنا بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ ہاں فلم کا تذکرہ سن کر رفیعہ چبوترے پر آ بیٹھی تھی۔ اس نے ابھی ابھی سر دھویا تھا۔ اس لئے اس کے بال کھلے اور گیلے تھے۔ اور وہ اس ساری گفتگو کو غور سے سنتے ہوئے بار بار تولیے سے اپنے بالوں کو سکھاتی جاتی تھی۔ بابو رام کبھی کبھی دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا۔ اس کا چہرہ اس وقت ایک تیم کتے

کی طرح لالچی دکھائی دے رہا تھا۔ نہانے کے بعد جوان عورت کی رنگت میں جو تازگی اور نکھار آجاتا ہے۔ اس نے بابو رام کو بالکل مبہوت سا کر دیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی جلد کی خوشبو تک سونگھ سکتا ہے۔ وہ بار بار نظر بچا کر اس کی طرف دیکھ لیتا اور جب دیکھتا تو سر سے پاؤں تک اس کے بدن میں آگ سی لگ جاتی۔

"دیکھو میں فلم بزنس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں" ستیہ پال نے سب کو سمجھاتے ہوئے کہا "یہ تیسری ٹیری ٹوری اس طرح نہیں بکے گی جیسی یہ پہلے دو بک گئیں۔ نہ پیڑھی والا سیٹھ اس طرح فنانس کرے گا۔ اب وہ موقعہ آگیا ہے کہ فیمس بلڈنگ مہالکشمی میں ایک کمرہ لیا جائے۔ وہ فلمی دفتروں کا گڑھ ہے۔ تمام ڈسٹری بیوٹر لوگ وہاں پر روز آتے ہیں۔ یہاں دفتر لینا چاہیے۔ میں نے بلڈنگ کے منیجر سے بات بھی کی تھی صرف تین ماہ کا کرایہ پیشگی دینا پڑے گا۔ پونے پانسو روپیہ۔ پھر کچھ فرنیچر بھی چاہیے۔ وہ تو خیر کرائے پر آسکتا ہے ایک چپراسی رکھنا پڑے گا۔ پہلے روز جس دن دفتر کھولا جائے گا اُس روز اس کا مہورت بھی ہوگا۔ میں بہت سے ڈسٹری بیوٹروں کو بلاؤں گا۔ اُس دن پیڑے بانٹے جائیں گے۔ ایک پچاس روپے کا خرچہ اس دن ہوگا میں سمجھتا ہوں ہمارے پاس اگر کُل سات سو روپے ہوں تو کام چل سکتا ہے۔ تیسری ٹیری ٹوری بِک سکتی ہے۔ پکچر بن سکتی ہے۔ جھنڈا گڑ سکتا ہے"

"سات سو روپے اکٹھے کرنا ناممکن ہے" اکرم بولا

"کیا ناممکن ہے" رضیہ نے جوش سے کہا "پانچ روپے میں دیتی ہوں۔ بیس روپے میری سہیلی رضیہ دے گی بیس روپے میری سہیلی کا مرد دے گا۔ پینتیس روپے تو ابھی میرے نام لکھ لو"

"بہتر ہے" جسونت تالی بجا کے بولا "یعنی عورت شرم دلا رہی ہے۔ اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کیوں دھوت؟

میں چار روپے دوں گا ——— دھوت اتہ باٹی سوچ کر بولا۔ "لیکن میں اپنی مل میں بات کروں گا

اگر مزدوروں کی سمجھ میں بات آگئی تو ——— پہلی تاریخ بھی قریب آرہی ہے۔ تمہیں کچھ مل جائے گا"

"پینتیس چار، نتالیس" اکرم بولا۔

فضل بولا " میں اکٹھی رقم تو نہیں دے سکتا لیکن ہر روز کی کمائی سے ایک روپیہ دے سکتا ہوں۔ ایک مہینہ تک "

"فضل؟ تیس روپے؟ ابے سالے!" من جیت سنگھ جلدی سے تاؤ کھا کے اٹھا اور وہ کوئی بہت بڑی رقم بولنے والا تھا کہ یکایک اسے اپنے چھوٹے بھائی کرتار کا خیال آیا اور اس کا مونہہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کا چہرہ جو اس وقت شاداں اور ایک مسرت آمیز چمک سے تاباں نظر آرہا تھا یکایک بجھ گیا۔ ایک سایہ سا اس کے چہرے پر آگیا۔ اُس نے یکایک اپنا کھلا ہوا مونہہ بند کر لیا۔ سر جھکا لیا اور بولا " میں ——— دس روپے سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔ وہ بھی مہینے بھر میں دوں گا فضل کی طرح میرا بھائی کرتار ———" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ فضل نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر بولا " ابے ڈھولکی کے دس روپے کم ہیں کیا؟ تمہاری طرف سے میں تو اکیلا ہوں۔ تیرے اوپر تو کرتار کی پڑھائی کا خرچہ ہے۔ کیا ہم نہیں سمجھتے ہیں"

جسونت بولا " آٹھ آنے روز کر کے ایک مہینے کے لئے مجھ سے بھی لیتے جاؤ"

" واہ! واہ!" رفعیہ نے زور سے تالی بجائی۔ پھر وہ بابو رام کی طرف دیکھ کر بولی " اور تم ——— تم کیا دو گے؟"

بابو رام دو روپے کہنے والا تھا مگر جب اس نے رفعیہ کو مخاطب ہوتے دیکھا تو وہ بالکل گھبرا سا گیا۔ اس کی زبان بند ہو گئی۔ رفعیہ کا میٹھا مترنم سوال اُسے اکسانے لگا " تم کیا دو گے؟" "تم کیا دو گے؟" اس کی آواز اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔

یکایک بابو رام نے چلّا کے کہا " بیس روپے " وہ اتنی زور سے بولا کہ اُسے خود بھی اپنی آواز پر حیرت

ہوئی دوسروں کو اس کی آواز پر نہیں اس کی فیاضی پر حیرت ہوئی۔ بابورام بیس روپے۔ وہ دے گا کیسے؟
جسونت نے کہا "کچھ کم کردو۔ گھبراہٹ میں زیادہ بول گئے ہو شاید"

"نہیں نہیں" بابورام نے اکڑ کے کہا "میں بیس ہی دوں گا۔ چاہے اس پہلی کو لے لو"

"اور جمنا دیدی تم؟" رفعیہ نے مڑکر جمنا سے پوچھا اور بابورام کو بے حد افسوس ہوا کہ رفعیہ نے اس کی فیاضی اور جرأت پر تالی نہیں بجائی۔ وہ اسے اس طرح بھول گئی جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ اسے دوسرے لمحے میں اپنی حماقت پر سخت غصہ آیا۔ وہ خواہ مخواہ بیس روپے بول گیا۔

"ارے یہ کیا دے گی"

من جیت سنگھ جواب تک نیم دراز حالت میں چبوترے کے ایک طرف لیٹا ہوا تھا۔ یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔ سب جانتے تھے کہ من جیت سنگھ کو جمنا سے بڑی نفرت ہے۔ وہ جپ جی کا پڑھنے والا۔ پوجا پاٹھ کا رسیا باقاعدہ گردوارے جانے والا۔ دھرم کرم کا سچا سادہ لوح سکھ تھا۔ اُسے جمنا سے اس کے ماضی کی وجہ سے سخت نفرت تھی۔ ہاں بستی میں بھی جب اس نے دیکھا کہ وہ کتنی کنجوس ہے اور کس طرح ایک ایک پائی پر جان دیتی ہے تو اس کی نفرت اور بھی بڑھ گئی۔ مگر اس کے ساتھی اور دوست اس کے اس رویے کو پسند نہیں کرتے تھے اور وہ جمنا سے جہاں تک ہو سکے بستی کے دوسرے عام لوگوں سے بہتر سلوک کرتے اس لئے من جیت سنگھ بھی اس کی موجودگی کو چبوترے پر برداشت کر لیتا تھا۔ پھر گو جمنا پیسے پیسے پر جان دیتی تھی مگر ان کے کئی طرح کے کام یوں ہی کر دیتی تھی۔ لالٹین کو صاف کر کے چبوترے پر لٹکانا۔ چبوترے پر جھاڑو دینا۔ ان کے کمروں کی حفاظت کرنا کیوں کہ وہ سب لوگ تو اپنے کام سے باہر چلے جاتے تھے تو وہی ان کی جھونپڑیوں کا خیال رکھتی تھی۔ ان میں سے اگر کوئی بیمار پڑ جائے۔ اور ایسا کم ہوتا تھا۔ تو وہ دوا دارو لاتی تھی ان کی تیمارداری کرتی تھی اور یہ سب بالکل خاموشی سے۔ چُپ چاپ ایک لفظ بولے بغیر عموماً جمنا اس قدر خاموش رہتی تھی گویا اس کے مونہہ میں زبان ہی نہیں۔ بس خالی

ہوں ہاں یا نہیں سے اپنا کام چلاتی تھی۔ اب کے جو رفعیہ نے جمنا سے پوچھا تو پیشتر اس کے کہ جمنا کچھ بولتی من جیت سنگھ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "ارے یہ کیا کنجوس مکھی چوس عورت کیا دے گی۔ اسے اس کا دھن ست لو۔ ستیہ بابو تمہاری پکچر فیل ہو جائے گی۔ یہ تو دھیلے دھیلے پر جان دیتی ہے"

سب ہنس پڑے کیوں کہ یہ سچ تھا۔ جمنا واقعی روپے پیسے کے معاملے میں بڑی کنجوس تھی۔

"اب مت کہو" فضل نے جمنا کو پھسلاتے ہوئے کہا "ہماری جمنا اگر لٹانے پر آجائیں تو تمہاری ساری پکچر خود بنا ڈالیں۔ جھونپڑے میں اتنا ڈھیر سارا روپیہ دبا رکھا ہے۔ جانے مرنے کے بعد ہم میں سے کس کے نام وصیت کر کے جائیں گی"

پھر سب ہنسنے لگے مگر رفعیہ نہیں ہنسی بلکہ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے جمنا کا ہاتھ پکڑ کے کہا "اچھا مذاق جانے دو بھئی۔ بولو جمنا دیدی کتنے روپے دو گی تم؟" رفعیہ بڑی لجاجت سے بولی۔

جمنا کے ہونٹ کانپے۔ اس نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ آخر بار بار جمکا ہوا سے اس نے من جیت سنگھ کی طرف دیکھا اور بولی "ایک روپیہ"

"انقلاب زندہ باد!" من جیت سنگھ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کے بولا اور پھر اکرم کی طرف مڑ کے کہنے لگا غضب ہو گیا اکرم بابو۔ بستی میں تم تو انقلاب لے آئے۔ ابھی تک جمنا نے ایک روپیہ تو کیا ایک چھدام تک کسی نیک کام کے لئے نہیں دیا تھا۔ یہ تم نے کیا کر دیا۔ میرے خیال میں تو یہ بڑھیا تم پر۔ ۔ ۔ "

"چھی اچھی!" رفعیہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ من جیت سنگھ گو اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا پھر بھی جمنا نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ غصے سے اٹھ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد رفعیہ نے کہا "تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا"

"ہاں! ہاں! یہ بہت بری بات کی تم نے!" بابو رام نے رفعیہ کی تائید کی۔

"اچھا یارو" من جیت سنگھ لہرا کے بولا "آئندہ نہیں کہوں گا۔ اب تم آگے چلو"

وہ ہمیشہ ہی کہتا تھا آئندہ نہیں کہوں گا مگر پھر کہتا تھا۔ لوگ اس کی طبیعت کی کمزوری سے واقف تھے، چپ ہو رہے۔ اکرم نے کہا "میں ابھی کچھ نہیں دے سکتا۔ مجھے جسونت کے بہت سے روپے اُدھار دینے ہیں۔ اس رقم کے چکا دینے کے بعد البتہ . . . ."

ستیہ رائے نے چلا کے فوراً کہا "ارے تم سے تو بہت سے کام لینے ہیں۔ کہانی سینریو۔ مکالمے۔ ہدایت کاری سب تمہاری ہوگی۔ تمہیں تو ہم اپنے پاس سے کچھ دیں گے" پھر وہ پلٹ کے بولا "حساب کرو کتنی رقم ہوتی ہے۔ یہ سب رقم میں دوستوں کو واپس کر دوں گا۔ ایک ایک پائی۔ سود سمیت۔ پکچر سنسر ہو جانے کے بعد۔ میں پروڈیوسر ہوں گا۔ اکرم ڈائرکٹر ہوگا۔ رفعیہ کا ایک شاندار رول ہوگا۔ اکسٹرا لوگوں پر ایک پائی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بستی کے سب لوگ ہمارے ساتھ فلم میں اکسٹرا لوگوں کا کام کریں گے وہ روپیہ صاف یوں بچ جائے گا۔ ایشیا پر جھنڈا گڑ جائے گا"

اکرم کاغذ پر حساب کرنے لگا۔ رفعیہ نے تولیے سے دو ایک بار بالوں کو جھٹک کر خشک کرتے ہوئے ان کا جُوڑہ باندھ لیا۔ بابو رام اس کی گردن کے صراحی دار خم کو دیکھنے لگا اس کا جی چاہا کہ وہ اس خم پر آہستہ سے اپنی انگلیاں پھیرتا چلا جائے۔ اتنی زندگی گزر گئی تھی۔ آج تک کسی جوان عورت نے اس کی طرف مسکرا کے نہ دیکھا تھا۔

اکرم نے کہا "ایک سو پندرہ روپے ہوتے ہیں ــــــــ"

"اور ہمیں چاہئیں سات سو روپے" ستیہ رائے نے بڑی اُداسی سے کہا، جیسے اس کی بلند و بالا امیدوں کا قصر یکا یک زمین پر آگرا ہو۔

سب چپکے ہو گئے۔ پانچ، دس، بیس، سو کی بھی بات ہوتی تو وہ لوگ کچھ کرتے مگر اکٹھے چھ سو روپے۔ بہت زیادہ فرق تھا خواب میں اور حقیقت میں۔ امید میں اور مصلحت میں۔ آسمان میں اور زمین میں بہت زیادہ فاصلہ تھا۔

سب کے چہرے مایوس اور اداس نظر آنے لگے۔
اکرم نے وہ کاغذ کا پرزہ ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے ترش رو ہو کر کہا "ہٹاؤ۔ گولی مارو"

لیکن اس کے چند ماہ بعد جب نئے ماہ کی پہلی تاریخ کو دھومے نے اکرم کو تین سو روپے لا کے دئے تو وہ چونک پڑا۔ دنگ رہ گیا۔ اور جب دھومے نے اسے بتایا کہ یہ تین سو روپے مزدوروں نے اپنی خون پسینے کی کمائی میں سے دو دو چار چار آنے کر کے دئے ہیں تو اکرم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اکرم نے روپے گن کے ستیہ رائے کو دئے۔ ستیہ رائے کا چہرہ اس طرح کھل گیا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں کے اندر کا بجھا ہوا بلب اُتار کر نیا بلب روشن کر دیا ہو۔ اس کا چوڑا چکلا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "جھنڈا گاڑ دیا!"

رفعیہ بولی "میں نے اپنے ہاں ڈانسرز یونین میں بات کی تھی۔ وہ لوگ ہماری تصویر میں مفت کام کریں گے"

"ہُرّے!" اکرم نے تالی بجائی۔

"اور ہاں۔ یہ دس روپے رضیہ نے دئے ہیں" رفعیہ نے اکرم کو دس روپے دئے۔ اکرم نے ستیہ رائے کو دے دئے۔

"ڈھائی تین سو ابھی اور چاہئیں" اکرم نے سوچتے ہوئے کہا "کہاں سے آئیں گے؟"

"سو ہیں گے! سو ہیں گے!" ستیہ رائے نے خوش ہو کے کہا "ٹھیر جاؤ۔ میں کل جا کے فیمس بلڈنگ

کے سیٹھ سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ کم ایڈوانس لینے پر راضی ہو جائے۔"

وہ رات بہت تاریک تھی۔ آسمان بادلوں سے گدلا ہو رہا تھا۔ بارش کم تھی مگر ہوا کے زور سے اس قدر تیز فراٹوں میں آتی کہ لوگوں نے بستی میں اپنی جھونپڑیوں کے دروازے بند کر لئے تھے اور اندر پڑے سو رہے تھے۔ صرف اکرم کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ رات کے سناٹے میں اپنی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑا دُور آسمانوں کی طرف تک رہا تھا جہاں طوفان کڑک رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی، اور ہوا بارش کی بوچھاڑیں اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے سارے شہر میں ایک دیوانہ وار مستی کے عالم میں ناچ رہی تھی۔ اکرم خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چونکا جب اس نے دیکھا کہ جمنا اس کے پاس کھڑی ہے اور لالٹین اٹھائے اس کے چہرے کی طرف تک رہی ہے۔ اکرم کو معلوم تھا جمنا رات کو نہیں سوتی ہے۔ پھر بھی وہ اس طرح جمنا کو اپنے سامنے دیکھ کر چونک گیا۔

جمنا نے اپنے بے دانت کے مسوڑھوں سے مسکراتے ہوئے پوچھا "نیند نہیں آئی ؟"

"ہوں! ——— ہاں!"

اکرم اُن پتلیوں میں کھو گیا۔ وہ بڈھی پتلیاں جنہوں نے جانے کیسی کیسی زندگی دیکھی تھی۔ وہ پلکوں کے بغیر پپوٹے کبھی ان آنکھوں میں بجلی دوڑتی تھی۔ ان آنکھوں پر کبھی صف آراستہ پلکیں آہستہ سے اُٹھ کر، گر گر۔ اُٹھ کر گر گر کر نوجوان دلوں کو متلاطم کر دیتی تھیں۔ جمنا کس گاؤں کی رہنے والی تھی؟ شاید اس کا کوئی باپ بھی تھا۔ کوئی ماں۔ کوئی بہن۔ کوئی بھائی۔ ——— ؟ پھر کیا ہوا ——— ؟

اکرم اُن پتلیوں میں کھو گیا۔

جمنا نے اپنے ہونٹوں کو چباتے ہوئے جواکرم کو بڑے مضحکہ خیز سے معلوم ہوئے، آہستہ سے کہا "تم کیسی کہانی سوچ رہے ہو؟ اپنی فلم کے لئے ـــــــ؟"

"یہ ایک کہانی ہے۔ کسان اور اس کی زمین کے متعلق"

"کسان؟ ـــــــ زمین؟" جمنا نے آہستہ سے سوالیہ انداز میں دُہرایا۔ پھر اپنے آپ سے کہنے لگی

"میں ایک کسان کی بیٹی تھی"

پھر وہ چپ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا "اور اس کہانی میں لڑکی بھی ہوگی ـــــ یا لڑکیاں ہوں گی؟"

"ہوں گی!" اکرم نے جواب دیا۔

"تم کیسے ان کے ساتھ سلوک کرو گے؟" جمنا نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟" اکرم نے پوچھا۔

جمنا بولی "میرا مطلب ہے۔ وہ کیسی لڑکیاں ہوں گی۔ مَردوں کے کھلونے یا انسان؟"

اکرم نے چونک کر حیرت سے جمنا کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ دیکھتا ہی چلا گیا۔

"جواب دو!" جمنا کی آواز میں ذرا سی سختی تھی۔

"انسان!" اکرم نے آہستہ سے کہا۔

جمنا نے وہ لالٹین اوپر اٹھائی۔ اوپر اٹھائی۔ لالٹین بالکل اکرم کے چہرے کے سامنے آگئی۔

اتنے میں بجلی یکایک چمک اٹھی۔ زور کا کڑکا ہوا۔ بجلی کا کوندا شہر کے چاروں طرف پھیل گیا۔ اکرم کی آنکھیں بے اختیار بند ہو گئیں لیکن جب کھلیں تو وہ بھی اُس بڑھیا کی لالٹین دیکھ رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد بڑھیا نے سانس لے کے کہا "مجھے یقین ہے۔ مجھے یقین ہے! تم ان انسانوں کا سا سلوک کرو گے"

پھر اس نے لالٹین نیچے کر دی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی چولی میں ہاتھ ڈالا اور تین سو کے نوٹ نکال کے اکرم کے ہاتھوں میں دے دئے "جاؤ فلم بناؤ بھگوان تمہیں کامیاب کریں" اور وہ جلدی سے قدم مڑے تیزی تیزی اپنے جھونپڑے کی طرف چلی گئی۔ یکایک بارش کے ایک تیز تھپیڑے سے لالٹین بجھ گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

مگر اُس رات بہت دیر تک اکرم جھونپڑے کے دروازے پر کھڑا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ اس کے ذہن میں سیٹرم آئی۔ اور پھر یہ صورت جس کا نام جمنا تھا۔ وہ سیٹھ جس کا نام بانکڑیا تھا۔ اور ٹیکسی ڈرائیور جس کا نام فضل تھا۔ من جیت سنگھ تھا۔ وہ بجن دت جس نے اپنے لوک گیتوں کو بیچ دیا تھا۔ اور دھوے اور جھونت کتنے ہی چہرے نئے اور پُرانے قطار اندر قطار، آمنے سامنے اس کے سامنے کھڑے ہوتے گئے۔ اور وہ ان دونوں دنیاؤں کے بیچ میں دروازہ پر کھڑا رہا اور حیران ہوتا رہا پھر یکایک آنِ واحد میں بجلی کے کوندے کی طرح اس کی سمجھ میں آگیا کہ راستہ کدھر جاتا ہے ؟

یکایک دروازے کو چھوڑ کر اکرم باہر گلی میں چلا آیا۔ بارش کے تیز تھپیڑوں نے اُسے فوراً بھگو دیا۔ مگر اکرم نے ذرا پروا نہ کی۔ یکایک مسرت کی ایک دہکتی ہوئی لہر اس کے سارے جسم میں پرتی ہوئی چلی گئی۔ اور جب بادل گرجا تو اس نے اپنے سینے کے بٹن کھول دئے اور اپنے دونوں ہاتھ خوشی سے آسمان کی طرف اٹھا دئے اور بے تہودن کے الفاظ میں کہا " میں آدمی ہوں اس لئے میں بادلوں کی طرح گرجوں گا اور اتنی ہی گمبھیر، بلند اور لازوال موسیقی تعمیر کروں گا "

وہ دن کتنا عمدہ اور آسودگیوں سے بھرا ہوا تھا جس دن ستیہ رائے اور اکرم نے اپنی کمپنی کے دفتر کا فیس بلڈنگ میں مہورت کیا۔ ان کی جان پہچان کے فلم کے بہت سے لوگ اس موقعہ پر موجود تھے لیکن ایک نیا عنصر بھی موجود تھا جو اس سے پہلے ایسے موقعوں پر کسی نے نہ دیکھا تھا۔ یعنی من جیت سنگھ ٹیکسی ڈرائیور۔ دھوبے ٹیکسٹائل مزدور، جسونت ٹائپسٹ۔ بابو رام۔ فضل اور بستی کے بہت سے مزدور کاریگر اس موقعہ پر موجود تھے۔ چھانا ملز کی ورکرز یونین نے اس موقعے کے لئے اپنے تین نمائندے بھیجے تھے۔ ڈرائیورز یونین۔ ایکسٹراز یونین اور لائٹ مینز یونین کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اور ان لوگوں کی تعداد شارک سکن کی پتلون اور دو گھوڑا بوسکی کی قمیص اور اصلی یا نقلی سونے کے بٹن پہننے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ لوگ بول چال، مزاج اور رنگ روپ کے اعتبار سے بھی کھردرے، اکھڑے، سخت اور تنومند نظر آتے تھے۔ لیکن آج یہ سب لوگ بے حد خوش نظر آتے تھے۔ دفتر کا کمرہ ان لوگوں کے ہنسی ٹھٹھوں سے معمور تھا۔

ایک کونے میں جمنا سفید دھوتی پہنے سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج وہ دن کو بھی جاگ رہی تھی۔ اُس نے پہلے تو آنے سے انکار کیا تھا۔ مگر ستیہ رائے اور اس کے ساتھی نہیں مانے زندگی میں جمنا کے لئے شاید یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ عزت والے لوگوں میں اس طرح عزت سے بیٹھ رہی

تھی۔ بار بار اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ انہیں آہستہ سے اپنی سفید دھوتی کے اُجلے پلّو سے پونچھ لیتی۔ بستی میں تو وہ اگر غلیظ نہیں تو کم از کم بے حد میلے کپڑوں میں رہتی تھی۔ ہاں یہاں پہلی مرتبہ جانے کتنے سالوں کے بعد وہ ایک سپید دھوتی ن کر آئی تھی۔ اسے ان لوگوں میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے خود اس کی رُوح سفید اور اُجلی ہو گئی ہے۔

جب دفتر کا مہورت ہو چکا اور پیڑے بنٹ چکے اور لوگ اکرم اور ستیہ رائے سے ہاتھ ملا کے مبارک باد دے کر چلے گئے تو سودیش پرانچے اکرم اور ستیہ رائے کو دفتر کے باہر چھتے ہوئے برآمدے میں لے گیا اور کہنے لگا "تم جانتے ہو، سیٹھ نے سٹوڈیو کے ملازموں کو چار مہینے سے تنخواہ نہیں دی"

"ہوں" اکرم نے کہا۔

"ہاں کسی نہ کسی طریقے سے ان چار مہینوں میں ہم کام چلاتے رہے۔ مگر جب پانی سر سے گزر گیا تو ہم نے سیٹھ کو ہڑتال کرنے کی دھمکی دی۔ سیٹھ بولا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم سمجھو سٹوڈیو تمہارا ہے تم اسے چلاؤ۔ اس کا خیال تھا شاید ہم اسے چلا نہیں سکیں گے۔ ہم لوگوں نے ایک میٹنگ کر کے سٹوڈیو اپنے ہاتھ میں لے لیا"

"مگر تم کیا اسے چلا پاؤ گے" ستیہ رائے نے پوچھا "ایسا نہ ہو۔ جھنڈا کہیں ہمالیہ سے اٹھے اور کیچڑ میں گر جائے"

سودیش نے مسکرا کے کہا "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کے ایسا کیا ہے۔ ہم نے سٹوڈیو ورکرز کی ایک کوآپریٹو بنائی ہے اور یہ کوآپریٹو اب سٹوڈیو کو چلائے گی۔ ایک سال کے لئے ہم نے یہ بھی سوچا کہ سیٹھ سٹوڈیو کا کرایہ بہت لیتا تھا۔ ساڑھے سات سو روپے روز واقعی بہت زیادہ ہیں۔ وہ لُوٹتا تھا لوگوں کو۔ ہمیں کوئی لُوٹنا تو ہے نہیں۔ ہم نے سٹوڈیو کا ریٹ گھٹا کر چھ سو کر دیا ہے"

"بہت اچھا کیا" اکرم بولا۔

سودیش نے کہا " اب میں اصلی بات کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ کس طرح یہ تصویر بنا رہے ہو۔ کس طرح کے تم لوگوں کے عزائم ہیں۔ کون لوگ تمہاری مدد کر رہے ہیں ہم بھی مدد کرنا چاہیں گے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا ہے۔ اگر تم لوگ ہمارے سٹوڈیو میں تصویر کی شوٹنگ کرو تو ہم تمہیں پچاس فی صدی اُدھار دیں گے یعنی چھ سو روزانہ میں سے تمہیں ایک شوٹنگ کا صرف تین سو دینا پڑے گا۔ باقی تین سو سنسر کے بعد!"

اکرم نے زور سے سودیش کا ہاتھ پکڑ لیا اور سودیش نے اس کا۔ اور دونوں نے سیدھی نگاہ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک بڑا ہی مضبوط مصافحہ تھا۔ اکرم کو معلوم تھا کہ سٹوڈیو کے مزدور کتنی مہربانی کر رہے تھے اس تصویر کے لئے۔ اپنی روزمرہ کی ناکافی تنخواہ میں سے بھی بیس ہزار کا اُدھار اس کے لئے دے رہے تھے۔ ستیہ رائے، اکرم اور سودیش دونوں سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے چلاّ کے کہا " گاڑ دیا جھنڈا گاڑ دیا۔ فیمس بلڈنگ سے اٹھایا اور ساری فلم انڈسٹری پر گاڑ دیا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی "

وہ اتنے زور سے چلاّیا کہ آس پاس کے دفتروں کے باہر بیٹھے ہوئے بہت سے اونگھتے ہوئے چپراسی جاگ گئے اور چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کئی لوگ تو اپنے دفتروں سے باہر نکل آئے۔ سودیش پرانے مسکرایا اور وہ ستیہ رائے کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اُسے واپس دفتر کے اندر لے گیا۔

شام کے قریب جب اکرم ؛ ریہہ کر کے چرچ گیٹ جانے والا تھا، جہاں مون جبنی رستوران میں ․․زی نے اسے چائے کی دعوت دی تھی ایک لڑکی اس کے دفتر میں آئی۔ اس کی ٹھوڑی چھوٹی تھی رخسار پچکے ہوئے لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور روشن۔ وہ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اجازت لئے بغیر اکرم سے کہنے لگی " مجھے کام چاہئے "

"ہوں!" اکرم نے جواب دیا۔

"میں گا سکتی ہوں۔ ناچ سکتی ہوں۔ مکالمے بول سکتی ہوں۔ تیرنا۔ گھوڑے کی سواری کرنا۔ بائیسکل چلانا یہ سب کام کر سکتی ہوں۔ کالج کے ڈراموں میں اکثر کام کرتی تھی"

"ہوں" اکرم نے میز کی دراز کھول کے اس میں سے چند ورق نکالے اور اس لڑکی کو پڑھنے کے لئے دئے "پہلے انہیں پڑھ لیجئے اور پھر اس عورت کے مکالمے آپ بولئے"

چند منٹ کے مطالعے کے بعد اس لڑکی نے وہ مکالمے سنائے۔ طرزِ ادا بہت عمدہ، شستہ و رفتہ آواز میں جان، رس اور ڈرامہ۔

"آپ کا نام؟" اکرم نے پوچھا۔

"آہ پارا"

"گھر والے تو ایسا نام نہیں رکھ سکتے تھے" اکرم نے مسکرا کے پوچھا۔

"جی نہیں۔ یہ میرا فلمی نام ہے۔ میرا اصلی نام تو بملا ہے"

"بملا کیا بُرا ہے"

وہ لڑکی خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی "تو آپ مجھے کام دیں گے۔ آپ کو مجھے کام دینا ہی ہو گا"

اکرم نے سوچتے ہوئے آہستہ سے کہا "ایک چھوٹا سا رول ہے۔ ایک ماہ میں آپ کا کام ختم ہو جائے گا صرف ڈھائی سو روپے ملیں گے پورے کام کے لئے۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس بجٹ نہیں ہے"

"مجھے منظور ہے"

اکرم نے جسونت کی طرف دیکھ کر کہا "مس اِن کا کانٹریکٹ ٹائپ کر دو" پھر اکرم نے آہ پارا کی طرف مخاطب ہو کے کہا "آپ اپنا ایڈریس پورا پتہ وغیرہ سب انہیں بتا دیجئے۔ وہ آپ کا کانٹریکٹ ٹائپ

کر رہے ہیں"

جسونت نے شام کے دو گھنٹے اپنی فلم کمپنی کے دفتر کو دینا منظور کئے تھے۔ وہ اپنا ٹائپ رائٹر یہاں اُٹھا کے لے آتا تھا تاکہ فلمی کانٹریکٹ اداکاروں کے، فنانسر کے، ڈسٹری بیوٹروں کے متعلقہ کاغذات ٹائپ ہو سکیں۔

جب کانٹریکٹ ٹائپ ہو کے آہ پارا کے سامنے آیا تو اس نے اسے پڑھے بغیر دستخط کر دئے اکرم نے دستخط کرنے کے بعد کانٹریکٹ کی ایک نقل آہ پارا کو دی۔ آہ پارا نے اپنے پرس میں ڈال دی! اس کے بعد بھی وہ کرسی پر بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی "ایڈوانس ؟"

اکرم نے جسونت سے کہا "بھئی انہیں تیس روپے دے دو۔ رسید لے لو"

تیس روپے لے کر لڑکی نے اپنی پرس میں ڈال لئے۔ اس کے چہرے پر نہ کانٹریکٹ پر دستخط کرتے وقت نہ ایڈوانس لیتے وقت کسی قسم کی خوشی کے جذبات اُبھرے۔ وہ پتھر کی طرح بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھی رہی

اکرم نے سوچا تھا اب وہ چلی جائے گی۔ خود بخود۔ مگر جب چند منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہاں سے نہ گئی تو وہ خود چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کیوں کہ اسے دیر ہو رہی تھی۔ روزی موہن جنی میں اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اکرم نے جسونت کو دو ایک کاغذ ٹائپ کرنے کے لئے دے دئے۔ دفتر کی چابی اس کے حوالے کی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اکرم نے کوئی زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن جب فیس بلڈنگ سے باہر نکل کے مہالکشمی کے پُل کی طرف جاتے ہوئے بھی اس نے اس لڑکی کو اپنے ساتھ پایا تو اس نے متجسس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "فرمائیے"

"جی نہیں۔ میں کیا فرماؤں۔ آپ ذرا [illegible] [illegible]"

"کیا مطلب؟" اکرم نے پوچھا

آہ پارا نے بڑی حقارت سے اس کی طرف دیکھ کے کہا "آپ نے اپنا کام کر دیا، اب میری باری ہے۔ زیادہ بننے نہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ رات کو آپ مجھے جوہو پر لے جانے کے لئے آئیں گے۔ اُس وقت آپ کو بھی میرا ایڈریس ڈھونڈنے میں کوفت ہوگی۔ مجھے بھی ہوگی۔ میں اِس وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ جہاں آپ چاہیں"

اکرم نے کہا "میں چاہتا ہوں آپ اپنے گھر چلی جائیں۔ میں آج نہیں آؤں گا"

"اوہو۔ تو آپ کل آئیں گے"

"کل بھی نہیں۔ پرسوں بھی نہیں۔ کسی دن بھی نہیں۔ آپ کو اس کمپنی میں نہ میرے ساتھ نہ کسی دوسرے کے ساتھ جوہو جانے کی ضرورت پڑے گی۔ آپ ایمان داری سے اپنا کام کیجیے۔ ہم ایمان داری سے آپ کو آپ کی رقم دے دیں گے بس! یہی آپ کا ہمارا کانٹریکٹ ہے"

"لیکن کانٹریکٹ میں ایک شرط وہ بھی تو ہوتی ہے جو کبھی نہیں جاتی مگر ہوتی ہے"

"مس آہ پارا" اکرم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے اِس آپ سے کبھی کوئی بدسلوکی نہیں ہوگی"

آہ پارہ آب دیدہ ہوگئی۔ اس نے زور سے اکرم کا ہاتھ پکڑ لیا اور گلوگیر آواز میں بولی "آج میں ہر بات کے لئے تیار ہو کے آئی تھی۔ مہینوں تک اس کے لئے کبھی تیار نہ ہوئی تھی۔ جس جگہ جاؤ جس سے بات کرو۔ وہی اشارہ، وہی کنایہ۔ وہی سوال۔ آخر میں ——— وہی ایک سوال۔ میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی تھی۔ آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا . . . . دو دن سے بھوکی تھی۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ آپ مجھے ——— اس ——— اس طرح ——— میرا مطلب ہے، اس طرح کام دے دیں گے ——— میں ایک غریب سندھی لڑکی ہوں۔ میرا سب کچھ تھا . . . . اب تو کچھ نہیں رہا . . . .

ہائے اکرم صاحب۔ میں نے کتنی بُری بُری باتیں سوچ لیں آپ کے بارے میں۔ آپ کو دل ہی دل میں بہت سی گالیاں دے ڈالیں۔ مجھے کیا معلوم تھا آپ اتنے شریف آدمی ہیں"

اکرم نے کہا "میں پہلا شریف آدمی نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے درجنوں اچھے آدمی اس انڈسٹری میں موجود تھے۔ آج بھی سینکڑوں کیا ہزاروں ہیں۔ اس سے پہلے بھی صرف کام کی خوبی پر کئی لوگوں کو کام ملا ہے۔ مس آہ پارا آگے بھی ملے گا اور ملتا جائے گا۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے گی جو صرف آپ کے کام اور آپ کی فنی صلاحیتوں کی بنا پر آپ کو کام دیں گے اور پھر ایک روز وہ بھی آجائے گا مس آہ پارا جب اس قسم کی بُری باتوں سے فلم انڈسٹری کا دامن یک سر پاک ہو جائے گا مجھے اس کی پوری اُمید ہے"

تب آہ پارا نے ایک عجیب و غریب بات کی۔ اس نے اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور فوراً پلٹ کر بھاگتی ہوئی چلی گئی

موان جنی میں دیر تک اکرم اور روزی بیٹھے چائے پر خوش گپیاں کرتے رہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے وہ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ کسی نے کسی سے کچھ نہ کہا تھا۔ لیکن ان دونوں میں سے ہر ایک یہ محسوس کرتا تھا کہ دوسرے کی جانب کھنچا جا رہا ہے۔ مگر ابھی کچھ کہنے کا وقت نہیں تھا۔ کچھ محسوس کرنے کا۔ ٹٹولنے کا۔ سوچنے اور سمجھنے کا وقت تھا۔ روزی اکرم کی کامیابی سے بے حد خوش تھی۔ مسرت سے اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور شعلوں کی سی چمک اس کے رخسار ان

پرتھی۔ اس نے سیاہ سکرٹ پہنا ہوا تھا اور اس سیاہ سکرٹ پر سنہری کام کا لہریا اس کے بلاؤز تک جاتا تھا۔ یہ سنہری بیل اس کے سینے سے اس کے ٹخنوں تک پہنچی ہوئی اس کے جسم کے دل آویز خطوط اُبھار رہی تھی۔ دیوار گیر۔ مدھم مدھم نیلی روشنیاں مون جنی کے ڈانس ہال میں چاندنی کا سا پُر کیف منظر پیش کر رہی تھیں۔ ماڈم اسطلیتا اپنے گہرے بھورے بالوں کو شانوں تک چھٹکائے مائیکروفون تک آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک نازک سی گیٹار تھی۔ ان کے پیچھے ایک بہت بڑا گلاب کے رنگ کا لیمپ شیڈ تھا جس کی روشنی چھن کر ان کے بالوں اور ان کے ہاتھ میں تھامے ہوئے گیٹار پر پڑ رہی تھی۔ اسطلیتا کی نیم باز آنکھیں گیٹار پر جھک گئیں اور مدھم مدھم ناچ کا ڈولتا ہوا نغمہ گیتار کی تاروں سے پھوٹ پڑا۔

خاموشی سے اکرم اور روزی اٹھے اور ناچنے لگے۔ روزی اکرم کی باہنوں میں تھی، اور ناچتے ناچتے اس نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کا سر اکرم کے سینے سے لگ گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں کے تختے پر ناچ رہی ہے۔ ہرے بھرے مرغزاروں میں۔ برف پوش پہاڑوں کے دامن میں کسی اجنبی جھیل کے ساحل پر ناچ رہی ہے۔ گھاٹیوں پر کھڑے ہوتے درختوں کی ہر شاخ وائیلن ہے اور ہوا اسطلیتا ہے اور ان ہزاروں وائیلنوں کے آرکسٹرا سے جو موسیقی اُبھر رہی ہے۔ اُن سے دو دائرے، دو دل، دو افراد، گھومتے گھومتے ایک دوسرے کے گرد طواف کرتے ہوئے آپس میں یوں گھل گئے ہیں جیسے اب صرف ایک دائرہ ہے، ایک دل ہے۔ ایک فرد ہے۔ موسیقی کی ایک لے ہے جو ہزاروں لاکھوں وائیلنوں سے جشنِ محبت منا رہی ہے۔

اور مغربی موسیقی کی دُھن کے ساتھ ناچتے ہوئے اکرم نے سوچا، کبھی ہماری مشرقی موسیقی کے فن کار بھی کوئی ایسی دُھن بنائیں گے جن پر دو محبت کرنے والے ناچ سکیں۔ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے۔ جسم سے جسم ملائے، آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنے جسم کی لے کو دوسرے جسم کی لے میں، سموتے ہوئے موسیقی کی گت پر ایک دوسرے میں کھو جائیں۔ ایسا رقص ہمارے دیس میں جنم لے گا

منی پوری کتھاکلی! کتھک۔ بھارت ناٹیم ——— نہیں۔ نہیں۔ بھارت ناٹیم ہی نہیں، محبت ناٹیم بھی چاہئے صرف کتھاکلی ہی نہیں، محبت کی کلی بھی چاہئے۔ گر کیسے؟ ہزاروں برسوں سے ہم نے، ہمارے آباواجداد نے محبت کی۔ مگر محبت کو مایا جال سمجھ کر۔ موہ کو جیون کا جنجال سمجھ کر۔ رُوح کی ضرورت سمجھ کر نہیں۔ تو کیا ہم لوگ کبھی محبت کی موسیقی نہ پاسکیں گے۔ ہمارے ہاں ایک کے لئے موسیقی ہے اور دس کے لئے بھی ہے۔ لیکن دو کے لئے۔ صرف دو کے لئے؟ ایک مرد اور ایک عورت کے لئے۔ ایک اکرم اور ایک ذری کے لئے؟ اے خدا۔ اس ملک میں محبت کرنا اتنا بڑا گناہ کیوں ہے۔

وہ دن ختم ہوگیا۔ کتنا خوب صورت دن تھا۔ کتنا بھرپور، سجل، سہانا۔ سورج کی ڈھلتی ہوئی شعاعوں کا لباس پہنے ہوئے۔ آج بستی میں بھی ہر کوئی خوش تھا جیسے آج کوئی قومی میلہ ہو جس میں ہر فرقے، ہر خیال اور ہر مذہب کے لوگ حصّہ لے رہے ہوں۔ جیسے آج بستی میں قوس و قزح اتر آئی تھی اور اس نے اپنی رنگا رنگی سے دلوں کو شاداب کر دیا ہو۔

کھانا کھا کے سب لوگ آج جلدی سے سو گئے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ ستیہ رانی بھی اگلے دس سال کی پچھڑوں کا پروگرام بنا کے سو گیا۔ جنا بھی جو آج دن بھر نہ سوئی تھی۔ آج کتنی ہزار راتوں کے بعد رات کی مہربان آغوش میں اپنے بازوؤں کا تکیہ لے کے سو گئی۔ صرف اکرم جاگتا رہا اور دیر تک جاگتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ آج بہت سے پرانے دوست اُس سے چھوٹ گئے تھے اور نئے ساتھی اسے ملے تھے۔ ایک زندگی کا دروازہ اس پر بند ہوگیا تھا اور دوسری دنیا نے اپنے پٹ اس کے خیر مقدم کے لئے کھول دیے تھے۔ کامیابی نشے کی طرح تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دل میں ذرا سا خوف زدہ تھا۔ ذرا سا سوچنا چاہتا تھا۔ یہاں سے اب وہ کدھر جائے گا۔ اس کے دل میں ایک عجیب ہلچل سی تھی۔ ایک طوفانی ہیجانی کیفیت۔ یادوں کی۔ خیالوں کی۔ جذبوں کی۔ نگاہوں کی تصویروں کی اور ان کی پرچھائیاں جن کی روح پر ایک کونے سے دوسرے کونے تک چھائی ہوئی تھیں اور وہ

سوچنا چاہتا تھا۔ یکایک چبوترے پر رفیعہ آ کے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک پھول تھا

اکرم نے پھول کی طرف دیکھا، پھر رفیعہ کی طرف۔

رفیعہ بولی "یہ بابو رام نے مجھے دیا ہے"

اکرم مسکرایا۔ مگر رفیعہ ذرا بھی نہ مسکرائی۔ وہ بہت اُداس تھی۔

اکرم نے کہا "تمہیں تو خوش ہونا چاہئے"

"نتیجہ اس کے اُلٹ ہے"

"کیوں؟"

جواب میں رفیعہ نے اس سے ایک سوال کیا "تمہارا کیا خیال ہے۔ بابو رام کی کیا عمر ہو گی؟"

"کوئی باون ترپن برس کے قریب ہو گی"

"میں اِس ستمبر میں تیس برس کی ہو جاؤں گی"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے" رفیعہ ہنس کے بولی۔

"وہ نہایت مضحکہ خیز باتیں کرتا ہے۔ کسی طرح سے کوئی بھی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے؟"

"کیا ہوا؟"

وہ آج شام کو جب تم لوگ یہاں نہیں تھے میرے پاس یہ پھول لے کے آیا۔ پہلے تو بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ ہاتھ میں پھول کو پھول کی طرح نہیں چھتری کی طرح پکڑے ہوئے" رفیعہ زور سے ہنسی میں نے پوچھا کیا ہے۔ بولا —— یہ —— یہ گلاب کا پھول ہے۔ میں نے کہا اتنا تو مجھے بھی کھائی بنا ہے۔ اس پر وہ بے چارہ چُپ ہو گیا۔ اور اب اس نے اس پھول کو اپنے ہاتھ سے یوں نیچا کر لیا جیسے آدمی کسی منزل پر پہنچ کر چھاتے کو نیچا کر لیتا ہے۔ تو بھی پھول اس کے ہاتھ میں تھا۔ پھر اس نے کہا

مس رفیعہ ــــــ کبھی ــــــ میں ــــــ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا. میرا مطلب ہے حساب کی کتابوں کے سوا۔ پھر میں نے تمہیں دیکھا اور ــــــ پھر ــــــ ایک عرصے کے بعد کہہ نہیں سکتا کتنے عرصے کے بعد میں نے آسمان کو دیکھا۔ اور مجھے آسمان بڑا خوب صورت دکھائی دیا۔ کیوں میں نے اتنے عرصے تک آسمان کو نہ دیکھا تھا۔ کہہ نہیں سکتا۔ تم جانتی ہو ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میں تو نہیں جانتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا اور اپنی انگلیوں پر پھول کو ایسے گھمانے لگا جیسے جولاہے سوت کی انٹی گھماتے ہیں " رفیعہ ہنسی۔ پھر بولی" مگر میں بابو رام کی ہمت بڑھانا نہیں چاہتی تھی اس لئے خاموش رہی۔ یہ میری خاموشی اس کے لئے کتنی تکلیف دہ تھی۔ خود اس کی گویائی اس کے لئے کتنی پریشانی کا باعث تھی۔ یہ میں اچھی طرح سے دیکھ سکتی تھی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا۔ اور دو مرتبہ تو اس نے ماتھے پر سے اپنا ٹھنڈا پسینہ صاف کیا ہوگا۔ اس کی آواز میں لکنت بھی تھی۔ اور پھر اس نے بڑی ہمت سے کام لے کے کہا۔ مل کی طرف جاتے ہوئے ہر روز میں پھول والے کی دوکان سے گزرا کرتا ہوں۔ شاید پچیس تیس سال سے گزر رہا ہوں۔ مگر مجھے یاد نہیں کبھی میں نے پھول دیکھے ہوں۔ میں نے کبھی اس دوکان کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی۔ میرا دل اپنے حساب کی کتابوں میں تھا پھولوں میں نہیں؛ اور مس رفیعہ میرا کام بھی ایسا ہے کہ ذرا بھی آنے پائی کی غلطی ہو جائے تو سیٹھ میرا حساب برابر کرے گا۔ مگر چھ دنوں سے تمہارے۔ میرا مطلب ہے تم آئیں . . . . اور . . . . میں نے پھول دیکھے۔ گلاب۔ موتیا چمپا چنبیلی۔ پھول ہی پھول تھے جو اس دوکان میں سجے ہوئے تھے اور کئی سال سے میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ــــ تو ــــ تو ــــ تو میں ــــ آج یہ پھول لے آیا۔ تمہارے لئے۔ اور اس کے بعد اس باون برس کے بڈھے نے وہ پھول اس طرح شرما کے لجا کے آنکھیں جھکا کے مجھے دے دیا۔ جیسے وہ مجھے پھول نہیں اپنی ساری زندگی دے رہا ہو"

" وہ تم سے محبت کرتا ہے " اکرم نے ترس کھاتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کروں" رضیہ ایک آہ بھر کے بولی "وہ اگر باون برس کا نہیں تیس برس کا بھی ہوتا جب بھی میں اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔ اور اگر میں کسی اور سے محبت نہ بھی کرتی ہوتی تو بھی اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی"

"ہائے وہ کس قدر مضحکہ خیز ہے"

"بالکل بڈھے اُلّو کی طرح میری طرف دیکھتا ہے۔ اُجاڑ!" رضیہ پہلے ہنسی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی بولی "وہ کہتا تھا جب میں نے اس سے پوچھا تمہاری عمر کیا ہے۔ وہ کہتا تھا میری عمر پینتیس برس کی ہے۔ دیکھو تو بڈھے نے کیسا جھوٹ بولا"

اکرم بولا "وہ نہیں اس کی محبت جھوٹ بول رہی ہے"

یکایک وہ دونوں اُداس سے ہو گئے۔ بابو رام کی باون برس کی بنجر اور بے معنی زندگی بوسیدہ بورئیے کی طرح ان کے سامنے بچھتی چلی گئی۔ اس زندگی میں کہیں ایک ہرا پتہ نہ تھا۔ پھول کی ایک کلی نہ تھی۔ پھلوں سے لدی ہوئی ایک ڈالی نہ تھی۔ صرف روپے آنے پائیوں کے اعداد و شمار۔ ہزاروں۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد ریت کے ذرّوں کی طرح اس کی زندگی کی سطح پر پھیلے ہوتے تھے۔ باون لمبے تھکا دینے والے طویل برس ریت کے جھلسے ہوئے ٹیلوں کی طرح بابو رام کی زندگی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھڑے تھے۔ ایک قتل تو وہ ہوتا ہے جس میں آدمی کو گلا گھونٹ کر مار دیا جائے لیکن یہ کس قسم کا قتل ہوتا ہے جو بابو رام ایسے لوگوں کی زندگیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ کیوں یہ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ ایک دن نہیں۔ دو دن نہیں سالہا سال ایک ہی آدمی کو گھٹا گھٹا کے مارتے رہتے ہیں کہ پھر کوئی امید نہیں رہتی۔ کوئی مسکراہٹ نہیں رہتی اور کوئی یاد نہیں رہتی۔ اور کہیں پر کوئی پھول دکھائی نہیں دیتا۔ اور کہیں پر کوئی آسمان نظر نہیں آتا۔ صرف جمع، تفریق۔ ضرب تقسیم۔ صرف جمع تفریق ضرب تقسیم۔ . . . !

رضیہ نے آہستہ سے کہا "جب میں نے پھول لے کے بھی اس سے کچھ نہ کہا۔ اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔

مجھ سے ہو نہیں سکا۔ میں نے خالی سر جھکا دیا۔ تو وہ بہت اُداس ہو گیا اور اس وقت اس کی اُداسی نے میرے دل کو چھو لیا۔ اس نے کہا ہاں۔ شاید میں بہت دیر میں آیا۔ . . شاید اب میرے لئے بہت دیر ہو چکی ہے . . . . اب میں جاتا ہوں۔ اور وہ آہستہ سے میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس وقت اس کا باون برس کا بڈھا۔ بدصورت۔ اُلّوؤں والا چہرہ فرشتوں کو بھی رُلا سکتا تھا۔"

"رفعیہ!" اکرم نے اتنے آہستہ سے لہجے میں لیکن اتنے تیز لہجے میں کہا جیسے وہ کسی تیز چھری کی دھار کو اپنی آواز میں چھپائے ہو۔ "رفعیہ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں بابو رام کی باون برس کی بے برگ و گیاہ زندگی اٹھالوں اور اسے ایک طمانچے کی طرح سماج کے مونہہ پر مار دوں"

رفعیہ گلاب کے پھول کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "باون برس کے بعد یہ ایک پھول اس کے دل میں کھلا! اور آج کے بعد یہ پھول کبھی اس کے دل میں نہ اُگ سکے گا۔ اُجاڑ۔ یہ کس طرح کی ماٹی ملی زندگی ہے!"

اکرم نے رفعیہ کے ہاتھ سے پھول لے کے ایک عجیب مسکراہٹ سے کچھ اس طرح سے اُس کے بالوں میں سجا دیا جیسے وہ کسی کی ویران قبر پر آخری بار پھول چڑھا رہا ہو۔

"جاؤ رفعیہ اب سو جاؤ" اکرم نے پھول لگا کے کہا اور رفعیہ جیسے سمجھ گئی۔ اور جیسے سمجھنے کے بعد اس کے دل کو قرار آ گیا۔ اور وہ آہستہ سے اٹھی اور اپنی جھونپڑی کی طرف چلی گئی۔

اکرم نے چھ مہینوں میں تصویر مکمل کر لی۔ اس نے اس کا نام "کسان" رکھا۔ سرمائے کی کمی، اور چند بڑے بڑے پروڈیوسروں کی دبی دبی سرگوشیوں میں چلنے والی مخالفت کے باوجود اگر یہ تصویر اتنے کم عرصے میں مکمل ہو گئی۔ تو اس میں اکرم کی دن رات کی ان تھک محنت کے علاوہ اس کے یونٹ کے لوگوں کی پرجوش خدمت اور سٹوڈیو کے مزدوروں کی پرخلوص مساعی کو بڑا دخل تھا۔ انڈسٹری کے جو چھوٹے چھوٹے لوگ تھے۔ وہ ایک طرح سے اس تصویر کو اپنی تصویر سمجھتے تھے۔

اس دفعہ اکرم نے بھی پوری کوشش کی تھی۔ کہ وہ بہت اونچا نہ اڑے۔ ان تمام غلطیوں کا اعادہ نہ کرے جو اس سے پچھلی تصویروں میں سرزد ہوئی تھیں۔ اس بار جو مسئلہ اس نے اپنی تصویر میں اٹھایا تھا۔ شہری مسئلہ نہیں تھا۔ کسان اور اس کی زمین اور جاگیرداری۔ زمینداری نظام۔ زیادہ تر دیہاتی مسئلہ تھا۔ مگر ہندوستان دیہاتیوں میں موجود رہتا ہے۔ اس لئے اکرم نے یہ مسئلہ اٹھانا مناسب سمجھا۔ مگر اس بار اس کے کردار تقریریں نہیں کرتے تھے۔ اپنے عمل سے اور حرکات و سکنات سے بولتے تھے اب کی بار اس کا گاؤں ایک سچ مچ کا گاؤں تھا۔ کسان سچ مچ کا کسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ فلمی کسان نہ تھے اس کی ہیروئن بھی کھیتوں میں کام کرنے والی ہیروئن معلوم ہوتی تھی۔ ہر چیز حقیقت کے اس قدر

قریب تھی کہ گاؤں کی زندگی سے مربوط۔ اس بار اکرم کے کردار بالکل سیاہ اور سفید نہیں تھے، وہ انسان تھے اپنی تمام خامیوں کے باوجود چھوٹے چھوٹے انسان۔ ان کی زندگی بڑی تلخ اور بڑی مصیبت کی تھی۔ مگر اکرم نے کہیں بھی کوشش نہ کی تھی کہ وہ مصیبت کو اتنا بڑھا چڑھا کر دکھلائے کہ زندگی کے دوسرے پہلو اس میں چھپ جائیں۔ یہ تو مرکزی نقطہ تھا یعنی زمین اور اس پر کام کرنے والے کسان مگر آنسوؤں کے درمیان ہنسی بھی تھی۔ چاندی کی گھنٹی کی طرح سریلی ہنسی۔ جو کبھی تو زندگی کے چھوٹے چھوٹے دکھوں کو اپنی شاداب آواز میں گھلا دیتی ہے اور کبھی بڑے دکھوں کو تضاد سے زیادہ ابھار دیتی ہے لیکن اب کے یہاں اس تصویر میں ہنسی بھی تھی۔ صاف ستھری زندگی سے بھرپور۔ محبت کرنے والی ہنسی اور گیت۔ گاؤں کے ٹھیٹھ گیت۔ کھیتوں میں گائے جانے والے۔ چراگاہوں میں گونجنے والے۔ چکی کی گھمر گھمر اور بیاہ کی پرشور چہل پہل میں گنگنانے والے گیت زمین اور زندگی کے ساتھ بندھے ہوئے گیت اور ناچ اکرم نے اس سے پہلے اپنی کسی تصویر میں ناچ نہیں رکھے تھے مگر اس دفعہ اس نے دھوتے کی تنقید سے فائدہ اٹھایا تھا اور نتیجہ ایک ایسی تصویر کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔ جو اپنی تمام خامیوں کے باوجود ایک چھوٹے سے ہندوستانی گاؤں اور اس کی زمین اور اس کے کسان کے مسئلے کی ایک جیتی جاگتی انسانی دستاویز تھی۔ اکرم کو سنسر کا بہت خوف تھا۔ اگر سنسر نے اصل موضوع ہی سے اتفاق نہ کیا تو اس کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں سیاست کا بھی دخل تھا اور وہ لوگ جو زمیندار تھے اور جاگیردار تھے اور صدیوں سے ہندوستان کی پچھتر فی صدی آبادی کی معاشی، سماجی اور تہذیبی زندگی پر قبضہ کئے بیٹھے تھے وہ کس طرح اس تصویر کو چلنے دیں گے۔ اور اکرم نے جہاں تک مرکزی نقطے پر کہنے کا حق تھا۔ اس پر بڑی بے باکی سے، بڑی فن کاری سے مگر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ زمین کسانوں کی ہے اور جو غاصب ہیں انہیں زمین اور کسان کے بیچ میں سے ہٹا دینا چاہیئے۔ اس مرکزی نقطے پر اکرم نے کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ سنسر کی رائے سے بہت

ڈر رہا تھا۔

مگر یہ دیکھ کر اُسے ایک گونہ حیرت اور پھر مسرت بھی ہوئی کہ سنسر نے اس کی تصویر پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پوری تصویر ایک فٹ کاٹے جانے کے بغیر پاس کر دی۔ نہ صرف پاس کر دی گئی۔ بلکہ سنسر نے اکرم کے اقدام کو سراہا۔ اُسے ذاتی طور پر مبارک باد پیش کی۔ کہ اس نے اتنے بڑے قومی مسئلے پر ایسی جرأت آزما تصویر بنائی اور فلموں کے تمام رجحان کے خلاف ایک نہایت صاف ستھری شستہ مذاق کی خوب صورت تصویر تیار کی۔

اکرم اس تعریف سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ یہ تعریف خلافِ توقع تھی لیکن پکچر کو فنانس کرنے والے سیٹھ کرتر چند کا چہرہ اُتر گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور جب نمائش گاہ سے واپس آئے ہوئے اکرم اور ستیہ رائے نے سیٹھ سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے غصہ سے چلا کے کہا۔

"تم نے مجھے ڈبو دیا۔ کہانی کچھ سنائی اور اب کچھ بنا دی"

"کیا غضب کیا؟" ستیہ رائے نے پوچھا۔

"سنتے نہیں تھے سنسر کیا کہہ رہا تھا"

اکرم نے کہا "وہ سب تو تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے دس سال میں پہلی بار ایسی تصویر آئی ہے"

سیٹھ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کے کہا "جس کی سنسر تعریف کرے سمجھو اس تصویر کی قسمت پھوٹ گئی"

"کیا بات کرتے ہو سیٹھ جی" ستیہ رائے نے برافروختہ ہو کر کہا۔ "ہم نے جھنڈا . . . ."

"رہنے دو اپنے جھنڈے کو" سیٹھ کرتر چند نے فوراً ستیہ رائے کی بات کاٹ کر نہایت ہی غصہ سے کہا "بڑے آئے جھنڈے خاں کہیں کے۔ میں بیس سال سے انڈسٹری میں بھاڑ نہیں جھونک رہا ہوں

میں نے پچاس بار دیکھ لیا ہے جس تصویر کی سنسر تعریف کرے۔ جس میں سے کچھ نہ کاٹے۔ سمجھو وہ تصویر فلاپ ایک دم بنڈل۔ فیل۔ اور جس تصویر کی سنسر بُرائی کرے اُس میں سے کاٹنے کو کہے دوبارہ شوٹنگ کو کہے۔ سمجھو وہ تصویر اُترنے والی نہیں ہے۔ کم از کم سلور جوبلی تو ضرور منائے گی۔ تم نے کیا کہا سنسر والے کہتے تھے دس سال میں انہوں نے ایسی صاف ستھری فلم نہیں دیکھی ہے۔ تو سمجھو۔ دس سال میں اس سے بڑا فلاپ بھی کسی نے فلم انڈسٹری کو نہیں دیا ہوگا۔ تیسرے دن ہی ریلوائی سے اُتر جائے گی۔ میں تو سمجھتا ریلوائی میں اُسے لگاتا ہی نہیں۔ کیوں خواہ مخواہ تیس چالیس ہزار اس کی پبلسٹی پر خرچ کروں میں اسے کسی دوسرے درجے کے تھیٹر میں دو ہفتے کے لئے باندھ دوں گا۔"

"ایسا غضب نہ کرنا سیٹھ جی" اکرم بولا "یہ ایک اچھی قومی فائدے کی تصویر ہے۔ تمہیں اس کی اچھی طرح سے پبلسٹی کرنی چاہیئے"

"قومی فائدہ جائے بھاڑ میں۔ پہلے تو میں اپنا فائدہ دیکھوں گا۔ بڑے آئے مجھے سبق پڑھانے والے۔ بنڈل پکچر کے ڈائریکٹر۔ تم نے تو مجھے لوٹ لیا"

"کیا لوٹ لیا" ستیہ رائے نے چلّا کر کہا۔ تصویر دو دن چلے یا دس دن یا دس مہینے۔ تمہارے پیسے کھرے ہیں۔ سب علاقے بکے ہوئے ہیں"

"بکے ہوئے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے" سیٹھ کرتر چند خفا ہو کر بولے "سب پیسے سب علاقوں سے آ بھی جائیں۔ تو بھی مجھے نقصان رہتا ہے"

"کیسے؟" ستیہ رائے چمک کر بولا "سارا خرچہ میرے ہاتھ سے ہوا ہے۔ میں نے پائی پائی کا حساب رکھا ہے۔ سب پیسہ آ جائے تو پچاس ہزار کا نقد فائدہ ہے جس میں تمہارا سود اور رائلٹی کاٹ کر مجھے پندرہ ہزار بچتا ہے"

"کیسے پندرہ ہزار بچتا ہے تم مجھے دوسری ششماہی کا سود نہیں دو گے؟"

"سیٹھ ایسا ظلم نہ کرو" اکرم بولا "دوسری ششماہی میں صرف دس دن اوپر ہوئے ہیں۔ میں نے یہ تصویر چھ مہینے اور دس دن میں تیار کی ہے۔ تم نے خود ستیہ رائے سے کہا تھا۔ تم اس دس دن کے لئے سود نہیں لوگے۔ دوسری ششماہی کا سود نہیں لگاؤ گے"

"میں نے بالکل نہیں کہا تھا" سیٹھ نے کہا۔

"تم ——— تم جھوٹ بولتے ہو" ستیہ رائے نے غصے میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا "اتنی بددیانتی، تم نے دس آدمیوں کے سامنے کہا تھا"

"ذرا عدالت میں لے کے آنا انہیں" سیٹھ گرچند نے مسکرا کے کہا "مجھے جھوٹا اور بددیانت کہنے والے کون ہیں۔ میں ان کا چہرہ دیکھنا چاہوں گا"

خیر میں نے کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ کانٹریکٹ میں تو لکھا ہے کہ چھ ماہ میں اگر تصویر تیار نہ ہوئی تو دوسری ششماہی کا سود پڑ جائے گا۔ تم دونوں کان کھول کر سن لو اور اس حساب سے تمہیں مسٹر ستیہ رائے، مجھے دوسری ششماہی کا سود دینا پڑے گا اور اس حساب سے مسٹر اکرم فائن فلمز کے پروڈیوسر مسٹر ستیہ رائے کو تمام ٹیری ٹوریز سے روپیہ وصول ہو جانے کے بعد بھی مجھے آٹھ ہزار کی رقم دینا پڑے گی جسے وصول کرنے کے لئے مجھے ان کے خلاف عدالت سے ڈگری لے کے اُن کے ماہم کے فلیٹ پر نالش لانی پڑے گی۔ اور ان کے رفریجریٹر۔ ریڈیوگرام اور صوفہ سیٹ اور عالیہ کو قرق کرنا پڑے گا۔ اور تو کوئی طریقہ ہے نہیں۔ ستیہ رائے صاحب سے روپیہ وصول کرنے کا"

یہ کہہ کر سیٹھ گرچند نے دونوں کو گاڑی سے اتار دیا اور اپنی بیوک گاڑی کا رُخ باندرہ روڈ کی جانب لے گیا۔ اور ستیہ رائے اور اکرم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

اکرم نے غصے میں کہا "سالا۔ جب تک پکچر مکمل نہیں ہوئی تھی کہتا تھا۔ اکرم بھیا میں دوسری تصویر بھی تمہارے سنگ بناؤں گا۔ ابھی سے اناؤنس کر دو"

ستیہ رائے نے کہا "یاجی سارا روپیہ خود کھا لینا چاہتا ہے"
"صرف یہی نہیں" اکرم نے کہا "وہ تو تمہارے فلیٹ پر قرقی لا رہا ہے"

جب سے تصویر کا کام شروع ہوا تھا ستیہ رائے چونکہ پروڈیوسر تھا اور اسے بہت سے ڈسٹری بیوٹروں اور دوسرے فنانسروں اور سرمایہ داروں سے ملنا پڑتا تھا اس لئے وہ بستی چھوڑ کر چلا گیا تھا اور ماہم میں اس نے ایک فلیٹ لے لیا تھا اور اُسے ایک فلمی پروڈیوسر کے فلیٹ کی طرح سجایا تھا۔ ٹیلی فون ریفریجریٹر ریڈیو گرام، غالیچے، ریشمی پردے۔ اگر کوئی کمی تھی تو ایک موٹر کی اور ایک داشتہ کی اور یہ دونوں ہی بہت مہنگی تھیں۔ گو ستیہ رائے موٹر کے خلاف تو نہیں تھا لیکن داشتہ کے بہت خلاف تھا اور جب اس کے دوسرے دوست ہنسی ہنسی میں اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہتے "تم کیسے پروڈیوسر ہو۔ تمہاری تو کوئی داشتہ ہی نہیں ہے" تو ستیہ رائے ہنس کے جواب دیتا "میں خود ہی اپنی موٹر ہوں خود ہی اپنی داشتہ ہوں"

"قرقی لا رہا ہے۔ مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔ ستیہ رائے کا پتہ بجز معرفت فٹ پاتھ ہو سکتا ہے مجھے اس بات کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی اس بات کی کہ وہ اسے کہیں دوسرے تیسرے درجے کے تھیٹر میں نہ ڈال دے۔ اور اس کی اچھے طریقے سے پبلسٹی نہ کرے۔ اکثر اوقات ایک عمدہ تصویر بُری پبلسٹی سے مر جاتی ہے"

ستیہ رائے کا غصے سے تمتماتا ہوا چہرہ فوراً تبدیل ہو گیا اور وہ اپنی ہنسی روک نہ سکا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگا "دیکھو اکرم میں دعا کرتا ہوں یہ سچ نہ ہو مگر بھائی جانے کیا بات ہے۔ ہوتا عموماً ایسا ہی ہے جب تصویر کی سنسر تعریف کرتے ہیں وہ ساتی دو دن میں اُڑ جاتی ہے"

"اوہام پرستی ہے اور کچھ نہیں" اکرم نے چلا کے کہا

"نہیں اصل بات یہ ہے" ستیہ رائے نے بمشکل اپنی ہنسی روک کے کہا "سنسر والے جو بڈھے

ہیں۔ بہت سے ان میں سے اب زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں فطری طور پر انہیں دلچسپ فلمیں جوان اور صحت مند فلمیں بُری معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا شوخ کھلنڈرا پن انہیں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عموماً ان فلموں کی تعریف کرتے ہیں جو عوام کی دلچسپی کی نہیں ہوتیں.... مجھے بھی ڈر لگتا ہے کہیں یہ تصویر بھی ناکام نہ ہو جائے۔ تو پھر مجھوا اپنا بوریہ بستر بمبئی سے گول!"

اکرم نے کہا "تم دیکھتے جاؤ۔ آج تو کچھ سنسر ہوئی ہے۔ ایک بڑا سا شو کرتے ہیں جس میں مختلف طبقوں اور خیالات کے لوگوں کو بُلاتے ہیں۔ ان سے تصویر کے بارے میں صحیح ردِ عمل معلوم ہوگا"

مگر اس پرائیوٹ شو سے بہت پہلے بہت سی باتوں میں گڑبڑ ہوگئی۔ سیٹھ نے معاہدے کی رو سے بہت سی چھوٹی موٹی خلاف ورزیوں کی مثالیں دے کر ستیہ رائے سے کسان تصویر کا نیگٹو اپنے نام لکھوالیا۔ پھر اس نے اپنے آٹھ ہزار روپے کا تقاضا کیا اور ایک فوجداری مقدمہ نکال کے ستیہ رائے کے خلاف ڈگری حاصل کرلی۔

ایک اچھی تصویر بنانے کے بعد بھی اکرم کے منہ میں ایسا ذائقہ تھا جیسے وہ لکڑی کا برادہ کھا رہا ہو۔ یہ لوگ تصویر نہیں دیکھتے۔ اس کا تاثر اس کی خوبصورتی، اس کی مجموعی صفات پر غور نہیں کرتے۔ اب تو اس پکچر کی سب ٹیری ٹوری بک چکی ہیں۔ تجارتی اعتبار سے اس میں منافع بھی ہے گر یہ

سیٹھ لوگ صرف منافع بھی نہیں دیکھتے۔ یہ سارے کا سارا منافع ان کی جیب میں جانا چاہیے۔ وہ لوگ جنہوں نے گذشتہ چھ مہینے اس پر محنت کی ہے فائین فلمز کا ساف جنہوں نے آدھی تنخواہ پر کام کیا ہے سٹوڈیو کے مزدور جنہوں نے اسٹوڈیو کی شوٹنگ کا صرف آدھا روپیہ لیا ہے۔ آدھا اُدھار دیا ہے۔ ڈانسرز یونین کی لڑکیاں۔ اکسٹرا یونین کے لوگ بستی کے لوگ جنہوں نے اس پکچر میں کام کیا ہے۔ ان سب لوگوں کی اُجرتیں ماری جائیں گی۔ چھاپاخانے کے وہ مزدور جنہوں نے دو دو آنے کر کے اس فلم میں چندہ دیا ہے اُن کے تین سو روپے تک واپس نہیں ہو سکیں گے۔ جمنا——— کیا زندگی ہے ایک تصویر بنانے کے بعد اتنے سینکڑوں آدمیوں کی صلواتیں سننا پڑیں گی۔ کوئی نہیں کہے گا کہ سیٹھ کتر چند نے بدمعاشی سے کام لیا ہے۔ سب ستیہ رائے کو اور اکرم کو گالی دیں گے۔ یہ لوگ روپیہ کما گئے قوم کے نام پر۔ ترقی پسندی کے نام پر۔ ایک یا دو آدمیوں کو سمجھانا آسان ہے۔ اتنے سینکڑوں آدمیوں کو کیسے سمجھایا جائے گا۔ کیسے انہیں بتایا جائے گا کہ محنت کے رس سے چمکتا ہوا پھل کس طرح محنتی شانوں سے توڑ کر غاصب کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے جو اس سماج کا بدیہی اصول ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی طریقے سے اس عمل کو اپنی زندگی کے دائرے میں دیکھتا ہے مگر صرف اپنی زندگی میں وہ اپنے کو مظلوم اور دوسروں کو بے ایمان سمجھنے پر مجبور ہے وہ لوگ کسی طرح اُن کی باتوں کو یقین کریں گے۔

جمونت نے کہا "کسی نہ کسی طریقے سے ستیہ رائے کے فلیٹ کو اس نالچ سے بچانا ہے"

"مگر کس طرح ؟" ستیہ رائے پریشان ہو گیا۔ پوچھا "سالے سیٹھ نے اس بری طرح زبان سے میرا جھنڈا اکھاڑا ہے کہ ...." وہ چُپ ہو گیا۔

"کوئی نہ کوئی رستہ نکلے گا۔ سیدھا نہ سہی ٹیڑھا سہی"

اور وہ اپنے خیالوں میں مستغرق ہو گیا۔

قرقی کے دن جب سیٹھ کتر چند بلیف اور اس کے پانچ آدمیوں کو لے کر ستیہ رائے کے فلیٹ میں داخل ہوا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دس بارہ آدمی فلیٹ میں جمع ہیں اور مختلف کمروں میں مختلف چیزوں کے قریب دھرنا دئے خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ سیٹھ کتر چند نے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر کوئی شخص اس کی تعظیم کے لئے نہیں اُٹھا نہ کسی نے اُسے آداب کیا۔ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

سیٹھ کتر چند نے بھونک کے کہا "قرقی لایا ہوں"

ستیہ رائے نے کہا "لائے ہو تو لے آؤ۔ لے جاؤ جو مال تمہارا ہے"

سیٹھ نے اِدھر اُدھر خاموشی سے دیکھا، مگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں اُسے ایک گونہ اطمینان ہوا وہ ریڈیوگرام کے پاس گیا۔ وہاں دھوٹے اپنا سر منڈائے، ہاتھ میں ایک وزنی ہتھوڑا لئے بیٹھا تھا سیٹھ نے ریڈیوگرام پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یہ قرق کر لو"

سیٹھ کے ہاتھ پر زور کا ایک ہتھوڑا پڑا وہ بلبلا کے اور اچھل کے ریڈیوگرام سے دو فٹ پرے جا رہا "کیا بات ہے، کیا بات ہے۔ دنگا کرنا چاہتے ہو"

دھوٹے بولا "میری چیز کو تم ہاتھ نہیں لگا سکتے"

"تمہاری چیز؟"

"ہاں! ستیہ رائے یہ ریڈیوگرام عرصہ ہوا مجھے فروخت کر چکا ہے۔ یہ کاغذ دیکھ لو" دھوٹے نے کاغذ خاموشی سے بلیف کو دکھلائے، کاغذات قانونی تھے، بالکل درست ریڈیوگرام عرصہ ہوا فروخت

ہو چکا تھا۔

سیٹھ کتر چند غصے میں ریفریجریٹر کی طرف بڑھا۔ وہاں سردار من جیت سنگھ ہاتھ میں ایک بڑا سا سونٹا سنبھالے ایک اسٹول پر بیٹھے تھے اُن کا سونٹے والا ہاتھ ریفریجریٹر پر تھا سیٹھ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر زور سے بولے "سیٹھیا ادھر نہ آویں۔ پہلے سے کہتا ہوں۔ ادھر نہ آویں۔ نہیں تو مار مار کے کچوڑی بنا دیواں گا۔ ایہہ کاگد دیکھ لے" من جیت سنگھ نے کاغذ سیٹھ کو دکھایا، بالکل ٹھیک تھا قانونی حیثیت سے اس فروخت میں کوئی نقص نہ تھا سیٹھ ریفریجریٹر کو ہاتھ نہ لگا سکا۔

سیٹھ نے بھنا کے کہا "اچھا یہ صوفہ اُٹھا لو یہاں سے"

مگر صوفہ سیٹ بھی بکا ہوا تھا تین مزدور وہاں بھی بیٹھے تھے ایک سے ایک تگڑا اور ہاتھ میں اُن کے بازوؤں سے بھی تگڑا وہ قانونی پرزہ۔

"تو یہ غالیچہ"

مگر غالیچہ بھی بک چکا تھا۔

کرسیاں، سٹول، میز، الماریاں، کپڑوں کی کھونٹیاں تک بکی ہوئی تھیں غصے کے مارے سیٹھ کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔

اس نے چلا کے پوچھا "یہاں کوئی چیز ایسی بھی ہے جو پہلے سے بکی ہوئی نہیں ہے؟"

"ہاں ہے!" اکرم نے بڑی گمبھیر آواز میں کہا "یہ میری قلم دوات اسے آج تک کوئی خرید نہیں سکا اسے تم قرق کر سکتے ہو"

ستیہ رائے سیٹھ کتر چند کے قریب آیا اور کہنے لگا "لو اسی قلم سے ایک نیا چیک لکھ دو دس ہزار روپے کا"

"کاہے کے لئے؟" سیٹھ کتر چند نے حیران ہو کے پوچھا۔

"دوسری پکچر کے ایڈوانس کے لئے۔ میں دوسری پکچر تمہارے لئے بنا تا ہوں۔ دس ہزار ایڈوانس کرو یہ آٹھ ہزار جو تم نے مجھ سے زبردستی کا لیا ہے اس رقم کو بھی اگلی پکچر میں ڈال دو۔"

کشن چند ستیہ رائے کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ تجویز معقول تھی۔ مگر اس وقت اُسے اپنی ناکامی پر سخت غصہ آرہا تھا۔ اس نے قلم دوات اُٹھا کر فلیٹ کی کھڑکی سے باہر پھینک دی اور غصے میں جھلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان کے جانے کے بعد سلیف اور اس کے آدمی بھی چلے گئے۔ ان سب کے جانے کے بعد ستیہ رائے نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کے چلا کے کہا "جھنڈا گاڑ دیا۔ رکھا! باندھا! تانا کھینچا اور کھینچ کے چھوڑ دیا۔ جاؤ بیٹے نکلے رہو۔ کہو بھیا" ستیہ رائے نے جسونت سے پوچھا "کیسی رہی میری ترکیب"

جسونت نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کے کہا "ان لوگوں سے نبٹنا تم خوب جانتے ہو"

ستیہ رائے نے کہا "اور کیا، اب ہم ان چیزوں کو بیچ کر جن لوگوں کی رقمیں باقی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جن رقموں کا حساب تصویر کے ذمہ ہے وہ تو سیٹھ کیا سیٹھ کے باپ کو بھی دینی پڑیں گی لیکن کچھ رقمیں جو ذاتی حیثیت میں ہم نے رکھی ہیں جیسا ہل کے مزدوروں کا قرضہ جمنا کا روپیہ بستی کے پٹھان شہباز خاں کا روپیہ یہ روپیہ تو ہم اب واپس کر سکتے ہیں۔"

جسونت نے ستیہ رائے کا ہاتھ دبا کے کہا "میں نے سمجھا تھا تم صرف مضمون لے دلال ہو۔ معلوم ہوا تم انسان بھی ہو۔"

ستیہ رائے خاموشی سے مسکراتا رہا جسونت نے پوچھا "اب تم کہاں جاؤ گے۔"

"وہیں تمہارے پاس بستی میں معرفت فٹ پاتھ بمبئی!" ستیہ رائے کا دہی پرانا پتہ ہے اب تو"

پرائیوٹ شو کا دن آن پہنچا۔
اکرم نے طرح طرح کے لوگوں کو بلایا تھا۔ فلم انڈسٹری کے سربرآوردہ لوگ تو موجود تھے ہی۔ مگر اکرم نے مزدوروں۔ چھوٹے چھوٹے دوکان داروں، طالب علموں، ٹیکسی ڈرائیوروں۔ کام کرنے والی عورتوں کو خاص طور پر مدعو کیا تھا اس نے انگریزی تصویریں دکھانے والے تمام سینماؤں کے منیجر لوگوں کو بھی دعوت دی تھی۔ ان میں ماترو سینما کا امریکی منیجر جان رولینڈ بھی شامل تھا۔
" ماترو سینما کے منیجر کو کیوں بلاتے ہو " دھومے نے چلا کے کہا " وہ ضرور تمہاری تصویر دیکھنے گا یا نگی !"
اکرم نے کہا " میں تو سب کو بلاؤں گا، امریکی ہوا تو کیا ہوا۔ کیا امریکی کسی اچھی چیز کو پسند نہیں کر سکتا "
دھومے نے ہنس کر طنزاً کہا " ہاں کیوں نہیں پسند کرے گا بہت بڑی تم نے سن آف انڈیا ایسی پکچر تیار کری ہے بہت اس میں راجے مہاراجے ہیں۔ سانپ ہیں جوگی ہیں۔ نیم عریاں ناچ ہیں نا جو وہ اسے ضرور پسند کرے گا ؟"
اکرم جھینپ گیا " بہت سے امریکیوں کیا بہت سے مغربیوں کا ہندوستان کے بارے میں یہی نظریہ تھا۔ مگر اکرم جب بھی ڈٹا رہا۔ کہنے لگا " اُسے بھی ایک سو فی صدی ہندوستانی فلم دیکھنے دو کیا ہرج ہے ؟"
اور اس طرح سے ماترو سینما کے امریکی منیجر جان رولینڈ کو "کسان" کا پرائیوٹ شو دیکھنے کی اجازت ملی وہ چھ فٹ اونچا لانبا بہت ہی عمدہ گوشت اور بہت ہی عمدہ مکھن پر پلا ہوا امریکی تھا۔ نیو یارک کا رہنے والا۔ پتلے پتلے زپ کی طرح بند ہو جانے والے ہونٹ۔ فولاد کے رنگ کی سی آنکھیں،

جہاں پڑجائیں وہاں گویا ایک کیبل گاڑدیں۔ بڑے بڑے ہاتھ بے صدبے چین اور مضطرب! جب "کسان" کا شو ختم ہوا تو حسب دستور اکرم کو ڈائریکٹروں اور اداکاروں نے گھیر لیا۔

جمال الہ آبادی ڈائریکٹر نے اکرم سے ہاتھ ملا کے کہا۔ واہ واہ لطف آگیا۔ پھر منہ پھیر کے اپنے دوست گوونددھرما سے کہا " سالے نے بور کر دیا۔"

ڈائریکٹر دھرمیندر کمار نے اکرم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا " فائین " دھرمیندر کمار کا مسکراتا ہوا گورا چہرہ خلوص اور محبت کی زندہ تصویر تھا۔

اکرم نے سرجھکا کے شکریہ ادا کیا۔

دھرمیندر کمار نے واپس جاتے ہوئے اپنی بیوی سے زیرِ لب کہا " بکواس "

جوشی جی نے اکرم کو گلے لگا لیا " واہ۔ واہ۔ کیا تصویر بنائی ہے تم نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کی لاج رکھ لی " جوشی نے جوش میں آ کے اکرم کا منہ چوم لیا " ارے اکرم تم GENIUS ہو GENIUS کیوں سیٹھ "

جوشی جی نے سیٹھ بانکڑیا سے داد چاہی۔

سیٹھ بانکڑیا بڑی دیر تک اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے رہتے بولے " کیا بتاؤں اُن دنوں میں نے تمہاری قدر نہیں کی۔ میری غلطی تھی۔ پارٹنر اب تم کسی دن دفتر میں آ جاؤ۔ مگر دفتر میں آنے سے پہلے ٹیلی فون کر لینا اور دو فلموں کے کانٹریکٹ پر دستخط کر کے اپنا ایڈوانس لے جانا "

اکرم نے پھر سرجھکا کے سیٹھ بانکڑیا کا شکریہ ادا کیا۔

اکرم سے دور جا کے سیٹھ بانکڑیا نے جوشی سے کہا۔

" جوشی جی بال بال بچ گئے۔ یہ اکرم تو پھر میرے چار لاکھ پر پانی پھیر دیتا۔"

" اجی کیا پوچھتے ہو سیٹھ۔ ایسی بنڈل پکچر زندگی میں میں نے نہیں دیکھی۔ سالے کو شاٹ لینے کی تمیز

نہیں اور آجاتے ہیں گھر سے ڈائریکٹر بننے! میں تو سیٹ پر کلیپر لوائے نہ رکھوں اسے!" جوشی جی اور سیٹھ بانکڑیا اسی طرح باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

راج شمشاد اور رنجن نے اک بڑی خوب صورت سی تثلیث بنا کر اکرم کو گھیر لیا۔ وہ بہت ہی عمدہ ساڑیاں اور بلاؤز پہن کے آئی تھیں۔ ان کی نگاہیں بار بار اکرم کی تصویر کی تعریف کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بھٹک جاتیں۔ وہ نگاہیں دراصل فوٹوگرافر کو تلاش کر رہی تھیں جو اس موقعے کا پوز لے لے۔ عمدہ سا فوٹو لے لے تو یقیناً کل کے اخبار میں آجائے گا۔ حالانکہ ان تینوں میں سے کسی نے کسان میں کام نہ کیا تھا مگر یہ پبلسٹی کرنے والے کہاں اصلی کام کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ تو خوب صورت اور مشہور چہرے دیکھتے ہیں۔

شمشاد نے مسکرا کر اپنی گہری گہری آنکھوں سے اکرم کو دیکھتے ہوئے نیم اُداس لہجے میں کہا "کئی جگہ تو میں رو ہی پڑی۔ آپ بڑے ظالم ہیں"

راج نے چہک کے کہا "ارے ان کے ظلم کا کچھ مت پوچھو یہ تو بہت بڑے شاعر ہیں۔ ہماری جیسی اداکاروں سے تو بات کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ اب تو یہ پکچر سلور جوبلی منائے گی۔ اب ان کے ٹھاٹھ دیکھنا۔ ہم غریبوں سے ...."

اتنے میں اتفاق سے ایک فوٹوگرافر آگیا۔ تینوں ہیروئنوں کی جان میں جان آئی۔ راج اپنا فقرہ بیچ میں چھوڑ کر اپنی ساڑی کا پلو ٹھیک کرنے لگی۔ جلدی جلدی تینوں ہیروئنوں نے اکرم کے ساتھ ایک دلفریب پوز لیا۔ کیمرے میں کھٹکا سا ہوا اور ختم۔ تینوں ہیروئین جلدی جلدی سے اکرم سے ہاتھ ملا کے بلکہ ہاتھ چھڑا کے بھاگیں۔

راستے میں شمشاد نے کہا "یا اللہ اتنا خوب صورت آدمی ہے۔ مگر ایسی بور پکچر کیوں بناتا ہے اور کیسے دلچسپی ہے۔ کسانوں کی زمین میں۔ یہاں۔ بمبئی میں تو ایک کھیت بھی نہیں"

راج نے کہا "بمبئی میں نہیں ہیں۔ مگر بمبئی کے باہر تو ہیں"
شمشاد نے چڑکے کہا "گر وہاں کھیت ہیں۔ وہاں سینما گھر تو نہیں ہیں۔ کون اس تصویر کو دلچسپی سے دیکھے گا"
رنجنا بولی "ہاں ری۔ اور ہیروئن کے کپڑے دیکھے تم نے ایک بھی تو اچھا ڈریس نہیں دیا اس کو۔ اری جب بھیرو بھائی مہتہ کی پکچر "کسان پتری" میں کام کر رہی تھی تو میرا بھی کسان کی بیٹی ہی کا رول تھا اور اسی کسان کی طرح وہ غریب تھا مگر بھیرو بھائی نے مجھے پندرہ نئے ڈریس دئے تھے"
"اری چھوڑو" راج نے چڑکر کہا "کس کی بات کرتی ہو۔ یہ اکرم سر پھرا ہے دو دن بھی اس کی پکچر چل جائے تو میرا نام راج نہیں گیراج رکھ دینا"
اس پر رنجنا اور شمشاد بہت ہنسیں۔ رنجنا نے تعریفی نگاہوں سے راج کی طرف دیکھ کے کہا "ہائے راج سے گیراج۔ ارے بھئی۔ سچ مچ راج تو بڑی انٹلی جوئیل باتیں کرتی ہے"

جب مجمع چھٹ گیا اور بہت کم لوگ رہ گئے۔ اس وقت جان رولینڈ اکرم کو ایک طرف لے گیا اس نے اکرم سے بڑے معمولی طریقے سے مصافحہ کیا اور پھر بڑی سنجیدہ آواز میں اس سے کہا "تم نے ایک عمدہ تصویر بنائی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں میں اسے اپنے سینما میں چلانا پسند کروں گا"
"ماتر و میں!" اکرم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

رولینڈ نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا۔

اکرم چکرا گیا "کسان" ماتروین؛ ایسا تو اس نے اپنے کسی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔

رولینڈ نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا "مجھے نیویارک سے اس کی منظوری منگانی پڑے گی۔ مگر یہ ایک ضابطے کی کارروائی ہے۔ اس میں میرے خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔ میں تمہیں چار ہفتے کی گارنٹی دیتا ہوں۔"

ماتروین چار ہفتے؛ جہاں بڑی سے بڑی تصویر دو ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہرائی جاتی تھی نکال کے پھینک دی جاتی تھی جہاں کوئی ہندوستانی تصویر آج تک پیش نہ کی گئی تھی جہاں صرف امریکن تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔

اکرم نے ہاتھ کے اشارے سے سیٹھ کرتر چند کو بلایا جس کے پاس تصویر کا نیگیٹو گروی تھا تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد سیٹھ کرتر چند جان رولینڈ اور اکرم اور ستیہ رائے نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

"روزی یہ تو ایک سپنا ہے۔"

"بہت جلدی ہماری شادی ہو جائے گی اب" روزی نے رُک رُک کے کہا۔

اکرم ناچتے ناچتے رُک گیا۔

ایک اور جوڑے نے اکرم کی طرف گھور کے کہا "آگے چلو"

والز بج رہا تھا مگر اکرم کیا سوچ رہا تھا۔ یکایک گھورتے ہوئے ناچتے ہوئے جوڑے کی طرف دیکھ کے معافی مانگ کے مسکرایا اس کے ہاتھ پھر روزی کی کمر کی طرف گئے اور والز بجنے لگا

"روزی کیا تمہیں افسوس تو نہیں ہوگا کہ تم نے دوسرے مذہب کے آدمی سے شادی کی؟"

روزی نے کہا "میرا تمہارا مذہب تو ایک ہے محبت؟"

اکرم روزی کا جواب سننے کے لئے پھر رک گیا تھا پھر اُسے ایک ناچتے ہوئے بوڑھے کی خفگی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ قہقہہ مار کے ہنس پڑا اور روزی کو اپنے ساتھ ہال کے باہر کھینچ لایا "آؤ روزی آج ہم ایک سوبیں تک چلتے جائیں گے۔ پیدل!"

"کہاں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں! محبت کی کوئی منزل ہوتی ہے؟"

"آؤ ستاروں سے پوچھیں" روزی نے مشورہ دیا۔

"آؤ"

روزی نے اپنی دونوں باہیں آسمان کی طرف پھیلا کے کہا "اے ستارو!"

اکرم نے اپنے دونوں بازو روزی کی کمر میں ڈال کے اسے اُٹھا لیا، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "اے کہکشاں!"

ایک سپاہی نے رُک کے اُسے ٹھوکا دیا "اے تم کیا نشے میں ہے؟"

"کیا پیلا ہے کا جو؟" سپاہی نے پوچھا۔

"نہیں؟"

"ٹھرا؟"

"نہیں"

"پھر کیا پڑے لاہے تو؟"

"محبت!"۔

پولیس والا مسکرایا "احمق۔ محبت کرنے سے یہی بہتر ہے کہ تو پولیس میں نوکری کرلے"

"کیوں"

"کبھی میں نے بھی محبت کی تھی آج میرے سات بچے ہیں۔ تنخواہ ستر روپے ہے۔ محبت کدھر گئی؟"

پولیس والے نے گھور کر اکرم کی طرف دیکھا جیسے اُسے کچا کھا جائے گا۔

اکرم نے اک آہ بھر کے روزی سے کہا "آؤ روزی گھر چلیں۔ یہ آدمی بھی مادّیت پرست معلوم ہوتا ہے"

شہر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے فلمز ڈویژن کی طرف سے ایک نمائش جاری تھی جس میں امریکی، روسی، انگریزی، جاپانی، اطالوی، چینی، چیک اور فرانسیسی فلمیں دکھائی جارہی تھیں مختلف ملکوں سے برگزیدہ فلمی ہستیاں بھی اس موقع پر مدعو تھیں۔ روس سے پدووکن اور چرخوسف اور لرکر سے فرینک کپرا ایسی مشہور ہستیوں نے بمبئی کے فلمی حلقوں میں اک ہل چل سی دوڑا دی تھی۔ ہندوستان میں بین الاقوامی فلموں کی یہ پہلی نمائش تھی اور اس قدر کامیاب تھی کہ ٹکٹ گھروں پر گھنٹوں کیو لگا رہتا تھا یہ شو کئی کئی دن پہلے بک ہو جاتا تھا۔ بین الاقوامی فلموں میں روسی، اطالوی اور چیک فلموں میں لوگوں نے بڑی دل چسپی ظاہر کی کیونکہ امریکی فلمیں تو ہر روز دیکھتے تھے۔ یہ اُن کے لئے پہلا موقع تھا کہ وہ دوسرے ملکوں کی فلموں کے موضوعات اُن کی قومی ہیئت ترتیب و تدوین اور سٹائل سے آگاہ ہو سکیں۔ اور دل ہی دل میں ذہنی طور پر موازنہ کر سکیں۔ روسی فلموں میں "فال آف برلن" اور "ڈان باس مائنرز" بہت پسند کی گئیں۔ اور پبلک کے اصرار پر اُن کے کئی شو کئے گئے۔ اس کے بعد اطالوی فلموں کا نمبر آتا تھا "بائیسکل چور" "روئن سٹی" "مریکل آف میلان" کو عوام نے بہت سراہا چیک گڑیوں کی فلمیں بھی پسند کی گئیں۔ اطالوی نئی حقیقت نگاری کے اسکول سے ہٹ کے کچھ لوگوں کو فرانسیسی فلموں

میں بات کیے جانے کی جواداسے بہت بھائی، چینی فلموں میں "سفید بالوں والی لڑکی" نے ہر ایک کے دل کو موہ لیا۔ چینی فلموں کا انداز ہماری فلموں سے ملتا جلتا تھا۔ اُن کی طرز ادا میں ایک ایسی ایشیائیت تھی جو انہیں ہمارے بہت قریب لے آتی تھی۔ اس نمائش میں حصہ لینے والے ہر ملک نے اس موقع پر ایک فلمی وفد بھی بھیجا تھا۔ مختلف وفدوں کا حکومت اور پبلک کی طرف سے شاندار سواگت کیا گیا۔ اکرم آج رات ہی ایکسلسیر تھیٹر سے واپس آیا تھا جس میں روسی وفد کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ ہندوستانی فلم کی تمام اہم اور نامور ہستیاں اس موقع پر موجود تھیں۔ لیکن جس چیز نے اس سواگت کو یادگار بنا دیا وہ پنڈت نہرو کی اس کلچرل سواگت میں غیر متوقع شرکت تھی۔ پنڈت جی اسی دن لنڈن سے لوٹے تھے اور سفر کی تکان اور اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود انہوں نے استقبالیہ کمیٹی کی استدعا پر اس میں شرکت کی تھی۔ ایکسلسیر تھیٹر کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلکہ لوگ اُس کے باہر بھی کھڑے تھے۔ ہر حیثیت سے یہ یادگار دن تھا۔ اس لئے دوسرے دن اکرم کو بہت غصہ آیا جب اس نے تنگ نظر روزناموں میں یہ پڑھا کہ پنڈت جی کو اس استقبالیہ جلسے میں شرکت نہیں کرنی چاہیے تھی وہ بہت صاف صاف کھل کر تو نہ کہہ سکتے تھے کیونکہ ایک عام سیدھے سادھے خوبصورت کلچرل جلسے کی مخالفت کرنا بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس لئے دبے الفاظ میں اور منہ بنا کر اور طرح طرح کی دور از کار باتیں کہہ کر وہ پنڈت جی کے اس اقدام کی مذمت کر رہے تھے۔

جسونت نے کہا "میں تم سے کہتا نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں تنگ نظروں اور رجعت پرستوں کا ابھی تک ایک بہت بڑا گروہ ہے جو پنڈت جی کی صلح کل پالیسی سے اتفاق نہیں رکھتا جو ہر موقع پر اس کی پیٹھ میں چھرا بھونکنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس لئے وہ لوگ جو باشعور ہیں، اور صلح جو ہیں ان کے لئے یہی جان لینا کافی ہے کہ پنڈت نہرو اور ان کی حکومت امن کے لئے خاطر خواہ کوشش کر رہی ہے۔ ہمیں خود بھی اس کوشش میں ان کا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ اپنی ترقی پسند کاوشوں

کو جاری رکھتے ہوئے پنڈت نہرو اور اپنی حکومت کی صلح جو پالیسی کے ہاتھ مضبوط کرنے ہوں گے۔"

رضیہ بڑے غور سے اس گفتگو کو سُن رہی تھی ان پچھلے سات آٹھ ماہ میں اس نے ذہنی طور پر بہت فاصلہ طے کر لیا تھا" کسان" تصویر کے مکمل کرنے میں اس کی ان تھک کوششوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا وہ دن رات کام کاج میں جٹی رہتی تھی سیٹ پر وہ اکرم کی اسسٹنٹ کا کام باقاعدگی سے کرتی تھی۔ اس کے علاوہ عورتوں کے لباس اور آرائش کا شعبہ بھی اکرم نے رضیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ رضیہ کا خیال تھا کہ شاید رضیہ ضرورت سے زیادہ کام کرتی ہے مگر رضیہ زیادہ کام سے کبھی گھبراتی نہیں تھی بڑی خندہ پیشانی سے روزمرہ کے شوٹنگ کی الجھنوں کو سلجھا دیتی۔

ایک دن رضیہ نے پوچھ لیا" تو جو دن رات کام میں لگی رہتی ہے تیرا جی کبھی گھومنے کو نہیں چاہتا؟ کہیں تفریح کرنے کو رضی؟"

رضیہ یکایک سہی پڑ گئی بولی" گھومنے کو؟ ——— اب نہیں چاہتا اب کسی کے ساتھ کہیں تفریح کرنے کو نہیں چاہتا!"

رضیہ نے اسے گلے سے لگا لیا" اسی لئے زیادہ کام کرتی ہے؟"

رضیہ نے کہا" نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھے کام میں بہت لطف آتا ہے فلم کا کام مجھے پسند ہے تو پھر میں اُسے اچھی طرح سیکھ کیوں نہ لوں؟"

"فلم ڈائرکٹر بنے گی؟ ایک عورت ہو کر؟"

"عورت ایک فلم ڈائرکٹر کیوں نہیں بن سکتی؟"

رضیہ نے ہنس کر کہا" میں جانتی ہوں۔ تو اس لئے زیادہ کام کرتی ہے کہ کسی کو بھول سکے؟"

رضیہ چپ ہو گئی۔ بہت دیر کے بعد بولی۔ گویا اب تک اپنا دل ٹٹول رہی تھی" یہ بھی ٹھیک ہے رضیہ میں اب تک عشرت کو بھولی نہیں ہوں۔ گر اسے بھلا دینا چاہتی ہوں۔ مگر اس کام میں زیادہ دل لگانا

صرف اس لئے نہیں ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے۔ مگر سب سے بڑی وجہ نہیں ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ کہ کام۔ خود اس کام میں مجھے بڑی دلچسپی ہے میں سمجھ نہیں سکتی۔ ہم میں سے بہت سی لڑکیاں عمدہ ساڑی پہنے لپ اسٹک اور سُرخی لگائے زیوروں میں چھم چھماتی ہوئی سیٹ پر اس کونے سے اُس کونے تک نکل جاتی ہیں اور کبھی یہ نہیں سوچتیں کہ فلم کیسے تیار ہوتی ہے۔ کیونکر تیار ہوتی ہے اس کی تیاری میں کون سے مراحل آتے ہیں کون سے مسئلے ہے اُنہیں کس طرح سے حل کیا جاسکتا ہے ایک چیز جو ہماری روزمرہ کی زندگی ہے جس کی بنیاد پر ہماری ساری زندگی چلتی ہے ایک اسی سے ہم اس قدر لاپرواہ ہو جاتی ہیں کہ دل میں ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ کب کسی طرح جلدی سے شوٹنگ ختم ہو اور ہم بھاگ جائیں۔ یہ بھاگنا ہمیں بہت مہنگا پڑ رہا ہے رضیہ"

رفعیہ یکایک خاموش ہوگئی۔ اتنی لمبی تقریر اس نے زندگی میں کبھی نہ کی تھی اب جب وہ ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ گئی تو خود اپنے آپ پر اُسے حیرت ہونے لگی اور رضیہ کا تو مُنہ کھُلے کا کھُلا ہی رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رضیہ آہستہ سے بولی "اری کم بخت تو تو بہت آگے بڑھ گئی"

رضیہ کے ایک اس جملے نے رفعیہ کی ہمت اور بندھا دی۔ اب تو وہ اکرم کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے سماجی کاموں میں بھی حصہ بٹاتی تھی۔ رضیہ بھی کام کرتی تھی مگر اسے اپنے لباس میں اپنی تزئین و آرائش ہی سے کم فرصت ملتی تھی۔ روزی کہ ان دونوں سے حسین تھی اور وہ ایک زیادہ آزاد ماحول میں پلی تھی اور مسلسل مشق کرنے سے اب اُسے اپنے میک اپ میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر ابھی وہ نوگرفتار محبت تھی کام کم کرتی تھی اکرم کو زیادہ دیکھتی تھی۔ آہیں زیادہ بھرتی تھی اور خاص طور پر جب کبھی اکرم کہیں اس کے نزدیک ہوتا تو اس کے گردوپیش کیا ہو رہا ہے اسے کچھ یاد نہ رہتا بس وہ مڑ مڑ کر اکرم کو دیکھنے لگتی اور رفعیہ کو اُسے ڈانٹنا پڑتا اور روزی کا چہرہ اک دم سُرخ ہو جاتا اور وہ رفعیہ سے معافی مانگ کر پھر اپنے کام میں لگ جاتی۔ مگر پھر جب کبھی اکرم اُسے دکھائی

دے جاتا پھر اپنے گردوپیش کی دنیا کو بھول جاتی۔ ان دنوں رضیہ کے لئے سارا آسمان گلابی تھا اور ساری زمین اک نیلگوں سبزے میں کھوئی ہوئی تھی۔ رضیہ رومی کو پرشش میں لاتے ہوئے اپنے دل میں اک چبھن سی محسوس کرتی۔ اک لمحے کے لئے عشرت اس کی نگاہوں کے سامنے اُبھرا ہوتا مگر وہ پھر اس کی یاد کو بڑی سختی سے دل کے کسی کونے کھدرے میں دھکیل دیتی اور اپنے ہونٹ چباتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

اس وقت جسونت اور اکرم کو رات کے جلسے پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر اُسے یاد آیا کہ پرسوں بمبئی شانتی سبھا کی فلم کمیٹی کی طرف سے باہر سے آئے ہوئے مختلف ممالک کے فلمی وفدوں کو سٹنی سٹوڈیو میں ایک دعوت دی جانے والی ہے جس کا ذمہ اکرم اور اس کے ساتھیوں نے لیا ہے اور ابھی اس سلسلے میں کچھ کام نہیں ہوا ہے۔

رضیہ نے اکرم کو یاد دلاتے ہوئے کہا " اُٹھو کب تک یہاں بحث کرتے رہو گے۔ اس دعوت کے متعلق کہاں کہاں جانا ہے۔ کچھ پتہ بھی نہیں ہے "

اکرم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جسونت نے پوچھا " اس دعوت میں کن لوگوں کو بلا رہے ہو "

" تمام فلمی وفدوں کو "

" امریکیوں کو بھی" ستیہ رائے نے چلا کے پوچھا " کم بخت جہاں جاتے ہیں فساد کھڑا کر دیتے ہیں۔ کوریا میں، انڈو چائنا میں، فارموسا میں، جاپان میں، شانت سگر کے جزیروں میں، فرانس میں، اٹلی میں، برطانیہ میں، ارے جہاں جاؤ۔ یہ سب لوگ اپنی مشین گن، اپنا ہوائی اڈا، ایٹم بم لئے ہر جگہ موجود ہیں "

" کیوں نہیں۔ بلائیں گے۔ ضرور بلائیں گے "

" کام کرتے ہو شانتی سبھا کا۔ بلاتے ہو جنگ بازوں کو ۔۔۔ "

جسونت نے کہا "مجھے ستیہ رائے کی دلیل میں کچھ وزن معلوم ہوتا ہے"

"میرا خیال ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے کہ امریکی جنگ باز ہیں۔ ایک آدمی جنگ باز ہو سکتا ہے دس آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں، دس ہزار آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں لیکن دس کروڑ آدمی جنگ باز نہیں ہو سکتے۔ کیا تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ امریکہ کے شہروں اور دیہاتوں میں انسان نہیں بستے۔ کیا ان انسانوں کے گھر نہیں ہیں۔ ان گھروں میں ان کے محبوب بچے، عورتیں، مائیں، باپ اور بھائی بہنیں نہیں رہتے۔ کیا تم مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہ لوگ اپنے سر پر ایٹم بم کی تلوار لٹکتے ہوئے نہیں دیکھتے کیا ان کو یہ بھروسہ ہے کہ اگر کوئی جنگ شروع ہوئی، تو یہ بم اُن کے گھروں پر نہیں گرے گا کیا وہ لوگ اوپر سے نہ سہی دل ہی دل میں یہ دعا نہیں مانگتے ہوں گے یا خدا کسی طرح یہ جنگ کی مصیبت ٹل جائے، کسی طرح سے ٹل جائے؟ کیا وہ ایسا نہیں سوچتے ہوں گے میرا خیال ہے کہ ضرور سوچتے ہوں گے۔ کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ حکومتیں بُری ہو سکتی ہیں، سماج بُرے ہو سکتے ہیں معاشرے بُرے ہو سکتے ہیں، معاشی نظام بُرے ہو سکتے ہیں۔ لیکن لوگ بُرے نہیں ہوتے۔ چند آدمی بُرے ہو سکتے ہیں لیکن سارے لوگ بُرے نہیں ہوتے"

"جناب کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا" ستیہ رائے نے جھلا کے کہا "آج کل تو جو اخبار پڑھو جنگ کی خبریں آتی ہیں جو امریکی جنرل یا ایڈمرل اٹھتا ہے۔ ایٹم بم کا سونٹا گھماتے ہوئے دھمکی آمیز تقریر کرتا ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ ان کو مت بلاؤ۔ یہ لوگ ساری دنیا پر اپنا جھنڈا گاڑنے کی فکر میں ہیں یہ لوگ پکے جنگ باز ہیں"

اکرم نے کہا "تم کہتے ہو وہ لوگ جنگ باز ہیں وہ لوگ کہتے ہیں ساری شرارت کی جڑ کمیونسٹ ہیں پھر فیصلہ کس طرح سے ہوگا؟" "ایٹم بم سے" وشوے نے سر ہلا کے کہا۔

اکرم نے ہنس کے کہا "فیصلے ہی کی ایک صورت ہے دونوں کو ایک ہی دعوت میں بلایا جائے

کم از کم میں تو بلاؤں گا اسی دعوت میں "

جسونت نے شبہے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم بلاؤ گے مگر میرا خیال ہے وہ نہیں آئیں گے۔ انگریز آجائیں تو آجائیں مگر نہ کنیڈین آئیں گے نہ فرانسیسی، نہ اطالوی وفد کے ممبر شانتی بھائی فلم کمیٹی کا جلسہ ہے۔ امریکی تو کسی حالت میں نہیں آئیں گے دیکھتے ہو یہ سرد جنگ کتنے زوروں پر ہے "

اکرم نے کہا "وہ آئیں نہ آئیں میں تو ضرور بلاؤں گا "

مگر شانتی سبھا کی فلم کمیٹی کی دعوت خلاف توقع بہت کامیاب رہی امریکن بھی آئے اور برطانوی بھی اور کنیڈین بھی۔ فرانسیسی بھی اور اطالوی بھی۔ روسی چینی اور چیک وفدوں کے اراکین بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ وہاں فرینک کیپرا تھے اور پدوکن تھے اور فرانسیسی ڈائرکٹر اور اطالوی کیمرہ مین۔ کنیڈین اور چینی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کے تمام ذمہ دار افراد برگزیدہ پروڈیوسر اور فنانسر تمام بڑے بڑے اداکار موجود تھے۔ سنٹرل سٹوڈیو کے نمبر دو سٹیج کا شاندار ہال بہت عمدہ طریقے سے سجایا گیا تھا ہندوستانی طریقے سے یہاں نہ کرسیاں تھیں نہ میز فرش پر بڑے بڑے نرم اور گداز غالیچے بچھا دئے گئے تھے اور سب لوگ شرقی بھی اور مغربی، ایشیائی اور یورپین سب لوگ ٹانگیں پسارے یا ٹانگیں دبائے یا ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے یا آلتی پالتی مارے۔ صحیح ہندوستانی طریقے سے بیٹھے تھے اور ہندوستانی اداکاروں کی طرف سے پیش کئے گئے کلچرل پروگرام کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور سن رہے تھے یہ ایک عجیب وغریب دعوت تھی جو رات کے تین بجے تک

چلتی رہی۔ کوئی وہاں سے نہیں ہلا اس قدر دلچسپ پروگرام تھا۔ بار بار پروگرام کے مختلف حصوں کو معزز مہمانوں کے اصرار پر دہرایا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں امریکی، روسی، چینی اور ہندوستانی فرانسیسی اور اطالوی۔ شیر و شکر ہو کے ونس مور بول رہے تھے جیسے کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ تھے۔

اور اس ہال سے باہر سرد جنگ جاری تھی۔ مورچے لگے تھے۔ خندقیں کھدی تھیں، ایشیا میں کئی جگہوں پر اس وقت بھی بمباری ہو رہی تھی۔ ہوائی جہاز کوریا میں نیپلام کا آتش گیر مادہ غریب کوریائی کسانوں کے چھوٹے چھوٹے گھروں پر برسا رہے تھے آج کی اس تاریک رات میں کہیں پر کوئی گھر بھک سے اُڑ گیا۔ کوئی بچہ یتیم ہو گیا۔ کوئی بیوی بیوہ ہو گئی۔ کوئی ماں اپنے جوان بیٹے کی لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔ اور لاکھوں یورپی گھروں میں مائیں اور بچے۔ بڈھے اور جوان۔ آئندہ جنگ کے خوف سے سہمے ہوئے اس وقت بھی یہ سوچ رہے تھے کہ کل کی صبح کون سی خبر لائے گی۔

لیکن اس ہال میں کتنا امن تھا۔ کتنا سکون تھا۔ کتنی مسرت کتنا بھروسہ یہاں پر قہقہے تھے اور ناچ اور گیت اور تالیاں، یہاں دوستی کے پرجوش مصافحے تھے اور نگاہوں میں دوستی اور رفاقت، انسانیت، بھروسے اور مہربانی کی چمک اور تابانی!

اس ہال میں تمام دنیا کے مختلف قوموں، نسلوں، رنگوں اور نظریوں کے لوگ جمع تھے۔ لوگ جو الگ الگ ایک دوسرے سے برگشتہ خاطر تھے۔ مایوس تھے اور نفرت کے نقطے پر پہنچتے جا رہے تھے۔ شاید جب وہ اس ہال میں آئے تو اپنی تمام مجبوریاں، کمزوریاں اور اپنے پہلے سے سوچے سمجھے ہوئے خیال اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن جب یہاں ان کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو پردے ہٹ گئے اور ساتھ بیٹھے ہوئے ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک ہی گیت کو پسند کر سکتے ہیں ایک ناچ پر تالی بجا سکتے ہیں۔ ایک ہی مذاق پر ہنس سکتے ہیں۔ وہ آدمی تھے اور صلح سے رہ سکتے تھے ہاں! ہال کے اندر! ——— تو پھر ہال کے باہر کیوں نہیں۔

ہال کے اندر چند گھنٹے !۔۔۔۔۔۔ چند گھنٹے ؟۔۔۔۔۔۔ تو پھر چند برس کیوں نہیں ؟ چند صدیاں کیوں نہیں ؟ ہمیشہ کے لئے کیوں نہ ہم صلح سے رہیں ۔ یہ جنگ کا خوف ہمیشہ کے لئے کیوں نہ انسان کے دل سے مٹادیں۔

جنگل کے خوف کی طرح ! رات کی تاریکی کے خوف کی طرح ۔ بادلوں کی گرج کے خوف کی طرح۔ اس جنگ کے خوف کو بھی مہذب انسان کے دل سے مٹادیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

"آج کی رات بڑی تاریخی تھی" اکرم نے چلتے چلتے رضیہ اور جسونت سے کہا۔
صبح کے چار بجے تھے وہ لوگ دعوت کے خاتمے کے بعد اپنی بستی کی طرف جارہے تھے
جسونت نے کہا "مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آج کی رات اُمید کا جنم ہوا ہے"
"جیسے اندھیرا بہت دور دور تک چھٹ گیا ہے" رضیہ نے آہستہ سے کہا۔
رضیہ نے گرانڈ روڈ کے پل پر کھڑے ہو کے چاروں طرف دیکھا۔ رات نے اپنے پر سمیٹ لئے تھے سمندری ہواؤں میں تازہ نمک کا سوندھاپن تھا۔ مشرقی آسمان پر صبح کی تنویر کھل اُٹھی تھی۔ یکایک ایک سپید کومل شبنم میں شرابور اپنے کناروں سے اوس کے قطرے چھلکاتی ہوئی اپنی باریک آواز کوکتی ہوئی پل کے نیچے سے گزر گئی۔ اور چاروں طرف اُجالا ہو گیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد رضیہ، رفعیہ کے پاس جھونپڑوں میں آئی اور اس سے کہنے لگی
"عشرت سائیں ہسپتال میں ہے اور مر رہا ہے"

رفعیہ کا چہرہ اک دم پیلا پڑ گیا اتنے زور سے اس نے سانس اندر کو کھینچی کہ اس کے حلق سے ایک عجیب زخمی جانور کی سی چیخ نکل گئی۔ رضیہ نے اُسے سہارا دیا۔ مگر وہ رفعیہ کا ردعمل دیکھ کر حیران ہوگئی۔ اتنے عرصے سے کبھی اس کے اور رفعیہ کے درمیان عشرت کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اگر کبھی رضیہ نے بات کی بھی۔ تو رفعیہ نے ہنس کر ٹال دیا۔ یا ایسی لاپرواہی سے اس کا ذکر کیا۔ جیسے وہ اُسے بھول چکی ہے۔ لیکن اب رفعیہ کو اس حالت میں دیکھ کر رضیہ کو اپنی رائے بدلنا پڑی۔ اس نے سوچا اگر مجھے معلوم ہوتا۔ یہ موئی اسے اپنی جان کو لگائے گی تو میں یہ خبر دوسرے طریقے سے آہستہ آہستہ سے سُناتی۔

تھوڑی دیر کے بعد رفعیہ نے پوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟" اس کی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔

"سائیں ہسپتال میں"

"سائین ہسپتال کہاں ہے ؟"

"سائین میں ؛ جہاں پہلے ملٹری کی بارکیں ہوا کرتی تھیں ان انہیں اب جنرل ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا ہے ۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا ؟"

"مجھے ٹھاکر گیج راج سنگھ اپنے ایکٹر ایونین کے پریذیڈنٹ نے بتایا وہ اُسے دیکھنے گئے تھے ۔ کیوں کہ عشرت نے اُسے بلایا تھا اور اس نے ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے عشرت نے خاص طور پر گ ج سنگھ سے کہا تھا کہ رضیہ کو میری بیماری کی اطلاع نہ ملے ۔ مگر چونکہ اب وہ مر رہا ہے اس لئے میں نے ۔۔۔"

رضیہ نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا ۔ رضیہ نے اپنا پرس اُٹھایا اور جھونپڑے سے باہر نکل گئی ۔

"کہاں جا رہی ہے تو ـــــــــ" رضیہ نے چلّا کے پوچھا

مگر رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا ۔

وہ بستی کی گلی سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی ۔ وہاں سے بائیکلہ کے پُل تک بھاگتی ہوئی گئی ۔ ایک دیوانی عورت کی طرح ۔ جب وہ بائیکلہ پل کے بس اسٹینڈ پر پہنچی تو اس کا دم پھول رہا تھا اس کا سارا جسم پسینے میں تربتر ہو رہا تھا ۔ لیکن اُسے اپنی جسمانی تکلیف کا کوئی خیال نہ تھا ۔ وہاں سے اس نے سائین جانے والی تیز بس لی اور اس میں بیٹھ کر سائین ہسپتال کے ناکے پر جا اُتری ۔ اور سیدھی اندر چلی گئی ۔ مریضوں سے ملاقات کا وقت ساڑھے چار بجے کا تھا اور ابھی اس میں ایک گھنٹہ باقی تھا ۔ کچھ عرصہ تو نرسوں اور ڈاکٹروں سے پوچھنے میں گزر گیا کہ عشرت کو کون سے و ۔ ڈ

میں داخل کیا گیا تھا اس کے بعد رفعیہ دیر تک ہسپتال کی سڑکوں اور پگ ڈنڈیوں پر ٹہلتی رہی گھاس کے قطعوں میں کہیں کہیں پھولوں نے کھلنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہسپتال کی بیمار فضا میں ان کی کوشش کچھ عجیب مضحکہ خیز سی معلوم ہو رہی تھی۔ سبزے سے بھی فنائل اور پٹیوں کی بو آ رہی تھی۔ سرخ اینٹوں کی لمبی لمبی نیچی بارکیں ایک عجیب افسردہ منظر پیش کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ملاقاتیوں کی تعداد بڑھتی گئی بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں پھل اور پھول تھے۔ ان سے رفعیہ کو بھی خیال آیا اور وہ دوڑی دوڑی ہسپتال کے باہر گئی۔ جہاں دو تین ٹھیلے والے دوکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ اُن لوگوں کی شرح نرخ بازار سے دوگنی تھی۔ پھر بھی رفعیہ نے آدھی درجن موسمبیاں اور دو سیب خرید لئے اور گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا اُسے چار آنے میں مل گیا پھل اور گلاب لے کر وہ پھر ہسپتال کے اندر آ گئی

عشرت بی وارڈ میں داخل تھا۔ رفعیہ جلدی سے بی وارڈ کی روشوں کی طرف گئی کیوں کہ ہسپتال میں اب ملاقات کے وقت کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اور لوگ باگ بچے عورتیں مائیں اور بھائی باپ اور بہنیں دوست اور رشتہ دار مریضوں کو دیکھنے کے لئے مختلف وارڈوں میں گھس رہے تھے۔

رفعیہ بھی جلدی سے بی وارڈ میں گھس گئی۔ جنرل وارڈ کے اندر قطار در قطار پلنگوں پر مریض بیٹھے یا لیٹے ہوئے اپنے ملاقاتیوں سے باتیں شروع کر رہے تھے۔ ہسپتال کی زندگی میں مریضوں کے لئے یہ زندگی کے سب سے دل خوش کن لمحے ہوتے ہیں جب باہر کی زندگی کے تازہ جھونکے ہسپتال کی بیمار فضا میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ اُمید، مسرت اور مہکتی ہوئی محبت کی شادمانی اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ مریضوں کے بھوکے ترسے ہوئے چہرے بیمار اور اداس چہرے اس مسرت کی طرف اس اُمید اور اشک کے ملے جلے جذبات سے دیکھتے ہیں جیسے زندگی کو اپنے دانتوں اپنے ہاتھوں اور اپنے پنجوں سے پکڑ کر اسی سے لٹک جائیں گے۔

رفعیہ ایک بار سارے وارڈ کا چکر لگا کے گھوم گئی۔ اسے عشرت کہیں دکھائی نہ دیا۔

دوسری بار وہ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہر ایک پلنگ کو غور سے دیکھتے ہوئے نرس کی طرف بڑھ رہی تھی تاکہ اس سے پوچھے کہ عشرت کہاں ہے کہیں اس کا پتہ بتانے میں نرس نے غلطی تو نہیں کی دوسری بار وہ دائیں دیوار سے لگے ہوئے بہت سے پلنگوں کو دیکھتی ہوئی مرکز میں بچھے ہوئے نرس کی میز کی طرف جا رہی تھی کہ کسی نے اُسے نحیف آواز میں پکارا۔

" رفعیہ "

رفعیہ نے پلٹ کر دیکھا۔

یمین کے بیڈ سے ایک سیاہ دھوانکھا ہوا چہرہ اس کی طرف تک رہا تھا۔ آنکھیں گہرے گڑھوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ رخسار اندر کو گھسے ہوئے تھے حلقوں پتلی گردن سے باہر کبھی پرانے درخت کی گرہ بند جڑ کی طرح جو زمین سے اُکھڑ کر باہر آگئی ہو۔ ایک پتلا سانولا سا ہاتھ اُٹھا اور پھر پلنگ پر گر گیا۔ رفعیہ نے بڑی حیرت سے اس اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب گئی، اور پوچھنے لگی۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کون ہیں"

وہ تاریک گڑھوں کے اندر کی سیاہ سیاہ پتلیاں ذرا سی چمک گئیں۔ بہت عرصے تک وہ بیمار چہرہ رفعیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ سوکھے سیاہ سے ہونٹ ہلے۔ "عشرت" . .

"عشرت" رفعیہ چیخی اور آس پاس کے پلنگوں کے مریض اور اُن کے ملاقاتی چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے نرس نے کہا "شش شش شور نہ کرو"

"عشرت!" اپنی آواز کی حیرت کو دباتے ہوئے رفعیہ پھر بولی۔ اور عشرت کے پلنگ پر بیٹھ گئی "عشرت!"

"وہ بہت دیر تک اُس مسخ شدہ چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور اُن ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کی اینٹوں سے اس چہرے کو تعمیر کرتی رہی، جو کبھی عشرت کا چہرہ تھا۔ بہت آہستہ سے ان

لبوں سے وہ لب اُبھرے جو کبھی عشرت کے تھے اور ان گالوں پر وہ سُرخی اور صباحت آئی جو کبھی عشرت کی تھی۔ بہت ہی آہستہ سے وہ آنکھیں ان تنگ اور تاریک گڑھوں سے اوپر اُٹھنے لگیں سیاہ دھواں تھا ہوا پُرشکن ماتھا روشن اور صاف ہوتا گیا، اور جب رفیعہ نے اپنے عشرت کو پہچان لیا تو اس نے اس کو نحیف و نزار ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور چپ چاپ رونے لگی ساتے سالوں کی گھٹی ہوئی ترسی ہوئی مجروح محبت اس کی آنکھوں سے اُبل کر باہر آگئی اور اس کے رخساروں پر بہنے لگی اور وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ اور چپ چاپ آنسو پونچھے بغیر روتی رہی۔ اور عشرت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں کانپتا رہا۔ یہ ہاتھ جو ہاتھ نہ تھا مٹی کا ایک پھٹا ہوا ورق تھا۔ ایک ورق کتاب زندگی سے اُکھڑا ہوا جس کے مستقبل کے سب صفحے غائب تھے۔ "تم اس زندگی کا کیا بنا سکتے ہو" "رفیعہ تم بچی نہیں ہو کہ اس کاغذ کی ایک کشتی بنا ڈالو اور اسے زندگی کے دریا میں بہا دو۔ اور اسے لہریں لیتے ہوئے دریا کی سطح پر غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہو۔ تم اس قدر غیر جذباتی بھی نہیں ہو کہ اس کاغذ سے اپنے جوتے پونچھ لو۔ اور اُن کا پالش چمکا لو۔ بہت سے لوگ دوسروں کی زندگیوں سے ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کاغذ پر اب وہ روشن تصویر نہیں ہے جو کبھی تمہاری اُمیدوں کا مرکز تھی کہ تم اس وجہ سے اسے تہہ کر کے اپنے بلاؤز کے نیچے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لو۔ یہ تو ایک شکستہ زندگی کا پھٹا ہوا ورق ہے جو سماج کے تیز و تند طوفان کے تھپیڑے کھاتا ہوا، بلبلا سے اُڑتا ہوا تمہارے سامنے آیا ہے۔ اس پر راہ چلتے قدموں کی کیچڑ ہے۔ گندی نالیوں کی بو ہے، رِستے زخموں کا لہو اور کھنکارتے ہوئے گلوں کا تھوک ہے۔ اس مسلے کچلے پھٹے ہوئے ورق کا تم کیا کرو گی، جس کی زندگی کا ایک حرف بھی اب ٹھیک طرح سے نہیں پڑھا جاتا ـــــــ بھاگ جاؤ رفیعہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

لیکن رفیعہ بھاگی نہیں۔ دوڑی نہیں۔ غائب نہیں ہوئی۔ وہ اس بستر پر بیٹھی سسکتی رہی۔ وہ اد

بھی عشرت کے خاموش انکار کے باوجود اس کے قریب آگئی۔ اس نے عشرت کو سب کے سامنے اپنے گلے سے لگالیا۔ اس نے اس کا ماتھا چوما۔ اس کے جلتے ہوئے رخسار چومے اور اس سے آہوں آنسوؤں اور سسکیوں کے بیچ میں کہا۔

"تم زندہ رہو گے عشرت۔ تم زندہ رہو گے۔ میں تمہیں زندگی دوں گی۔ اپنی ساری زندگی تمہیں دوں گی"
یہ کہتے ہوئے رفیعہ کے چہرے پر وہ جلال تھا۔ جیسے وہ خود کوئی انسان نہ ہو، مسیحا ہو۔ اور مرتے ہوئے عشرت کے دل میں زندگی کا شعلہ بھڑکا، اور حیات کی بجھی ہوئی لو پھر سے سہارا پاکر چمکنے لگی، اور وہ سوچنے لگا۔ سچ، کوئی محبت نہیں کرسکتا عورت کی طرح، اور کوئی قربانی نہیں دے سکتا عورت کی طرح، اور کوئی معاف نہیں کرسکتا عورت کی طرح، اور کوئی کسی کے لئے جان نہیں دے سکتا عورت کی طرح، عورت ایک بہت ہی معمولی ہستی ہوتی ہے۔ بہت ہی معمولی چھوٹی اور نازک۔ لیکن اپنے معمولی سے چھوٹے سے ماحول میں اک خدا کی طرح ہستی ہے۔ وہ تخلیق کرتی ہے اور شب و روز زندگی دیتی ہے۔ اور اس کی کوکھ سے اور سینے سے ہونٹ اور ہاتھ کی انگلیوں سے، زندگی کے لہو اس کے دودھ اس کے شہد اور اس کے گلاب کی مہک آتی ہے

بہت دیر تک رفیعہ عشرت کا سر اپنی آغوش میں لئے بیٹھی رہی اور بہت دیر تک اس کی باتیں سنتی رہی۔ ٹوٹی پھوٹی باتیں، بے ربط سے جملے۔ خاموشیوں کے وقفے جو کبھی کبھی جملوں سے زیادہ لمبے تھے سسکیوں میں ڈوبے ہوئے فقرے بے ڈول بے ہنگم داستان آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے اگلے تین چار دنوں میں رفیعہ کے ذہن میں عشرت کے ماضی کی کہانی اک واضح شکل اختیار کرنے لگی۔ اس کہانی کی کوئی معمولی شکل و صورت نہ تھی۔ وہ ایک مہیب ہولناک پیکر تھی، کیوں کہ عشرت نے زندگی کی تلچھٹ کا آخری قطرہ پیا تھا: اور وہ سماج کی تہ میں ڈوب کر ان کناروں تک ہو آیا تھا، جہاں ناسوروں کے پھول کھلتے اور بیماریوں اور جراثیم کی پیپ لاوے کی طرح بہتی ہے اور غیر سماجی افراد شارک مچھلیوں کی طرح ڈھو

اور بے باک اس تہہ آب دنیا میں اپنا شکار ڈھونڈتے ہیں۔ عشرت نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اور اب دنیا نے اس کی ہڈیوں تک کا گوشت کھا لیا تھا۔ اور اس کی رگوں کا سارا لہو نچوڑ لیا تھا۔ اور اسے لیموں کی نچڑی ہوئی کھال کی طرح باہر کوڑے پر پھینک دیا تھا کسی نہ کسی طرح عشرت اس ہسپتال میں پہنچ گیا تھا، اپنی زندگی کے آخری ایام پورے کرنے کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔

عشرت نے کہا " میں چاہتا نہیں تھا کہ میں تمہیں اپنا چہرہ دکھاؤں "

" کیوں ؟"

" کہہ نہیں سکتا " عشرت نے اپنا دل ٹٹولتے ہوئے آہستہ آہستہ رک رک کر کہا " صرف یہ چاہتا تھا کہ جب مر جاؤں تو لاش تمہارے حوالے کر دی جائے "

" کیوں ؟"

سوچتا ہوں جن لوگوں نے میری زندگی کی بے عزتی کی۔ وہ میری موت کی کیسے عزت کر سکیں گے صرف یہ خیال تھا، تم میرے مرنے کے بعد میری بے عزتی نہیں کر سکو گی "

رضیہ چپ ہو گئی۔

عشرت نے کہا " ہاں مرنے سے پہلے راج کو اپنا چہرہ ضرور دکھانا چاہتا تھا "

درد اک خنجر کی طرح رضیہ کے دل میں گھوما۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی " تمہیں ابھی تک اس سے محبت ہے ؟"

" محبت ؟" عشرت ہنسا۔ اس کی ہنسی بڑی تلخ اور ناخوش گوار تھی۔ عشرت نے بڑی تیزی اور تندی سے کہا " صرف ایک لمحے کے لئے اُسے یہ چہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ آج کا چہرہ میرا یہ چہرہ۔ جیسے یہ آج ہے۔ صرف ایک لمحے کے لئے۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو "

رضیہ نے کہا " ہاں میں سمجھتی ہوں "

عشرت نے کہا "نرس نے مجھے بتایا، ان کا خیال تھا۔ میں ایک ہفتے میں مر جاؤں گا۔ ڈاکٹر نے دس دن پہلے مجھ سے کہا تھا۔ تم اپنے گھر والوں کو اطلاع کر دو۔ مگر میری ہمت نہ ہوئی اور بڑھی اماں کے پاس پیسے بھی نہ ہوں گے آنے کے لئے اور چھوٹے بہن بھائی۔ نہیں۔ نہیں۔ میری ہمت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا میں اکیلا ہی مر جاؤں گا۔ وہ ہفتہ بھی گزر گیا اور میں زندہ ہوں۔"

رفیہ نے کہا "تم زندہ رہو گے۔ میں تمہیں زندہ رکھوں گی۔ اب تم نہیں مرو گے۔ رفیہ کے لہجے میں بڑا یقین تھا۔ عزم اور اعتماد اور بھروسہ یکایک ہسپتال کے وارڈوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ رفیہ نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا "میں کل پھر آؤں گی۔ ہر روز آتی رہوں گی، مت گھبراؤ اب تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔"

ہسپتال کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے رفیہ گھومی، عشرت برابر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اگلے دن عشرت کی حالت زیادہ خراب تھی۔ جب رفعیہ وہاں پہنچی تو اس کی آنکھیں بے نور سی نظر آتی تھیں۔ اور وہ بہت خاموش لیٹا تھا، ڈاکٹروں نے آج اُسے سیلائین پر رکھا تھا انیل کے سٹینڈ پر کانچ کی ٹوٹیوں سے سیلائین قطرہ قطرہ کرکے اُس کے جسم میں پہنچایا جا رہا تھا۔

"تم اس قدر خاموش کیوں ہو" رفعیہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں!" عشرت نے جواب دیا اور پھر بہت دیر تک خاموش رہا۔

رفعیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہاں سے کدھر سے وہ اسے ہمت دلائے۔ کیسے؟ یکایک اس کی نظر قریب کے بیڈ پر پڑی۔ اکیس نمبر کے بیڈ پر آج ایک نیا مریض آیا تھا وہ کل والا یہاں موجود نہ تھا، جو بار بار رفعیہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ رفعیہ نے پوچھا۔

"تمہارا پڑوسی آج بدل گیا؟"

"ہاں"

"وہ پرانا کہاں چلا گیا"

"مر گیا" عشرت نے آہستہ سے کہا۔

"ارے" رضیہ کے مُنہ سے نکلا "کل تک تو بھلا چنگا تھا"

عشرت بہت دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا "ہسپتال میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ دن بھر ٹھیک رہا رات کو یکایک اس کی طبیعت بگڑی۔ رات بھر وہ اپنی بیوی کو یاد کرتا رہا۔ اور اپنے چھوٹے بچے رتن کو۔ رتن! رتن!! رتن!!! وہ بار بار درد کے وقفوں اور درد کے بیچ میں بھی اس طرح اپنے بیٹے کا نام لیتا تھا۔ جیسے آدمی سکون آرام اور خوشی کا سانس لیتا ہے، صبح کو وہ مرگیا ــــــــ

پرسوں تک وہ سامنے اٹھائیس نمبر کے بیڈ پر ایک نوجوان تھا۔ بڑا ہمت والا جری بہادر اس کی بائیں ٹانگ گنگرین کی وجہ سے ڈاکٹر نے کاٹ ڈالی تھی مگر وہ بڑا بہادر تھا۔ بجائے اس کے کہ ڈاکٹر اس کا حال پوچھتے وہ ڈاکٹروں کا حال پوچھا کرتا تھا اور نرس کو زکام دور کرنے کی دوا بتاتا۔ اور ادھر اُدھر کے پلنگوں پر پڑے ہوئے مریضوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی جب درد کی انتہائی شدت سے وہ بے تاب ہوتا تو اس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ اس کے علاوہ وہ ہمیشہ ہشاش بشاش ہو کے اپنے آپ پر قابو پالیتا اور لوگوں کو ہنسانے لگتا ــــــــ پرسوں رات کے چار بجے اچانک مرگیا۔ اس کے منہ سے ایک لمبی دردناک چیخ نکلی۔ ایک خوفناک مہیب چیخ اور وہ اس کے بعد مرگیا۔ جنرل وارڈ میں ایسا ہی ہوتا ہے"

رضیہ نے دل میں سوچا وہ اُسے جنرل وارڈ میں نہیں رکھے گی۔ وہ نرس کے پاس گئی نرس نے اُسے بتایا کہ اسپیشل روم کے لئے سات روپے روزانہ کرایہ دینا پڑے گا رضیہ نے سوچا وہ کرایہ دے گی وہ کہیں نہ کہیں سے روپے لے کے آئے گی اور عشرت کے لئے الگ کمرے کا انتظام کرے گی اس جنرل وارڈ میں پڑے پڑے تو اس کی رہی سہی قوتِ مدافعت غائب ہو جائے گی اور وہ زندہ نہ بچ سکے گا۔ عشرت کے لئے ایک الگ کمرہ ہونا چاہئے جہاں وہ قریب پلنگ کے کسی ساتھی کی موت کا بھیانک چہرہ نہ دیکھ سکے۔

رفعیہ نے اگلے روز رضیہ سے کچھ روپے اُدھار لئے کچھ اس کے پاس بھی تھے ملا کے اس نے اس دن کا ایڈوانس کرایہ ہسپتال میں داخل کر دیا، اور عشرت کو پرائیوٹ وارڈ میں ایک الگ کمرے میں داخل کرادیا، پرائیوٹ وارڈ میں داخل ہوتے ہی عشرت کی حالت بہتر ہونے لگی۔ رفعیہ ہر روز آتی تھی ہر روز اس کے لئے پھل اور پھول لاتی تھی اور یہ تو اب پرائیوٹ وارڈ کا کمرہ تھا، اس لئے رفعیہ جتنی دیر چاہے وہاں ٹھہر سکتی تھی اس لئے جب بھی اُسے کام سے فرصت ملتی وہ یہاں آجاتی۔ بلکہ کئی بار تو کام کو ترجیح نہ دے کر وہ یہاں آجاتی۔ ڈاکٹر مہتہ جو ہر روز عشرت کو دیکھنے آتے تھے عشرت کی بہتر حالت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ رفعیہ سے بولے "جب سے تم آئی ہو اس کی حالت اچھی ہو رہی ہے۔ میں تو تقریباً مایوس ہو چکا تھا کیونکہ عشرت میں اپنی زندگی سے لڑنے کے لئے اندر قوت نہ تھی اور جب مریض ہی مرنا چاہے تو ڈاکٹر اُسے کب تک زندہ رکھ سکتا ہے۔"

جب ڈاکٹر چلا گیا تو عشرت نے کہا "ڈاکٹر سچ کہتا تھا۔ اُن دنوں میرے دل میں جینے کی خواہش تک باقی نہ رہی تھی۔"

"تم کو زندہ رہنا ہوگا عشرت! اپنی بوڑھی ماں کے لئے اپنے ننھے بھائی بہنوں کے لئے۔"

"میں تمہارے لئے زندہ رہوں گا۔" عشرت کی انگلیاں رفعیہ کی انگلیوں سے کھیلنے لگیں۔

"رضیہ؟ کیا تمہیں میرین ڈرائیو کی سیر یاد ہے؟"

رفعیہ کی آنکھیں یکایک مسرت سے چمک اُٹھیں۔

"مجھے کبھی یاد نہیں آئی" عشرت نے کہا "اتنے سالوں میں۔ راج کے ہاں، شمشاد کے ہاں، ولایت بیگم کے ہاں، قمر کے ہاں، دادا کے ہاں۔ کبھی مجھے وہ رات یاد نہیں آئی۔ تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ہاں تمہارا چہرہ کئی بار سامنے آیا۔ جیسے مجھ سے شکایت کر رہا ہو اور ہر بار میں نے تمہارے چہرے کو اپنے ذہن سے مٹا دیا۔ آدمی شکایت کرنے والے چہرے بھول جانا چاہتا

ہے میں بھی ایسا ہی کرتا تھا، میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا. لیکن جنرل وارڈ میں بائیس نمبر کے بستر پر موت اور زندگی کے درمیان۔ وہ خوب صورت یاد کئی بار میرے ذہن میں چمک اُٹھی اور مجھے سب کچھ یاد آیا وہ کولابے میں سوزین لیڈیز شوز کی دکان پر جانا"

"وہ سبز جوتا ابھی تک میرے پاس ہے اس دن کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں پہنا"

عشرت نے کہا" انڈیا گیٹ سے ہم چوپاٹی گئے تھے وہاں ہم نے کھٹی میٹھی چاٹ کھائی تھی پھر انڈیا گیٹ سے ہم برنی گئے تھے، جہاں ہم نے پھلوں والے سینڈ پر . . ."

رضیہ نے اس کی بات ٹوک کر کہا" بھولتے ہو چوپاٹی سے ہم برنی نہیں گئے تھے برنی جانے سے پہلے ہم سالزبرگ گئے تھے جہاں ہم نے آئس کریم کھائی تھی"

"پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھنا اور بارش کا برسنا اور ہولے ہولے ٹیکسی کا میرین ڈرائیو کی طرف چلے جانا تم میرے پہلو میں بیٹھی تھیں"

"اور وہ دھند؟" رضیہ نے آہستہ سے کہا، اور اس نورانی یاد سے اس کا چہرہ منور ہو گیا" ہائے وہ دھند کبھی نہیں بھولتی۔ دھند میں تمہارا وہ چہرہ، تمہاری وہ بانہیں۔ تمہارا وہ ـــــــــ"

"بوسہ!ـــــ رضیہ نے شرم سے عشرت کا ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیا۔

عشرت کے بیمار چہرے پر سُرخی کی لہر دوڑ گئی۔

"وہ رات اس کے بعد کئی بار میرے بستر پر آئی، بائیس نمبر کے بستر پر زندگی اور موت کے درمیان لٹکتے ہوئے کئی بار وہ رات میری زندگی کے مقدس لمحے کی طرح آئی۔ رضیہ تم سے سچ کہتا ہوں جب میں نے اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیا تو صرف ایک وہی رات معلوم ہوئی۔ جسے میں اسی من وعن اسی طرح رکھنا چاہوں گا۔ اس کا ایک لمحہ تبدیل نہیں کروں گا۔ لیکن باقی ساری زندگی ـــــ اگر یہ میرے بس میں ہو، اگر مجھے دوبارہ زندگی بسر کرنے کی اجازت ملے، شروع سے آخر تک تو باقی

سب بدل ڈالوں گا۔ صرف وہی ایک رات باقی رہنے دوں گا۔"

رفیعہ کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

عشرت کچھ دیر چپ رہا پھر بولا " مگر وقت کے دھارے کے بہاؤ میں تم واپس نہیں جاسکتے اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتے۔ کچھ نہیں کچھ نہیں ایک لمحے تک کو بدلا نہیں جاسکتا " عشرت کے لہجے میں اک پر خلوص پچھتاوا تھا۔

" ماضی نہیں مگر مستقبل تو بدلا جاسکتا ہے " رفیعہ نے کہا۔

"اب اگر میں زندہ رہا۔ اور اب میں شب و روز اپنی زندگی کے لئے لڑتا ہوں، تو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہارے قدموں میں رہوں گا "

ان لفظوں کے لئے۔ لفظوں کے لئے نہیں لفظوں کے اندر اس صداقت کے لئے کب سے رفیعہ کا دل تڑپ رہا تھا اس کے کان بھوکے تھے ترسے ہوئے اس آواز کے لئے وہ کب سے خلا میں ڈھونڈ رہے تھے اس محبتی آواز کے بلاوے کو جو اس وقت رفیعہ کے کانوں میں گونج رہی تھی

عشرت چپ ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بولا " تم نے میری ماں دیکھی ہے ؟ "

رفیعہ نے سر ہلایا۔

" اس کے بال سفید ہیں اس کا قد چھوٹا ہے اور اس کا رنگ گورا ہے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اس کے گالوں پر جھریاں مگر جب وہ ہنستی ہے رفیعہ تو اس کی عمر کے دس پندرہ سال کم ہو جاتے ہیں وہ آج بھی ایک بچے کی طرح ہنستی ہے، بہت کم ہنستی ہے کیوں کہ اس کا خاوند مرچکا ہے اور اس کے بیٹے نے اُسے بہت دُکھ دیئے ہیں مگر پھر بھی ان دکھوں کے درمیان جب وہ ہنستی ہے

تو اس کا چہرہ صبح کے تارے کی طرح جگمگانے لگتا ہے۔ ان دنوں میں اپنی ماں مجھے بہت یاد آئی وہ ہاتھوں پر مہندی ایسی عمدہ سجاتی ہے کہ محلے بھر کی جوان لڑکیاں میری ماں سے اپنے ہاتھوں پر مہندی کے نقش و نگار اُبھارنے کے لئے آتی ہیں۔ بائیس نمبر کے پلنگ پر لیٹے لیٹے کئی بار میں نے اپنی ماں کو تمہارے ہاتھ مہندی سے سجاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

رفعیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

عشرت نے کہا "کئی بار تخیل میں میں نے دیکھا ہے۔ اپنے آپ کو سہرا لگائے اپنے گھر کے باہر کھڑے سائیس سے کہتے ہوئے گھوڑا لاؤ۔ پھر زربفت میں جھولتا وہ نوشاہ کا گھوڑا میرے سامنے آیا۔ میں اس پر سوار ہوا اور جانے کن پُرپیچ گلیوں میں ہوتا ہوا میں تمہاری ڈولی کے آگے آگے اپنے گھوڑے پر سوار تمہیں اپنے گھر لے آیا۔ کون گیت گا رہا تھا یہ تو میں نے نہیں دیکھا میں نے تو صرف گھوڑے سے اُتر کر تمہاری ڈولی کا پردہ کھسکا دیا۔ اور میری ماں تمہیں بڑے پیار اور محبت سے سہارا دے کر ۔۔۔۔۔۔"

"بس! بس!!" رفعیہ سسک سسک کر رونے لگی "ان تصویروں کو ہاتھ مت لگاؤ عشرت ایک عورت انہیں تصویروں کو دیکھ دیکھ کر کسی کی مفارقت میں اپنی ساری زندگی بسر کر دیتی ہے"

عشرت کے چہرے پر اک خفیف سی مسکراہٹ آئی وہ تھک کر اپنے تکئے پر جا گرا اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ رفعیہ نے اس کی نبض دیکھی۔ اسے گرم گرم دودھ پلایا۔ عشرت کے چہرے پر ذرا سی سُرخی واپس آ گئی۔

"عشرت تم زیادہ باتیں نہ کرو" عشرت نے خوشی اور محبت سے رفعیہ کی جانب دیکھتے ہوئے بہت آہستہ سے کہا: "اچھا"۔ ———

"اچھا" نرم نرم شیریں لفظ اچھا چاروں طرف محبت کا مدھم مدھم نور بکھیرتا ہوا لفظ۔ اچھا گہری سانس لیتا ہوا پرسکون لفظ جو رفیعہ کے رخساروں کو اک بوسے کی طرح چھو گیا۔

رفیعہ اپنا پرس لے کر کھڑی ہو گئی۔ بولی "میں اب کل آؤں گی!"

دوسرے دن سیٹھ باہٹرایا کا دیوالہ نکل گیا۔ کوریا کی جنگ بند ہوگئی تھی بمبئی اور سٹاک ایکسچینج کے بھاؤ دھڑسے نیچے گرگئے تھے۔ باہٹرایا کا خیال تھا کہ جنگ جاری رہے گی۔ اس کا خیال تھا کہ امریکی کبھی صلح نہیں کریں گے۔ جنگ ہوتی رہے گی حالانکہ کئی دنوں سے طرح طرح کی خبریں آرہی تھیں۔ مگر باہٹرایا کو صلح پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس کا پورا یقین تھا کہ جنگ جاری رہے گی، یہی سوچ کر اس نے سٹاک ایکسچینج پر بڑے بڑے داؤں کھیلے تھے وہ اور سیڈم ہمیشہ بڑے بڑے داؤں کھیلنے کے عادی تھے اسی لئے انہوں نے لاکھوں کمائے تھے۔ اسی لئے آج ان کا دیوالہ بھی نکل رہا تھا۔

دادر مین روڈ پر اور اِدھر اُدھر کے سٹوڈیوز میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی سیٹھ باہٹرایا نے دیوالہ نکال دیا سٹے میں سیٹھ کو اسّی لاکھ کا ہرجانہ دینا پڑا اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا سیٹھ باہٹرایا ایک رات میں اسی لاکھ روپے ہار گیا تھا۔ اپنی کل پونجی۔ ایک جھنجھی کوڑی اس کے پاس نہ رہی تھی۔ اس کا کل بنک بیلنس۔ اس کے سٹوڈیوز کارخانوں میں حصّے، بلڈنگیں ایک رات میں ملک تبدیل کر چکی تھیں۔ اب سیٹھ کے پاس بس وہی روپیہ ہوگا جو اس نے گھر میں رکھا ہوگا یا میڈم

کے زیور اور ایک گاڑی جو خوش قسمتی سے اس کے بھتیجے کے نام تھی۔

یہ خبر سنتے ہی جوق در جوق لوگ۔ انڈسٹری کے ہر شعبہ کے لوگ سیٹھ بانکڑیا کے دفتر میں اظہار افسوس کے لئے پہنچنے لگے۔ کیونکہ سیٹھ بانکڑیا کبھی کبھی کئے فلم انڈسٹری کا ایک نامور مشہور آدمی تھا۔ اس تک درجنوں تصویریں بنا چکا تھا۔ سینکڑوں آدمیوں سے اس کے تعلقات تھے بہت سے اداکاروں نے اس کی آنے والی دو ایک فلموں میں مفت کام کرنے کی پیش کش کی۔ اس کے سٹوڈیو کے مزدوروں نے اگلے تین ماہ کے لئے تنخواہ نہ لینے کی آفر دی۔ ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے اظہار افسوس کر رہا تھا کچھ رسمی کچھ عملی۔

اکرم بھی یہ سنتے ہی سیٹھ بانکڑیا کے ہاں پہنچا۔ وہاں میڈم اپنے کمرے میں بدستور تاش کی بازی کھیل رہی تھی۔ وہی رمی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ صرف میڈم اپنے سینے کے اوپر کا ڈارک بار بار اس طرح جھٹکتی تھی جیسے وہ خیالی مکھی اُڑا رہی ہو مگر یہ تو میڈم کی پرانی عادت تھی میڈم کے پاس آگرے کی ایک مشہور طوائف بیٹھی تھی جو فلموں میں اپنی قسمت آزمانے آئی تھی۔

میڈم نے اکرم کے اظہار افسوس کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے رمی کھیلتی رہی۔ اس نے گھڑی دیکھ کر بجن دت سے کہا۔

"ایک منٹ سے اوپر ہوگیا تم چال نہیں چلے "

میڈم کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی کیونکہ میڈم وقت کی بڑی پابند تھی۔ رمی کھیلتے وقت اگر کوئی چال میں دیر لگاتا۔ یا سیٹ پر آنے میں دیر کرتا۔ یا کسی کام میں دیر کرتا تو اُسے سخت کوفت ہوتی تھی وہ وقت منٹ نہیں سیکنڈ کے حساب کی سختی سے پابند تھی بجن دت موسیقار نے مسکرا کے کہا" میڈم میرا دل کہیں اور چلا گیا تھا "

"دل ؟" میڈم نے خفا ہو کے کہا " دل کا رمی سے کیا کام ؟"

"تم سمجھتے ہو بجن دت " اکرم نے کہا " میڈم کسی کے دل کی بات نہیں سمجھتیں وہ صرف وقت کی سوئیاں دیکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ میڈم کے پاس کوئی دل نہیں ہے۔ وہاں اندر بھی ایک گھڑی ہے جس کی ٹک ٹک کو وہ غلطی سے اپنے دل کی دھڑکن سمجھتی ہیں۔"

میڈم نے چلا کے کہا " تم خواہ مخواہ اپنا فلسفہ بگھار رہے ہو، دیکھتے نہیں میں کھیل رہی ہوں۔"

"میڈم" اکرم نے پوچھا " کیا آج بھی آپ کو اس کھیل کا پتہ نہیں چلا۔ جو آپ برسوں سے کھیل رہی ہیں۔ یہ کھیل ہے کہ بزنس ہے۔ جوا ہے کہ قحبہ خانہ ہے گناہ ہے۔ بدررو کا سڑا ہوا پانی ہے ، کتنے ہی بنکوں کی چیک بکیں۔ کتنی ہی عصمتوں کی ڈوریاں کتنی ہی غلامی کی رسیاں ، دھاگے زنجیریں ان تاشوں کے پتوں سے بندھی ہیں۔"

" بکے جاؤ" میڈم نے کہا " ماتروس تمہاری بحر ساتویں ہفتے میں کیا داخل ہوئی کہ تم اکرم سے دنیا کے سب سے بڑے دانش ور بن گئے۔ یہ تو تم آج اظہار افسوس کرنے آئے ہو کہ لیکچر جھاڑنے آئے ہو، تمہیں شرم نہیں آتی آج میں دیوالیہ ہوئی ہوں اور تم اس طرح ...."

"تم اگر دیوالیہ ہوتیں میڈم ، تو مجھے اس قدر افسوس نہ ہوتا" اکرم نے کہا " افسوس تو یہ ہے میڈم کہ تمہارے ساتھ آج کتنے ہی اسٹوڈیوز کے ملازم ، کتنے ہی تصویروں میں کام کرنے والے اداکار دیوالیہ ہوئے ہیں۔ جب تم سٹاک ایکسچینج پر داؤ لگاتے ہو تو کیا تم کبھی یہ سوچتے ہو اس ایک داؤ میں تم کتنے سو اور کتنے ہزار انسانوں ، زندگیوں کو داؤ پر لگا دیتے ہو۔ یوں ایک چٹکی میں ..."

میڈم نے کہا " تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ گر اندر جاؤ سیٹھ بانکڑیا سے بات کرو۔ وہ بے چارہ آج بالکل بوکھلایا ہوا ہے۔ میرا قابل قدر شوہر۔ نہ آج تمہاری ہر بات سننے کے لئے تیار ہے۔"

اکرم نے کہا "میں تو اس وقت یہی رمی کا کھیل دیکھوں گا۔ مجھے اس میں ڈرامائی آرٹ بھی ہے۔"
چند منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر یکایک میڈم گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "آج اس تاش میں کوئی مزا نہیں رہا۔"
اکرم مسکرا کر میڈم کے پاس گیا اور اس کے نازک کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا "تو آؤ میڈم اس پرانی گھسی پٹی تاش کو پھاڑ ڈالیں۔ اتنے دھاگوں، رسیوں، زنجیروں، ڈوریوں سے بنی ہوئی باون پتّوں والی تاش کو پھاڑ ڈالیں۔ اور باون ہزار۔ باون لاکھ، باون کروڑ کی بہت بڑی تاش سے زندگی کا ایک نیا کھیل کھیلیں۔ جس میں کوئی دھاگہ نہ ہو، کوئی ڈوری نہ ہو، کوئی زنجیر نہ ہو۔"
"چلے جاؤ" میڈم بڑی حقارت سے اکرم کی طرف دیکھتی ہوئیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

سیٹھ بانکڑیا واقعی بہت بوکھلائے ہوئے پریشان حال اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اکرم کی باتیں سُن کر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "بولے تم آج تیسرے ڈائرکٹر ہو جس نے میرے لئے ایک پکچر مفت بنانے کی آفر دی ہے۔ آج صبح سے میرے ہاں لوگوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ اکرم ایک عجیب و غریب بات مجھے معلوم ہوئی۔ صبح سے ٹیلیفون پر ٹیلیفون آ رہے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھوں کے میرے لکھ پتی دوستوں کے افسوس ہمدردی کے ٹیلیفون مگر ایک شخص بھی اُن لکھ پتیوں میں سے میرے پاس آیا جنہیں میں نے ضرورت کے وقت پانچ پانچ لاکھ روپے قرض دئے ہیں، اور اگر آ رہے ہیں تو تمہارے ایسے لوگ تم سے بھی غریب لوگ میرے سٹوڈیو کے مزدور، ملازم۔ نوکر پیشہ بدحال غریب لوگ اُن کے پاس تو خود ایک پیسہ نہیں ہے لیکن وہ کس سچے دل سے میرے ساتھ ہمدردی کر رہے ہیں۔

حالانکہ ——— حالانکہ ——— ان تمام لوگوں پر مصیبت لانے والا میں ہی وہ اکیلا آدمی ہوں لیکن یہ لوگ کبھی اپنی مصیبت کی بات نہیں کرتے۔ صرف میری مصیبت کی بات کرتے ہیں"

اکرم چپ رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیٹھ نے کہا۔

"میرا خیال ہے! اکرم! کسی کے پاس زیادہ روپیہ نہیں ہونا چاہیے اتنا زیادہ روپیہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا دماغ خراب ہو جائے"

اکرم نے مسکرا کے کہا "سیٹھ یہ تم تو آج سوچتے ہو۔ لیکن اگر کل کو تمہارے پاس پھر کہیں سے پانچ دس لاکھ روپیہ آ جائے تو تم پھر ——— ؟

"ہاں" سیٹھ بانکڑیا نے اپنی افسردگی کے باوجود ہنس کر کہا "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو ——— میں پھر یہی ——— ہاں تم بالکل ٹھیک کہتے ہو" سیٹھ زور زور سے ہنسنے لگا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی

ایک رات رضیہ کو عشرت کے پاس رہنا پڑا۔ کیوں کہ اچانک ہی عشرت کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شام کے وقت جب رضیہ اس کے ہاں پہنچی تھی تو وہ خاصہ ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ آج رضیہ بھی بہت خوش تھی کیونکہ اکرم کی تصویر "کسان" ماترو میں آٹھویں ہفتے میں جا رہی تھی۔ کارخانوں کے مزدور۔ ایسے لوگ جو بہار اشٹر کے سینکڑوں گاؤں میں اپنے چھوٹے چھوٹے گھر اور کھیتیاں چھوڑ کر

آئے تھے یا زمینداروں کے ظلم کی وجہ سے وہاں سے بے دخل ہو کر چلنے لگے تھے اور شہر بمبئی میں آگر نئے نئے مزدور بنے تھے ۔ ان لوگوں کے لئے کسان اور اس کی زمین کا مسئلہ ایک گہری دلچسپی کا باعث تھا جوق در جوق سینکڑوں کی تعداد میں یہ لوگ ہر روز ماترو سینما میں دس آنے خرچ کر کے "کسان" پکچر دیکھ رہے تھے اور جان رولینڈ کہتا تھا کہ ماترو میں تماشائیوں کا یہ طبقہ کبھی سینما دیکھنے نہیں آیا تھا ۔ خود اس کے لئے یہ تصویر ایک نیا تجربہ تھی ۔ اتنے سالوں میں بالی وڈ کی صرف ایک پکچر کے سوا ماترو میں کوئی اور تصویر آٹھویں ہفتے میں نہیں پہنچی تھی اور جان رولینڈ کا خیال تھا کہ ابھی تین چار ہفتے یہ تصویر اسی طرح زور پکڑ کے چلے گی ۔ اور گو اکرم اور ستیہ رائے اور دوسرے لوگ پکچر کی کامیابی سے بہت خوش تھے مگر سیٹھ کرتر چند سے جھگڑا ہونے کی وجہ سے وہ کوئی نئی تصویر شروع نہیں کر سکتے تھے ۔ سیٹھ سے ان کی بدستور لڑائی تھی ۔ ماترو کی پبلسٹی کے اخراجات بہت تھے ۔ اور ان اخراجات کو ادا کرنے کے بعد جو تھوڑا سا فائدہ ہوتا تھا وہ سیٹھ کرتر چند کی جیب میں جا رہا تھا ۔ ان لوگوں کے پاس ایک پائی نہ پہنچتی تھی جس سے وہ کوئی دوسری پکچر شروع کر سکتے ۔ نہ ابھی کسی دوسرے فنانسر سے کوئی پیش کش آئی تھی ۔ اس لئے ذہنی اعتبار سے نہ سہی مالی اعتبار سے یہ لوگ بہت پریشان تھے ۔

انہیں دنوں سوویت ایکسپورٹ فلم بمبئی کے ناظم نے "کسان" فلم دیکھی اور بہت پسند کی اس نے ماسکو کو لکھا کہ اس فلم کی نمائش اگر سوویت یونین میں ہو تو بہت اچھا رہے گا ۔ فلم ماسکو بھیجی گئی ۔ بہ ہاں ماہرین فن نے دیکھی پسند کی اور سوویت یونین میں نمائش کے لئے خرید لی گئی ۔ اکرم اور ستیہ رائے بہت خوش ہوئے اب وہ نئی تصویر شروع کر سکتے تھے ۔

رضیہ نے عزت کو بتایا "اکرم کہہ رہا تھا جب چاروں طرف اندھیرا تھا اور کہیں کوئی روشنی نہ تھی ۔ پکچر کامیاب تھی مگر سب روپیہ سیٹھ کی تجوری میں جا رہا تھا اور وہ جنہوں نے اپنے دل و دماغ اور

جسم کی ساری محنت سے اس پکچر کو کامیاب کیا تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ اور کوئی تصویر شروع نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت ہاتھ آئے۔ بمبئی میں کام کرنے والوں کے ہاتھ اور باہر کے لوگوں کے ہاتھ۔ ایک مضبوط مصافحہ کی طرح ہمارے ہاتھوں سے مل گئے اور ہم نے محسوس کیا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں رفیعہ لاکھوں کروڑوں لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ وہ لوگ جو ہماری ہی طرح ہیں وہ ہماری ہی طرح محسوس کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں، کام کرتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں، روتے ہیں، ہنستے ہیں اور صلح اور امن کی باتیں کرتے ہیں۔"

اور اکرم کہہ رہا تھا "مجھے آج محسوس ہوا ہے جیسے میری دو نہیں دس لاکھ دس کروڑ باہنیں ہیں"
آج رفیعہ کی آنکھوں میں مسرت کی گہری چمک تھی وہ عشرت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی "یہ دو تین ماہ مشکل کے ہیں پھر ہماری نئی تصویر شروع ہو جائے گی اور میں نے اکرم سے وعدہ لے لیا ہے جب تم اچھے ہو جاؤ گے تمہیں وہ اس پکچر میں ضرور کام دیں گے۔ ہیرو کا نہیں مگر کوئی اچھا سا رول جسے تم بخوبی نبھا سکو۔"

"اچھا ہو کے اب میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی معمولی سا کام، مگر اپنے ہاتھوں کی محنت کا کام۔ جس سے میرے ماتھے سے پسینہ ٹپکے میرے ہاتھوں میں قوت آئے۔ میرے سینے میں سانس مضبوطی سے چلنے لگے۔ میں اب ایسا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اور اچھا ہو کے اب میں یہی کروں گا۔"
عشرت چُپ ہو گیا۔ رفیعہ خوشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
عشرت نے کہا "کیا تم نے مجھے معاف کر دیا ہے؟"
رفیعہ نے اپنے رخسار عشرت کے گالوں سے لگا دیے "کیسی باتیں کرتے ہو میں عورت ہوں مجھے معلوم تھا۔ ایک دن تم میرے پاس آؤ گے۔ میری محبت اتنی مضبوط تھی!"
یکایک عشرت کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا۔ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں وہ تکیے پر لیٹ کے

گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"کیا ہوا"

"پتہ نہیں بہت ہی سخت درد ہو رہا ہے"

رفعیہ جلدی سے نرس کو بلا لائی۔ نرس بھاگی بھاگی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اب عشرت کا درد بڑھتا جا رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھ رہے تھے۔ اس کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے غور سے دیکھنے کے بعد کہا "پیٹ کے اندر ہیمرج ہو رہا ہے اللہ اندر کا زخم کھل گیا ہے"

"زخم ؟" رفعیہ چونکی۔

"گردے کا آپریشن جو ہوا تھا۔ وہ زخم شاید کھل گیا ہے اندر سے۔"

"پھر ؟"

ڈاکٹر نے اپنے شانے ہلائے اور خاموش بہت دیر تک وہ عشرت کے پاس بیٹھا رہا۔ دوا دی گئی انجکشن لگائے گئے۔ سب ترکیبیں کی گئیں۔ مگر عشرت کی حالت بگڑتی گئی۔ رات کے تین بجے ڈاکٹر رفعیہ کو پکڑ کے باہر لے گیا۔ اور اس سے کہنے لگا "اب کوئی اُمید نہیں رہی"

رفعیہ خاموش تھی۔

ڈاکٹر نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا "اب یہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ تمہیں اس سے اگر کوئی خاص بات کرنی ہو تو کر لو۔ اس کے گھر والوں کو بلانا ہو تو بلا لو۔ میں اپنی گاڑی دیتا ہوں۔ اب خاتمہ قریب ہے"

رفعیہ بالکل خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے گھڑی دیکھ کر کہا "مجھے ایک دوسرے مریض کو دیکھنے جانا ہوگا۔ دوسرے ڈاکٹر کو ادھر بھیجتا ہوں۔ ہم لوگ تو آخری وقت تک لڑیں گے۔ مگر۔۔۔"

ڈاکٹر نے اپنے شانے ہلائے اور سر جھکائے وارڈ سے باہر چلا گیا۔

"ڈاکٹر کیا کہتا تھا" عشرت نے پوچھا۔

"وہ کہتا تھا تم زندہ رہو گے" رفعیہ نے کہا۔

"میں جانتا ہوں اس نے کیا کہا تھا۔ میں مر رہا ہوں"

"نہیں عشرت!"

"ہاں! میں جانتا ہوں۔ میرے جسم کی ہر رگ اور ہر نس۔ دماغ اور اعصاب کا ہر ذرہ اس وقت جانتا ہے۔ رفعیہ میرے قریب آجاؤ۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اپنے رخسار میرے رخساروں سے لگادو۔ ہاں اس طرح۔ رفعیہ میری بیوی!"

رفعیہ کے ہونٹ کانپے۔ اس نے زور سے ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبائے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے زور لگا کر بڑی مشکل سے ان آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روکا، مگر آنسو نہیں رکے چھلک کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس کے رخساروں سے ہوتے ہوئے عشرت کے رخساروں پر بہنے لگے جہاں پہلے ہی سے عشرت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"روؤ۔ روؤ۔ رفعیہ ان آنسوؤں کو بہنے دو تمہارے آنسوؤں کو میرے آنسوؤں کو۔ ایک قدم سے پھسل جانے والے آنسوؤں کا سنگم ہے۔ میری روح اس میں نہا کر پاک و صاف ہو رہی ہے۔ آج ساری غلاظتیں ساری کمزوریاں اور ساری برائیاں چھٹ گئی ہیں اور میری روح دھلی دھلائی تمہاری محبت کے نور کا لباس پہنے جگمگا رہی ہے۔ دیکھو رفعیہ آج میں پھر جوان ہوں۔ پہلے کی طرح پھر ہیرو ہوں .... تمہارا ہیرو!——————

آج میں ایک ہیرو کی موت مروں گا۔ تمہاری بانہوں میں ایک ہیرو کی طرح! وہ زور سے چلایا۔ پھر یکایک اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے اور وہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔

اس کے بعد وہ ہوش میں نہیں آیا۔ لمحہ بہ لمحہ۔ سیکنڈ، منٹ۔ گھنٹے گزر گئے۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی۔ ٹک ٹک میں جاتی ہوں۔ ٹک ٹک میں جاتی ہوں۔ ٹک ٹک میں جاتی ہوں۔ . . . ٹک ٹک میں جاتی ہوں۔

"عشرت"

"ٹک ٹک میں جاتی ہوں"

لیکن عشرت نے رضیہ کی آواز نہیں سنی۔ اس کا بے ہوش سُتا ہوا چہرہ اب بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ اور سینے میں الٹی سیدھی سانسوں کا شور عالم سکرات کا پتہ دیتا تھا۔ سینکڑوں منٹ سینکڑوں صدیوں کی طرح گزر گئے۔ صبح کے پانچ بجے کے قریب عشرت نے آنکھیں کھولیں، اور اس نے کہا۔ "ماں ڈولی آگئی"

اس کے بعد اس نے آنکھ بند کرلی۔ اس کے گلے کا منکا ڈھلک گیا۔ اور اس کا ہاتھ رضیہ کے ہاتھ میں سرد ہو گیا۔

"عشرت — رضیہ زور سے چلائی۔

"ٹک ٹک میں جاتی ہوں"

رضیہ پچھاڑ کھا کے نرس کی بانہوں میں جا گری۔ نرس نے ایک بچی کی طرح اُسے گلے سے لگا لیا۔ اور اسے ڈھارس دینے لگی۔ مگر رضیہ اس طرح بلک بلک کے رو رہی تھی۔ جیسے ایک انسان نہیں ایک زخم رو رہا ہو۔

کہتے ہیں مرنے والے کے ساتھ اس کی ساری مصیبتیں اور دُکھ ختم ہو جاتے ہیں۔ جب وہ مرجاتا ہے تو اپنی ساری زندگی اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور پھر اس دنیا میں اس کا کچھ نہیں رہتا اس کی یاد رہتی ہے اچھی یا بُری۔
اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ مگر ہم لوگ بڑے عجیب وقت میں ایک عجیب زمانے میں ایک عجیب نظام زندگی میں رہتے ہیں جہاں مرکر بھی خلاصی نہیں ہوتی اور مصیبت کم نہیں ہوتی۔ جو بے عزتی زندگی میں حاصل ہوتی ہے وہ مرنے کے بعد دو چند ہو جاتی ہے۔ ایک حد ہے جس کے آگے کوئی نہیں جاتا۔ جہاں مرنے والے کے سارے گناہ بخش دئے جاتے ہیں۔
مگر جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہاں مُردوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ یہاں کوئی حد نہیں ہے کوئی معافی نہیں ہے۔
رضیہ جوں ہی وارڈ سے باہر نکلی۔ سر جھکائے ہوئے آنسو پونچھتی ہوئی۔ نرس نے اس کے ہاتھ میں ایک بل دیا، رضیہ نے جھلملاتے ہوئے آنسوؤں میں اسے پڑھا۔

کمرے کا کرایہ	۲۴۲ — ۰ — ۰
انجکشن دوائیاں	۳۲۱ — ۸ — ۰
خاص غذا اور گھی	۹۰ — ۰ — ۰
	۶۶۳ — ۸ — ۰
جو رقم اب تک دی جا چکی ہے	۲۰۰ — ۰ — ۰
بقایہ	۴۶۳ — ۸ — ۰

نرس نے کہا "مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی۔ مگر اُسے نہ بچا سکے۔ موت ناگزیر ہے۔ تم ایسا کرنا کہ یہ بل عشرت کی لاش کو لے جانے سے پہلے ادا کر دینا ہسپتال کا قاعدہ ہے۔"

رضیہ نے کہا "بہت اچھا" مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ چار سو تریسٹھ روپے آٹھ آنے کا بل آج ہی ان اگلے چار گھنٹوں میں کہاں سے ادا کر سکے گی۔ اکرم کے پاس پیسے نہیں تھے ستیہ رائے کے پاس پیسے نہیں تھے اور اب تو رضیہ کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔

پھر وہ کہاں سے یہ چار سو تریسٹھ روپے آٹھ آنے کا بل ادا کرے گی۔

یکایک اسے راج کا خیال آیا جس لڑکی نے عشرت کو تباہ کیا تھا جس لڑکی نے عشرت کے سینے سے لگ کر اس کی جوانی کا سارا رس چوس لیا تھا۔ یقیناً وہ عشرت کے کفن کے پیسے تو دے دے گی۔ اگر رضیہ کے پاس پیسے ہوتے تو وہ مر جاتی مگر کبھی راج کے پاس نہ جاتی مگر اس وقت کوئی چارہ نہ تھا وہ اپنے محبوب کی لاش ہسپتال میں سڑا نہیں سکتی تھی۔

باندرہ پہنچ کر وہ دیر تک راج کے بنگلے کے باہر گل مہر کے درخت کے نیچے کھڑی یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ اندر جائے کہ نہ جائے۔ اس کا دل اندر جانے کو نہ چاہتا تھا، وہ ایک قدم اُٹھاتی مگر پھر اس کا احساس اسے روک لیتا۔ پورچ میں راج کی بادامی رنگ کی کیڈی لک سورج کی شعاعوں میں چمک رہی تھی، اس کا خانداں شوفر گاڑی کے اندر خاموش بیٹھا تھا پتھر کی مورت۔ شاید راج کہیں باہر جانے والی تھی۔ یکایک رضیہ نے سوچا۔ وہ بڑھ کر اندر چلی ہی جائے اور راج سے بات کرے۔ کہیں راج باہر چلی گئی تو اسے ایسا موقع نہیں ملے گا۔

اس نے بلاؤز سے وہ بل نکالا۔ چار سو ترسیٹھ روپے آٹھ آنے والا۔ اور جرأت کرکے کیڈی لک کے آگے سے گھوم کے اندر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ عین اس وقت راج اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ سجی سجائی۔ ایک عمدہ بنارسی ساڑھی میں ملبوس، خوب صورت، دل کش، دل ربا، اس کے ہونٹوں پر ایک تابناک تبسم تھا اور اس کی بغل میں ایک نوجوان چل رہا تھا۔ رفیعہ اُسے دیکھ کر حیرت کی چیخ مار کر ٹھٹک کر رہ گئی۔

"ہائیں یہ عشرت تھا، زندہ؟"

دوسرے لمحے میں جب وہ نوجوان قریب آیا تو رفیعہ نے محسوس کیا کہ یہ عشرت نہ تھا، یہ تو کوئی اور تھا۔ مگر جانے کیوں اس نوجوان کا چہرہ مہرہ کسی ان جانے طریقے سے عشرت کی یاد دلاتا تھا جیسے اس نوجوان اور عشرت میں کوئی مماثلت ہو۔ دوسرے لمحے یہ اچانک رفیعہ کی سمجھ میں آگیا۔ ہاں اس نوجوان کا چہرہ بھی ایلن لاڈ سے ملتا تھا۔

راج نے رفیعہ کو اس نوجوان کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ میری سہیلی رفیعہ۔ آپ ہیں عشرت؟"

"عشرت؟" رفیعہ چونکی۔

راج نے ہنس کر کہا "یہ وہ رئیس گنج والا عشرت نہیں۔ ان کا نام بھی اتفاق سے عشرت ہے" وہی فراخ سینہ، مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ وہی بروگ کے جوتے، وہی رو فلورا نائی لان کی بش شرٹ .... وہی نام .... وہی لباس، رفیعہ کا جی چاہا وہ بڑھ کر اس عشرت کو اپنی باہوں میں جکڑ لے، اس سے چلا چلا کے کہے "نہ جاؤ عشرت میرے بھولے عشرت۔ اس زندہ موت کے ساتھ کہیں نہ جاؤ" راج نے مسکرا کے پریشان حال رفیعہ سے پوچھا "کہو۔ کچھ کام ہے کچھ چاہئے؟"

رفیعہ نے دل میں کہا "ہاں مجھے تم سے کام تھا۔ میں تم سے کچھ مانگنے آئی تھی ——————

ایک کفن ! ــــــــــــــ

عشرت کے لئے ایک کفن ــــــــــــــ

مگر اب میں سوچتی ہوں تم سے کس کے لئے کفن مانگوں؟

اس عشرت کے لئے جو ہسپتال میں مُردہ پڑا ہے ؟

یا اُس عشرت کے لئے جو تمہاری باہنوں میں زندہ ہے ؟

رفعیہ نے ایک لمحے کے لئے نظر بھر کے راج کی طرف دیکھا اور پھر چُپ چاپ خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔ غیر شعوری طور پر اس نے وہ ہاتھ پیچھے کر لیا جس میں بل بجھا رکھا تھا۔

پھر وہ پلٹ کر اپنے آنسوؤں کو روکتی ہوئی تیز تیز قدموں سے دوڑتی ہوئی بنگلے کے باہر چلی گئی۔

فہرست کتب

ناقابل فراموش	دیوان سنگھ مفتون	90.00
یادوں کی بارات	جوش ملیح آبادی	80.00
منٹو کے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	27.00
منٹو کے افسانے اور ڈرامے	,,	18.00
جنازے	,,	15.00
چغد	,,	15.00
پھندنے	,,	18.00
دھواں	,,	12.00
برقعے	,,	12.00
بغیر اجازت	,,	12.00
آتش پارے	,,	10.00
سرگزشت اسیر	,,	10.00
شکاری عورتیں	,,	8.00
نورجہاں سرورجاں	,,	6.00
بغیر عنوان کے	,,	10.00
باون پتے	کرشن چندر	27.00
ایک کروڑ کی بوتل	,,	18.00
پوکا پٹس کی ڈالی	,,	12.00
وزیروں کا کاب	,,	12.00

مکتبہ شعروادب سمن آباد۔ لاہور